حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ تعالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً"

(رواہ البخاری)

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ مسمّٰی بہ

حقیقۃ الصّبر

حکیم الامّۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافر خانہ بندر روڈ / ایم-اے جناح روڈ کراچی ۱

اطلاع ضروری:- خط و کتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

حقیقۃ الصبر

اين	متى	کم	کیف	لم	ماذا	لمن لای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا۔	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
تھانہ بھون مکان شیخ رشید احمد صاحب متصل عدالت والی مسجد	۲۴ محرم ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ شروع ۷ بجکر ۲۵ منٹ	۲½ گھنٹہ (۹ بجکر ۵۰ منٹ پر ختم)	تخت پر بیٹھ کر	صاحب مکان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا بطور تعزیت کے بیان ہوا	مصیبت پر صبر کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ رنج طبعی کو عقلی کی حد تک نہ پہونچاؤ اور اعمال میں نقلیں نہ کریں۔	اہل مصائب کو خصوصاً اور اصحاب تحریکات حاضرہ کو عموماً	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ وکان لہٗ	مجمع رجال تقریباً ۳۰ اور عورتوں کا مجمع پردہ میں اس کے علاوہ تھا۔	حضرت مولانا پر دھوپ آگئی تھی سامعین کو بھی دھوپ سے تکلیف ہونے لگی اس لئے بیان جلد ختم کردیا گیا مضمون باقی رہ گیا تھا جسکو تیسرے دن بروز یکشنبہ مدرسہ میں پورا کیا گیا اسکا نام ماعلیہ الصبر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ط اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

(اور آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجیے کہ ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ ہی کے پاس جانے والے ہیں ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں ان کے پروردگار کی طرف سے ہونگی اور عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کی رسائی ہوگئی)

شاید اس آیت کو سن کر کسی کو یہ شبہ ہوا ہوگا کہ اس وقت کسی خاص مصیبت کے متعلق صبر کی تعلیم کی جائے گی اور وجہ اس شبہ کی یہ ہے کہ انا للہ اکثر ایسے ہی مواقع میں پڑھا جاتا ہے جہاں کوئی موت کا واقعہ ہوگیا ہو۔ مگر میرا مقصود اس وقت یہ نہیں ہے۔ گو اگر یہ مقصود ہو تب بھی غلط نہیں کیونکہ بعض واقعات اس گھر میں ایسے ہوئے بھی ہیں۔ مگر مجکو صرف مضمون تعزیت کا بیان مقصود نہیں کیونکہ اس کا بیان بارہا ہوچکا ہے۔ مصیبت کے وقت صبر کی ضرورت کو سامعین بارہا سن چکے ہیں۔ پھر ماشاء اللہ گھر والے خود سمجھ دار ہیں ان کو اس بات کے سمجھانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں میں اس وقت ایسا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں جو شاید ابھی تک کانوں میں نہ پڑا ہوگا اور آجکل اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس مضمون کا تعلق صرف مصیبت موت اقربا سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کی مصیبت سے اس کو تعلق ہے۔ مصائب بعض خاص ہوتی ہیں جن کا اثر ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود ہو، بعض عام ہوتی ہیں جن کا تعلق عام طور پر سب مسلمانوں سے ہو یہ مضمون دونوں قسموں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں پر عام مصائب کا بھی ورود ہے اس لئے اس مضمون کی بہت ضرورت ہے۔ اور میری عادت یہی ہے کہ اکثر ضرورت کے موافق بیان کیا کرتا ہوں۔ اور ایسے ہی مضامین کو بیان کے لئے اختیار کیا جاتا ہے جن کی طرف توجہ کم ہے چنانچہ اس وقت ایسا ہی مضمون مجکو بیان کرنا ہے میں اول اجمالاً تعیین مقصود کئے دیتا ہوں۔ تاکہ پھر تفصیل کے سمجھنے میں

آسانی ہو۔ نیز سامعین کو تمہید سے اُس مضمون کا اشتیاق بھی پیدا ہو گیا ہوگا تو دیر تک ان کو منتظر رکھنا بھی مناسب نہیں۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ انسان کی حالت یکساں نہیں رہا کرتی۔ بلکہ اس پر مختلف حالات کا ورود ہوتا رہتا ہے۔ کبھی گوارا واقعات پیش آتے ہیں کبھی ناگوار گوارا واقعات کا اثر تو یہ ہے کہ اسے دل میں نشاط وانبساط ہوتا ہے فرحت وسرور کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہے کہ اس حالت میں انسان جو کام کرنا چاہتا ہے خوشی خوشی کرلیتا ہے ہر کام میں دل لگتا ہے بلکہ کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور جو شخص جس کام کا پابند ہے اس کو پابندی کے ساتھ کرتا رہتا ہے نشاط وانبساط کی حالت میں دنیا اور دین دونوں کے کام بخوبی چلتے رہتے ہیں گو کوئی شخص سستی وکاہلی یا غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے کچھ نہ کرے مگر اس حالت کا اثر یہی ہے کہ اگر کام کرنا چاہے تو کرسکتا ہے صرف ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد کوئی مانع نہیں ہوتا۔ اور ناگوار واقعات کی خاصیت یہ ہے کہ ان سے دل میں انقباض اور بستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رنج وغم کا غلبہ ہوتا ہے طبیعت پژمردہ مرجھائی سی رہتی ہے یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہوتا ہے کہ پریشانی بڑھ کر افعال میں اختلال ہوجاتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا ہر وقت قلب پر ایک فکر سوار ہے جو ہر کام میں ساتھ رہتی ہے جس کی وجہ سے اول تو کچھ کام ہی نہیں ہوتا اور جو ہوتا بھی ہے تو انتظام اور پابندی کے ساتھ نہیں ہوتا غرض دین ودنیا دونوں کے کاموں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے رنج وغم وفکر وپریشانی حدوث ارادہ عمل سے بھی مانع ہوتا ہے اور بقاء ارادہ کو بھی مانع ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے اختلال امور دنیا سے توچنداں بحث نہیں کیونکہ اول تو اس کا ضرر مقابلہ دین کے اشد نہیں۔ دوسرے امور دنیا کے اختلال کا ضرر امر محسوس ہے اس کی طرف چند روز میں خود بخود توجہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی کے گھر میں دوکان سے روزانہ دو چار روپے آتے تھے۔ اب پریشانی میں دوکان کے بند ہونے سے وہ آمدنی بند ہوگئی تو دو چار دن کے بعد اس ضرر کا احساس خود بخود ہو جاتا ہے۔ یا کوئی ملازمت سے رخصت لے کر آیا تھا رخصت ختم ہونے کے بعد اس کو تنخواہ کے کٹنے کا خیال

جلدی ہی پیدا ہو جاتا ہے وعلیٰ ہذا جو شخص دنیا کمانے کا جو طریقہ بھی اختیار کئے ہوئے ہے اس کے بند ہونے کا ضرر اس کو جلدی ہی محسوس ہو جاتا ہے۔ اس لئے مجھے اس کے بیان کی ضرورت نہیں میں اس وقت اعمال دین کے اختلال پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مصیبت کا اثر دین پر یہ پڑتا ہے کہ معمولات میں اختلال ہو جاتا ہے۔ انسان مصیبت سے پہلے جن اوراد کا پابند ہوتا ہے مثلاً ذکر و شغل یا نماز و تلاوت قرآن وغیرہ کا مصیبت کے وقت ان سب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بعض تو فرائض و واجبات کو بھی ناغہ کر دیتے ہیں اور جو دیندار کہلاتے ہیں وہ فرائض و واجبات کو تو ترک نہیں کرتے مگر معمولات زائدہ کو وہ بھی ناغہ کر دیتے ہیں۔ اور ناگوار واقعات کا اثر بہت سخت ہے کیونکہ یہ دین کا ضرر ہے اور مسلمان کے نزدیک دین دنیا سے مقدم ہے اس لئے اس کا ضرر بھی ضرر دنیا سے اشد ہے اور اس پر متنبہ کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ دین کا ضرر امر محسوس نہیں فرض نماز یا تہجد یا ذکر تلاوت قرآن کے ناغہ کرنے سے کوئی ظاہری آمدنی بند نہیں ہوتی تو اس کے ضرر کا احساس بھی جلدی نہیں ہوتا نیز اس ضرر پر کوئی عزیز یا خیر خواہ بھی متنبہ نہیں کرتا حتیٰ کہ مشائخ و معلمین کی بھی یہ عادت ہے کہ جب ان کے کسی مرید وغیرہ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کو صرف جزع و فزع نہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور عام طور پر صبر و شکر کی تعلیم اسی معنی کر کی جاتی ہے (کہ جزع و فزع نہ کرد ۱۲) اس پر نظر نہیں ہوتی کہ اس ناگوار واقعہ سے ان امور میں بھی خلل پڑ گیا ہے جن کا یہ پہلے سے پابند تھا ان طاعات و عبادات میں بھی گڑبڑ ہو گئی ہے جو پہلے سے مامور بہ ہیں اور نہ اس ضرر پر اس کو متنبہ کیا جاتا ہے۔ اور منشا غلطی کا یہ ہے کہ طاعات معمول بہا کی پابندی کو عموماً حقیقت صبر سے خارج سمجھا جاتا ہے اور اس کے خلل کو نقصان صبر پر محمول نہیں کیا جاتا۔ بس جو شخص مصیبت کے وقت جزع فزع نہ کرے اس کو بڑا صابر اور مستقل مزاج سمجھتے ہیں گو اس کے معمولات میں کیسا ہی خلل ہو گیا ہو یہ ایک عام غلطی ہے جس پر عوام تو کیا خواص کی بھی نظر نہیں اس لئے میں اس وقت اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔

لوگوں کی نظر ناگوار واقعات کے صرف پہلے اثر تک ہے۔ جو قلب پر واقع ہوتا ہے دوسرے اثر پر جو اعمال میں واقع ہوتا ہے بالکل نظر نہیں کی جاتی۔ دوسروں کی تو کیا شکایت خود صاحب واقعہ کو بھی اس پر نظر نہیں ہوتی۔ اگر کسی وقت کسی کی نظر ہوئی بھی تو صرف اس قدر کہ پریشانی میں فرائض و واجبات میں اگر خلل آنے لگا تو دین داروں کو اس وقت کچھ تنبہ ہو جاتا ہے۔ مگر سنن و مستحبات کے اختلال پر ان کو بھی بہت کم تنبہ ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ سنن زوائد و مستحبات کے متعلق یہ اعتقاد جما ہوا ہے کہ ان کے کرنے میں ثواب اور نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ اس لئے ان کے ناغہ ہونے کو سہل بات سمجھتے ہیں حالانکہ نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن زائدہ اور مستحبات کا یہ حکم قبل شروع کے ہے اور شروع کے بعد ان کا حکم بدل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حکم تو عین وقت اشتغال کے ساتھ مختص ہے وہ یہ کہ شروع کرنے کے بعد مستحب کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور ایک حکم عام ہے جو وقت اشتغال کے ساتھ مختص نہیں وہ یہ کہ جس مستحب کو معمول بنا لیا جائے اور کچھ عرصہ تک اس پر مواظبت کر لی جائے اب اس کا ناغہ کرنا اور مواظبت کو چھوڑ دینا مکروہ ہے اور اس کی دلیل ایک حدیث بخاری کی ہے جو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا یَا عَبْدَ اللّٰہِ لَا تَکُنْ مِثْلُ فُلَانٍ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ ثُمَّ تَرَکَہٗ یعنی اے عبد اللہ تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو نا جو رات کو (نماز کے لئے) اٹھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی اس حالت پر ناگواری اور کراہت ظاہر فرمائی ہے معلوم ہوا کہ ایک مستحب کو معمول بنا کر ترک کر دینا مذموم و مکروہ ہے۔

(قُلْتُ بُوِّبَ عَلَیْہِ الْبُخَارِیُّ مَا یَکْرَہُ مِنْ تَرْكِ قِیَامِ اللَّیْلِ لِمَنْ کَانَ یَقُوْمُہٗ قَالَ الْحَافِظَ اِیْ اِذَا اَشْعَرَ ذٰلِكَ بِالْاِعْتِرَاضِ عَنِ الْعِبَادَۃِ قَالَ وَفِیْہِ اِسْتِحْبَابُ الدَّوَامِ عَلٰی مَا اعْتَادَہُ الْمُؤْمِنُ الْخَیْرَ مِنْ غَیْرِ تَفْرِیْطٍ وَیَسْتَنْبِطُ مِنْہُ کَرَاھَۃَ قَطْعِ الْعِبَادَۃِ وَاِنْ لَمْ تَکُنْ وَاجِبَۃً اھ (ص ۳۱ ج ۳ فتح الباری ۱۲ جامع)

(بخاری نے ایک باب باندھا ہے کہ مکروہ ہے رات کو اٹھنے کا ترک کرنا اس شخص کیلئے جو رات میں اٹھا کرتا تھا)

اسی لئے بزرگوں کا ارشاد ہے کہ فرائض وواجبات کے علاوہ نوافل وغیرہ کا اتنا ہی پابند ہو جس کو نباہ سکے ورنہ شروع ہی نہ کرے اس سے بڑی بے برکتی ہوتی ہے اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جب ایک کام پابند ہو پھر اس میں فتور ہونے لگے تو اس کا خلل ممتد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس عمل پر تو پھر عمر بھر بھی پابندی نصیب نہیں ہوتی اور اس سے گذر کر دوسرے اعمال میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ آج تو تہجد میں فتور ہے۔ کچھ دنوں میں صبح کی نماز کی پابندی بھی نہ رہے گی پھر وقت کی بھی پابندی نہ رہے گی نماز قضا ہونے لگے گی اور یہ سارا فساد ایک مستحب کی پابندی چھوڑنے سے ہوا اس کے علاوہ ترک پابندی میں ایک اور خرابی اس سے بھی سخت ہے۔ وہ یہ کہ شریف طبائع کا خاصہ ہے اور مسلمان سب شریف ہی ہیں کہ جب وہ کسی سے ایک خاص قسم کا برتاؤ شروع کرتے ہیں تو جب تک اس برتاؤ کا نباہ ہوتا رہے اس وقت تک تو ان کے دل میں تعلق بھی بڑھتا رہتا ہے اور جب وہ برتاؤ چھوٹ جاتا ہے تو سب سے پہلے اس صاحبِ برتاؤ ہی کے دل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر جب دوسرے کو بھی اس کی رکاوٹ کا احساس ہو جاتا ہے وہ بھی رکنے لگتا ہے مثلاً ایک دوست کے ساتھ آپ کا ہمیشہ سے یہ برتاؤ ہو کہ جب آپ اس سے ملنے جائیں کچھ ہدیہ اور تحفہ ساتھ لیجائیں۔ پھر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ خالی ہاتھ چلے گئے تو ہر شخص اپنے دل میں غور کرے کہ اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی یقیناً خالی ہاتھ جاتے ہوئے دل رکیگا۔ اور ایک قسم کی شرمندگی اس پر طاری ہو گی گو دوسرے کو اس کے خالی ہاتھ آنے کی طرف التفات بھی نہ ہوا ہو مگر اس کے دل میں خود بخود یہ وسوسے دوڑیں گے کہ آج میرے خالی آنے سے دوست کو ضرور کچھ خیال ہوا ہوگا۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ بس اب وہ تعلق نہیں رہا وہ محبت نہیں رہی چاہے اس کے دل میں کچھ بھی نہ آیا ہو مگر یہ اپنے معمول کے خلاف کرنے سے ان اوہام میں ضرور مبتلا ہوتا ہے اور یہ طبعی بات ہے۔ بس رکاوٹ کا بیج تو آج ہی سے بو یا گیا اس کے بعد یہ ہوگا کہ ایک دفعہ تو خالی ہاتھ بھی چلا گیا تھا اب مہینے گذر جاتے ہیں کہ جانے کا نام بھی نہیں لیتا۔ دور ہی سے خط کے ذریعہ سے بات چیت

کرلیتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد خط کتابت کا سلسلہ بھی بند ہو جاتا ہے، اور دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص مجھ سے رکنے لگا۔ اب وہ بھی اس سے رکنے لگتا ہے اور محبت مبدل بعدم محبت ہو جاتی ہے پھر عدم محبت کے بعد کبھی عداوت تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص تہجد یا ذکر و شغل شروع کرتا ہے تو جب تک وہ ان کا پابند رہے اس وقت تک اس کے دل میں حق تعالیٰ سے تعلق اور محبت کی ترقی ہوتی رہتی ہے اور جب پابندی چھوٹی تو پہلے اسی کی طبیعت میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ سے اس کو ایک قسم کی ندامت سی آتی ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب حق تعالیٰ کے یہاں میرا وہ رتبہ نہیں رہا ہوگا جو پابندی اعمال کے وقت تھا۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ میں مردود و مطرود ہو گیا تو پہلے خود اس کے دل میں حق تعالیٰ سے حجاب اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے پھر سچ مچ ادھر سے بھی بُعد و حجاب ہو جاتا ہے پس ترک معمول سے اول اس کے دل میں افسردگی کا پیدا ہونا یہ پہلا حجاب ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کو نشاط و انبساط سے ترقی ہوتی ہے اور افسردگی سے اس میں کمی آتی ہے۔ جب ایک دفعہ دل میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلق بالحق میں ضرور کمی آتی ہے۔ پھر یہ خیال پیدا ہونا کہ میں مردود و مطرود ہو گیا دوسرا حجاب ہے اس وقت اس کے دل سے محبت نکل جاتی ہے اور قلب خالی ہو جاتا ہے۔ پہلے درجہ میں تو حق تعالیٰ کی طرف سے حجاب نہ ہوا تھا مگر اب ادھر سے بھی حجاب ہو گیا پھر جب مردودیت کا خیال جم کر اس کے قلب سے محبت حق نکل جاتی ہے تو واجبات و فرائض میں بھی کوتاہی کرنے لگتا ہے اور معاصی پر اقدام کرنے لگتا ہے اور دل میں سمجھتا ہے کہ میں مردود تو ہو ہی گیا۔ پھر لذات نفس میں کیوں کمی کروں یہ تیسرا حجاب ہے اس وقت محبت مبدل بعداوت ہو جاتی ہے اس کے بعد بعض اوقات کفر کی سرحد سے قریب ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ ایمان تک سلب ہو جاتا ہے۔

میرٹھ میں ایک کوتوال تھے وہ بہت ظلم کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ میں جہنم میں تو جاؤں ہی گا پھر رشوت اور ظلم میں کیوں کمی کروں یہ حالت سخت حجاب کی دلیل ہے مگر نہ معلوم کس بزرگ کی توجہ کا اثر ہوا یا کونسا عمل ان کا قبول ہو گیا

ان کا خاتمہ اور انجام اچھا ہوا ؎

ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود ؎ (ورنہ تیرے دل بے رحم سے تو کوتاہی نہیں ہوئی)

انھوں نے تو اپنی طرف سے خاتمہ بُرا ہونے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ حق تعالیٰ ہی نے دستگیری فرمائی اور اس تمام حالت کا منشا اور سرچشمہ وہی افسردگی ہے جو اول اول معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے سے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں حجابات کی سات قسمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ غفلت و اعراض بھی ہے جس کا اثر افسردگی ہے اور بقیہ چھ درجے یہ ہیں۔ حجاب تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی عداوت یعنی اول اعراض ہوتا ہے **اگر معذرت و توبہ** نہ کی حجاب ہوگیا۔ اگر پھر بھی اصرار رہا تو تفاصل ہوگیا اگر اب بھی استغفار نہ کی تو عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق و شوق کی تھی وہ سلب ہوگئی۔ یہ سلب مزید ہے اگر اب بھی اپنی بے ہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت و حلاوت کہ زیادتی کے قبل اصل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہوگئی اس کو سلب قدیم کہتے ہیں۔ اگر اس پر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل سے گوارا کرنے لگا یہ تسلی ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت مبدل بہ عداوت ہوگئی نَعُوْذُ بِاللہِ مِنْہَا (اللہ کی پناہ اس سے) اس لئے مستحبات معمولہ کو ترک کرنا سہل بات نہیں اس کا اثر بہت دور تک پہونچ جاتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ آدمی جس قدر مستحبات و نوافل زیادہ کرتا ہے وہ اسی قدر مقرب ہوتا ہے۔ پھر تقرب کے بعد حق تعالےٰ سے بے التفاتی کرنا سخت بات ہے حق تعالےٰ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرماتے ہیں عالم ظاہر عالم غیب کا نمونہ ہے پس جیسا ہمارا مذاق یہ ہے کہ جس کو اپنے سے تعلق زیادہ نہیں ہوتا اس کی بے التفاتی زیادہ ناگوار نہیں ہوتی اور تعلق بڑھا کر جو بے التفاتی و بے اعتنائی کرتا ہے اس پر زیادہ غصہ آتا ہے۔ ایسے ہی حق تعالےٰ کے ساتھ جن کو معمولی تعلق ہے ان کی غفلت و بے اعتنائی پر زیادہ قہر نہیں ہوتا اور جو تعلق بڑھا کر مقرب بن کر غفلت و بے التفاتی کا برتاؤ کرتے ہیں ان پر زیادہ قہر ہوتا ہے۔ پس جو لوگ مستحبات

و نوافل پر مواظبت کر کے پھر ترک مواظبت اختیار کرتے ہیں وہ درباری بنکر دربار سے غیر حاضر ہوتے ہیں اور بادشاہ کا درباری اگر دربار سے بلا وجہ بلا عذر کے غیر حاضر ہونے لگے تو اس پر بہ نسبت غیر درباری کے زیادہ عتاب ہوگا اور اگر ترک مواظبت علی المستحبات سے گزر کر وہ فرائض و واجبات میں بھی کوتاہی کرنے لگے معاصی پر بھی اقدام کرنے لگے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقرب شاہی بن کر نافرمانی اور گستاخی کرنے لگے اور ظاہر ہے کہ مقرب کی گستاخی پر جس قدر عتاب ہوگا ایک غیر مقرب مثلاً دیہاتی یا گنوار کی گستاخی پر اتنا عتاب نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ ناگوار واقعات کا یہ اثر بہت سخت ہے کہ ان سے بعض اوقات اعمال میں تقلیل ہونے لگتی ہے لوگ مصائب کا حق صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ ایسے مواقع میں جزع و فزع نہ کیا جائے اور اسی کو کمال صبر سمجھتے ہیں اس پر کسی کی نظر نہیں کہ ناگوار واقعات کا یہ بھی ایک حق ہے کہ اس وقت اعمال سابقہ میں کمی نہ کی جائے ۔

اس کو تو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معمولات ترک کرنے کا ضرر بہ نسبت جزع و فزع کے ضرر کے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ جزع فزع کا اثر محدود و غیر ممتد ہے اور اس میں انسان کسی قدر معذور بھی شمار ہوسکتا ہے اور تقلیل اعمال کا ضرر ممتد ہے جو بہت دور تک پہنچتا ہے۔ اور اسی لئے مصیبت کے وقت معمولات پر جما رہنا صبر کا جزو اعظم ہے۔ اسی مضمون پر متنبہ کرنے کے لئے میں نے اس آیت کی تلاوت کی ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہم کو مصیبت کے ہلکا کرنے کا ایک طریقہ بتلایا ہے جس پر عمل کرنے سے یہ اثر تقلیل فی الاعمال ظاہر نہیں ہوسکتا کیونکہ ناگوار واقعات سے اعمال میں تقلیل کا سبب فرطِ غم اور غلبۂ حزن ہے بس اگر کسی تدبیر سے غم اور رنج کو ہلکا کر دیا جائے تو اس کا یہ اثر بھی ظاہر ہوگا قاعدہ ہے کہ ازالہ سبب سے مسبب کا ازالہ ہوجاتا ہے۔ اس آیت سے اوپر بعض مصائب کا ذکر ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ (ترجمہ یہ ہے۔ اور البتہ ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے یعنی تم کو دشمنوں کی طرف سے اندیشہ اور خوف بھی پہونچے گا۔ اور جوع سے یعنی کسی وقت تم پر فاقہ بھی آئے گا اور اموال ونفوس اور ثمرات کے نقصان سے

یعنی کسی وقت تمھارا مال بھی ضائع ہوگا جانیں بھی ضائع ہوں گی اور ثمرات بھی ضائع ہوں گے ثمرات کی ایک تفسیر تو پیداوار ہے مطلب یہ کہ کسی وقت تمھاری کھیتیوں اور باغات کی پیداوار پر آفت آئے گی اور گو اموال میں یہ بھی آگئے تھے مگر چونکہ زمینداروں کے نزدیک یہ اعز الاموال (مالوں عزیز تر) ہیں اور مدینہ والے اکثر زمیندار تھے اس لئے ثمرات کو مستقلاً بیان فرمادیا اور ایک تفسیر ثمرات کی اولاد ہے کیونکہ وہ ماں باپ کے جگر کے ٹکڑے ہیں اسی لئے اولاد کو ثمرات الفواد (دلوں کا پھل) کہا جاتا ہے اور گو وہ نفوس میں داخل ہو سکتے ہیں مگر یہاں بھی تخصیص کی وہی وجہ ہوگی جو ثمرات بمعنی پیداوار کو اموال کے بعد ذکر کرنے کی وجہ تھی یعنی چونکہ اولاد اعز النفوس (جانوں میں زیادہ عزیز) ہیں اور ان کے مرنے کا غم زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کو جدا بیان کردیا کہ کسی وقت تمھاری اولاد بھی ہلاک ہوگی۔ اس میں ایک تو یہ بتلادیا کہ تم پر یہ واقعات وارد ہوں گے، دوسرے یہ بھی بتلادیا کہ ان واقعات سے ہم تمھارا امتحان لیں گے یہی ایک لفظ ایسا ہے کہ اگر اور بھی کچھ نہ ہوتا تو اسی سے مصیبت ہلکی ہوگئی کیونکہ امتحان کا لفظ سنتے ہی مخاطب کو فکر ہوجاتی ہے کہ مجھے اس امتحان میں پاس ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ میں فیل ہوجاؤں اور قاعدہ ہے کہ انسان امتحان کے وقت اپنے حواس وعقل کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے پس یہ سنکر کہ یہ واقعات بطور امتحان کے آئیں گے ہر شخص اس کی کوشش کرے گا کہ ان مواقع میں اپنے عقل وحواس کو مجتمع رکھے ازخود رفتہ نہ ہوجائے کیونکہ امتحان کے وقت بدحواس ہوجانے سے آدمی فیل ہوجاتا ہے۔ اور مصیبت کے وقت عقل وحواس قائم رکھنا بھی اس کے اثر کو بہت کم کردیتا ہے پس لَنَبْلُوَنَّكُمْ (ہم ضرور تمھاری آزمائش کریں گے) میں اس پر تنبیہ کردی گئی ہے کہ مصائب کے وقت بدحواس نہ ہونا چاہیئے بلکہ ان کو امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ پھر اس میں صیغہ جمع متکلم اختیار فرمایا جس سے عظمت ابتلاء پر دلالت ہے کیونکہ معلوم ہوگیا کہ یہ امتحان حق تعالیٰ خود لیں گے اور جیسا ممتحن عظیم الشان ہوتا ہے ویسا ہی امتحان بھی عادۃً مہتم بالشان ہوتا ہے گو واقع میں حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان عظیم نہ ہو آسان اور سہل ہی ہو مگر مخاطب کو

بتلا دیا کہ وہ ابتلاء عظیم کے لئے تیار رہے اور اس میں بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ پہلے سے ہم کو مطلع فرما دیا کہ تم کو ایسے ایسے واقعات پیش آئیں گے اس صورت میں تکلیف کی کلفت تو ہوگی مگر دفعۃً جو ایذا پہونچنے کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو پہلے سے کہدیا جائے کہ تمہارا اپریشن کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس کو اپریشن کی تکلیف تو ہوگی مگر دفعۃً کلفت پہونچنے کا صدمہ نہ ہوگا۔ کیونکہ پیشگی اطلاع سے وہ اس کے لئے تیار رہے گا لوگ آیت لَا تَقْنَطُوْا (ناامید مت ہو) کو آیت رحمت سمجھتے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ہر ہر آیت سے یہی رحمت ٹپکتی ہے چنانچہ اس آیت میں کتنی بڑی رحمت کا مضمون ہے کہ ہم کو مصائب کے لئے پہلے سے تیار کر دیا۔ تاکہ وقت پر بدحواس نہ ہو جائیں بلکہ یوں کہیں کہ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ صلے اللہ علیہ وسلم وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (یہ وہ جس کا وعدہ کیا ہے ہم سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے) کہ یہ تو وہی بات ہے جس کا وعدہ ہم سے خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے کر دیا تھا اور یہ بھی خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ انسان کی مرضی کے موافق سارے کام نہیں ہوتے بلکہ بعض واقعات ناگوار اور خلاف طبع بھی اس کو پیش آتے ہیں۔ اگر سب کام اس کی مرضی کے موافق ہوا کرتے تو یہ ہلاک ہو جاتا کیونکہ اس صورت میں یہ تو اپنے لئے راحت ہی تجویز کرتا۔ اور راحت کا خاصہ ہے بیفکری اور غفلت پس دوام راحت سے یہ غفلت میں پڑ جاتا اور معاصی پر دلیر ہو جاتا اور یہ اس کے لئے سراسر ہلاکت ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے سب کام اپنی مرضی پر رکھے ہیں، ہماری مرضی پر نہیں رکھے پس جب کبھی ہم غفلت وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں اُدھر سے کوئی ناگوار واقعہ کا ایک تازیانہ لگا دیا جاتا ہے جس سے کچھ دنوں تک غفلت کا علاج ہوتا اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ طاعون وغیرہ کے زمانہ میں سالہا سال کے بے نمازی بھی نمازی ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو گونہ آخرت کی فکر ہوتی ہے گو یہ واقعات ہم کو ناگوار ہوتے ہیں مگر ان میں ہمارے واسطے حکمت اور منفعت رکھی ہوئی ہے اگر حق تعالیٰ ہماری مرضی کے موافق ہی سب کام کیا کریں تو

ہم کو آخرت کی طرف کبھی توجہ نہ ہو۔ پس ناگوار واقعات کا پیش آنا بھی بڑی رحمت ہے جیسے استاد کی شفقت یہ ہے کہ کبھی کبھی بچہ کے ایک دو قمچی مار دیا کرے ورنہ وہ تو بدشوق ہے اگر یہ کبھی اس کو کبھی ہاتھ بھی نہ لگا دے گا تو بچہ بالکل خراب ہو جائے گا نہ پڑھے گا نہ لکھیگا نہ بے جا حرکتوں سے باز آئیگا بلکہ سر پر چڑھ جائے گا۔ استاد کی شان میں بھی گستاخی کرنے لگا اس حالت میں آپ خود ہی یہ رائے دیتے ہیں کہ استاد کو تنبیہ وتادیب سے کام لینا چاہیئے۔ اور اس کے حق میں اس کو شفقت سمجھتے ہیں۔ پھر اسکو کیا وجہ ہے کہ ناگوار واقعات میں حق تعالیٰ کی رحمت میں اعتقاد نہ ہو یہاں شاید سامعین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ غافلین کو ناگوار واقعات پیش آنے کی تو یہ حکمت ہے مگر کاملین کو ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں وہ تو بدشوق نہیں ہیں جس سے ان کو تنبیہ کی ضرورت ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ اہل اللہ کاملین کو بھی ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اس شبہ کا جواب اسی آیت میں لفظ لَنَبْلُوَنَّكُمْ سے نکلتا ہے کیونکہ اس میں اولاً حضرات صحابہ کو خطاب ہے جو سب کے سب کاملین ہیں اور ان سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو ان واقعات سے آزمائیں گے معلوم ہوا کہ کاملین پر ایسے واقعات بطور تنبیہ اور تادیب کے نہیں آتے بلکہ بطور امتحان کے پیش آتے ہیں حق تعالیٰ ناگوار واقعات سے ان کی محبت وعشق کا امتحان فرماتے ہیں اور حق تعالےٰ کو خود امتحان کی کوئی ضرورت نہیں ان کو ہر شخص کی حالت خوب معلوم ہے۔ بلکہ اس امتحان سے دوسروں کو کھلانا منظور ہے مثلاً ملائکہ وغیرہ کو کہ دیکھو ہمارے بندے مصائب میں بھی کیونکر ہم کو چاہتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم ان کو تکلیف پہونچاتے ہیں مگر پھر بھی وہ ہماری محبت سے نہیں ہٹتے۔ اور تکلیف کو عین راحت سمجھتے ہیں۔ پس اب اس شبہ کا جواب ہو گیا کہ کاملین پر ایسے واقعات کیوں آتے ہیں۔ نیز لفظ لَنَبْلُوَنَّكُمْ لہ ہم تم کو ضرور آزمائیں گے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین کو مصائب سے کلفت بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس آیت کے مخاطب حضرات صحابہ ہیں جو سب کے سب کامل ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انپر یہ واقعات بطور امتحان کے آتے ہیں۔ ایک مقدمہ

لہ ہم تمہاری ضرور آزمائش کریں گے۔

تو یہ ہوا اب اس کے ساتھ ایک مقدمہ یہ ملا لو کہ بدون احساس کلفت کے امتحان نہیں ہو سکتا اور یہ بالکل ظاہر اور بدیہی بات ہے جس شخص کو ناگوار واقعات سے کچھ بھی کلفت نہ ہو اس کے حق میں ان کو امتحان نہیں کہا جا سکتا امتحان ہمیشہ اسی چیز سے ہوا کرتا ہے جس کا دوسرے پر بار پڑے اور اس کو بار کا احساس بھی ہو۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ثابت ہو گیا کہ مصائب سے کاملین کو بھی کلفت ہوتی ہے اتنا فرق ہے کہ کاملین کو صرف جسمانی کلفت اور طبعی رنج ہوتا ہے اور دنیا داروں کو جسمانی کلفت بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی اور طبعی رنج بھی ہوتا ہے اور عقلی بھی کیونکہ اہلِ دنیا کو طول امل کی وجہ سے بہت چیزوں کے ساتھ توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اموال کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مال سے یہ کام نکالیں گے کھیت کی پیداوار سے توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مرتبہ غلہ بیچ کر فلاں کام کریں گے۔ پھر ان کے خلاف ظہور میں آتا ہے تو ان کو سخت کلفت ہوتی ہے۔ اسی طرح اولاد کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ لڑکا پڑھ کر امتحان میں پاس ہوگا تو یوں نوکر ہوگا یوں ہمیں کما کر دے گا پھر وہ مر گیا تو افسوس ہوتا ہے کہ ہائے یہ بچہ تو پاس ہونے والا تھا اب دور ہو گیا طبعی رنج تو مفارقت کا ہوتا ہی ہے مگر دنیا داروں کو ان امیدوں کے باطل ہو جانے سے عقلی رنج بھی ہوتا ہے اور گو زبان سے نہ کہیں مگر دل میں یہ وسوسہ اکثر کے ذہن میں آ جاتا ہے کہ یہ واقعہ بے محل اور قبل از وقت ہوا اور دینداروں کو کسی چیز سے توقع وابستہ نہیں ہوتی اس کو خدا کے سوا کسی سے کچھ امید نہیں ہوتی اس کو کسی ناگوار واقعہ میں خلاف حکمت ہونے کا وہم بھی نہیں ہوتا اس لئے اس کو عقلی رنج ایسے موقع پر ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہتا ہے ؎

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود ٭ (جو کچھ وہ بادشاہ کرے پسندیدہ ہو)

ہاں طبعی رنج ان کو بھی ہوتا ہے اور اتنا رنج تو ہونا چاہیئے ورنہ پھر امتحان کیسے ہوگا اور مصائب میں طبعی رنج موجب نقص نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا آپ اپنے صاحبزادہ کی وفات پر فرماتے ہیں۔ اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ

لَمَحْزُوْنُوْنَ (اے ابراہیم تمھاری جدائی میں ہم غمگین ہیں)

معلوم ہوا کہ صاحبزادہ کی وفات سے طبعی رنج آپ کو بھی ہوا اور وہ صرف مفارقت کا رنج تھا۔ انسان کو ایک جانور کے چند روز پالنے سے اس کے ساتھ اُنس ہو جاتا ہے اور اس کی مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے۔ پھر بھلا اولاد کی مفارقت کا صدمہ تو کیونکر نہ ہو یہ تو طبعی بات ہے جو طبیعت انسانیہ کا خاصہ ہے پس جو کامل بشر ہوگا اسے صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ ضرور ہوگا ہاں کامل کو عقلی صدمہ نہ ہوگا۔ شاید کسی کو بعض بزرگوں کے ایسے واقعات سے کہ ان کو اولاد کے مرنے پر رنج نہیں ہوا بلکہ وہ ہنستے تھے یہ شبہ ہو کہ یہ حالت زیادہ کمال کی ہے اور ظاہر میں یہ لوگ ان لوگوں سے کامل معلوم ہوتے ہوں گے جو ایسے مواقع پر رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہیں سو یہ شبہ لغو ہے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب آپ کو ایسے واقعات سے رنج ہوا تو رنج ہونا نقصان کی دلیل نہیں بلکہ عاقل یہ کہے گا کہ زیادہ کامل وہی شخص ہے جس کو رنج ہوا۔ اور پھر حدود سے متجاوز نہ ہوا کیونکہ وہ واقعہ ایسا ہی ہے جس سے رنج پیدا ہونا چاہیئے۔ تو جس نے رنج کا احساس کیا معلوم ہوا کہ اس کے حواس کامل اور درست ہیں۔ اور پھر حدود پر قائم رہا تو معلوم ہوا کہ عقل و دین بھی کامل ہے اور جس کو صدمہ کی بات سے صدمہ ہی نہیں ہوا اس کے حواس درست ہونے میں کلام ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حالت وغیرہ کی وجہ سے اس کے حواس بشریہ معطل ہیں اسی لئے اس کو ایسی بات سے رنج نہیں ہوا جس سے طبعی طور پر رنج ہونا چاہیئے تھا۔ اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ ڈاکٹر نے دو شخصوں کا اپریشن کیا ایک کو تو کلورا فارم سنگھایا وہ تو آپریشن کے وقت بےحس و حرکت پڑا رہا نہ چیخا نہ چلّایا نہ ہاتھ پیر ہلائے اور دوسرے کو بدون کلورا فارم سنگھائے اپریشن کیا اس نے ایک چیخ ماری مگر ہاتھ پیر بالکل نہیں ہلائے ظاہر میں نادان کو پہلا شخص کامل معلوم ہوگا۔ مگر حقیقت شناس دوسرے کو کامل کہے گا اور سمجھے گا کہ پہلے کے تو حواس معطل تھے اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے نہ زخم کی تکلیف کا احساس ہوا اس کا حرکت نہ کرنا کمال نہیں، کمال دوسرے

شخص کا ہے کہ اس کے حواس درست تھے۔ اس کو زخم نشتر کی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا اور پھر ضبط سے کام لیا ہاتھ پیر نہیں ہلائے صرف ایک چیخ مار کر دم بخود رہ گیا اسی طرح سمجھئے کہ ایسے اولیا کو تو حق تعالیٰ نے کلورا فارم سنگھا کر مصیبت کا نشتر لگایا ہے اس لئے ان کو مصیبت کے اثر کا احساس ہی نہیں ہوا اور وہ ہنستے رہے اور انبیاء کو کلورا فارم نہیں سنگھایا کیونکہ ان میں ضبط و تحمل کی طاقت ہے وہ بدون بیہوش کئے بھی مستقل مزاج رہتے ہیں گو تکلیف کا احساس ہوتا ہے کلفت و رنج طبعی کا بھی اثر ہوتا ہے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے پہاڑ کی طرح جمے رہتے ہیں وہ اولیاء ناقص ہیں جن کو صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ بھی نہ ہوگا کامل وہ ہے جس کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہو اس لئے کاملین کو رنج ہوتا ہے اب سمجھئے کہ یہاں کلورا فارم کیا چیز ہے وہ غلبہ حال ہے جس سے بعض دفعہ احساس معطل ہو جاتا ہے انبیاء اور اولیاء کاملین پر ایسا غلبہ حال نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو شاذ و نادر ہوتا ہے اکثر متوسطین سلوک پر غلبہ حال زیادہ ہوتا ہے۔ غرض لَنَبْلُوَنَّكُمْ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین پر طبعی رنج و کلفت کا اثر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ناگوار واقعات میں ان کے لئے امتحان و ابتلاء ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے اس اشارہ کی تائید ہو گئی اس تقریر سے یہ بات تو معلوم ہو گئی ہو گی کہ اس وقت مجھکو اصل مقصود تقلیل اعمال کے ضرر پر تنبہ کرنا ہے اور یہ بتلانا منظور ہے کہ بعض دفعہ جو کسی سبب سے ہم لوگ معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں یہ حالت خطرناک اور قابل اصلاح ہے تعیین مضمون سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مضمون کچھ اس آیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس کا بیان قریب قریب ہر آیت میں موجود ہے کیونکہ قرآن مجید میں جابجا استقامت علی الاعمال کی تاکید ہے احادیث بھی اس سے بھری ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے استقیموا ولن تحصوا (اعمال پر استقامت کرو اور ہرگز کوتاہی نہ کرو) اور ارشاد ہے ان اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ مَادِیْمَ عَلَیْہِ (پسندیدہ تر اللہ کے نزدیک وہ اعمال ہیں جن پر دوام کیا جائے) مگر تعیین آیت کی وجہ یہ ہوئی کہ آجکل مسلمانوں پر مصائب کا چار طرف سے ہجوم ہے نیز یہ مہینہ بھی محرم کا ہے جو مصیبت کا مہینہ مشہور ہے جس کا منشا حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ (وَرَضَاهُ وَرَضِیَ عَنْ مَّنْ یُّحِبُّہٗ (راضی ہو اللہ ان سے اور اس شخص سے بھی راضی جو ان سے محبت رکھتا ہے)

کی شہادت کا واقعہ ہائلہ ہے جو درحقیقت ایک صدمہ جانکاہ ہے مگر جہالت کے سبب ہم لوگوں نے اس میں حدود سے تجاوز کرلیا ہے جس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ لوگوں نے اس زمانہ میں نکاح و شادی کو ناگوار اور مکروہ سمجھ لیا چنانچہ ہمارے ایک عزیز[ـه] کی شادی ذی الحجہ کی تیس تاریخ کو قرار پائی تھی جس میں محرم کی چاند رات کا ہونا تو متیقن تھا اور یہ بھی احتمال تھا کہ شاید کسی جگہ آج ہی محرم کی پہلی ہو تو لڑکی کے ولی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی کہ تاریخ شادی کے لئے بھلا یہی دن رہ گیا تھا مگر انھوں نے اتنا کرم کیا کہ شادی میں گو خود شریک نہیں ہوئے لیکن اجازت نکاح دیدی اور اپنی طرف سے اپنے ماموں صاحب کو بھیجدیا۔ ہم نے کہا کہ اس خیال کو توڑنا چاہئے اور اسی دن نکاح کیا مگر کئی سال تک مستورات کو فکر رہا کہ دیکھئے کوئی بات ناگوار پیش نہ آجائے اگر لڑکی کا ذرا بھی کان گرم ہوا تو اس کے ولی یہی کہیں گے کہ یہ اس تاریخ میں نکاح ہونے کی نحوست ہے مگر بحمداللہ کوئی ناگوار بات پیش نہیں آئی اور دونوں میاں بی بی خوش وخرم ہیں صاحب اولاد بھی ہیں حق تعالےٰ نے کھلی آنکھوں دکھلا دیا کہ عوام کا اس زمانہ کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے۔ نصوص میں جابجا اس کی تصریح ہے کہ نحوست وسعد کا سبب زمانہ وغیرہ نہیں نہ کوئی دن منحوس ہے نہ کوئی مہینہ نہ کسی مکان میں نحوست ہے نہ کسی انسان میں بلکہ اصل نحوست اعمال معصیت میں ہے مگر افسوس اس نحوست سے اجتناب کا کسی کو اہتمام نہیں بلکہ اسے خود بخود اپنے ساتھ لپیٹتے ہیں دوسرا اثر اس واقعہ سے یہ لیا گیا کہ اس تذکرہ کا اعادہ ہر سال ہوتا ہے چنانچہ محرم میں جابجا شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں مجالس عزاء قائم کی جاتی ہیں اور اس واقعہ کو سن کر لوگ بے اختیار رو دیتے ہیں، بعضے بری طرح نوحہ کرتے ہیں پھر شہداء کی یادگار میں تعزیے اور عَلَم نکالے جاتے ہیں۔ نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حالت بھی خلاف شرع اور قابلِ اصلاح ہے کیونکہ ان تمام افعال کا خلاصہ تجدید غم و اظہار حزن ہے حالانکہ تجدید غم و اظہار حزن مرضی خداوندی کے بالکل خلاف ہے مرضی حق یہ ہے کہ رنج طبعی کو اس کی حد سے نہ بڑھایا جائے اور اپنی طرف سے غم بڑھانے کا

[ـه] یہ واقعہ احقر جامع کی شادی کا ہے ۱۲

کوئی سامان نہ کیا جائے بلکہ حق تعالےٰ نے تو رنج طبعی کے کم کرنے کے بھی سامان کئے ہیں چنانچہ وہ باتیں تعلیم فرمائی ہیں جن کے استحضار سے رنج طبعی بھی کم ہوجاتا ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ ان صابرین کو بشارت دیدیجئے جو مصیبت پہونچنے کے وقت یہ کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اس جملہ میں ایسا مضمون سکھلایا گیا ہے جو رنج وغم کی بنیادیں اکھاڑنے والا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی واقعہ سے صدمہ جب ہوا کرتا ہے جب وہ خلاف مرضی واقع ہوا ہو اور کوئی واقع خلاف مرضی جب ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شق تجویز کرلیں کہ یوں ہونا چاہیئے جب اس کے خلاف دوسری شق ظاہر ہوتی ہے تو وہ ناگوار اور خلاف مرضی ہوتی ہے چنانچہ کسی عزیز کی موت پر ہم کو صدمہ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ یہ ہم سے کبھی جدا نہ ہو ہمیشہ پاس ہی رہے حق تعالےٰ نے انا للہ میں تجویز کا استیصال کردیا ہے فرماتے ہیں کہ تم کو یہ مضمون پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم خدا کی ملک ہیں خدا تعالےٰ ہمارے مالک ہیں اور ہم ان کے مملوک ہیں اور مملوک کی ہر چیز مالک کی ہوا کرتی ہے تو ہماری چیز بھی خدا ہی کی ملک ہے اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلیہ یہ ملالو کہ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے غلام کو کسی تجویز کا حق نہیں۔ جب تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے تو ہمارا کسی عزیز کی مفارقت پر اس لئے غم کرنا کہ ہم نے اس کے متعلق یہ تجویز کر رکھا تھا کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہے بڑی غلطی ہے آپ تجویز کرنے والے ہوتے کون ہیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ گھر کی مالکہ نے الماری میں برتنوں کو ایک خاص ترکیب سے رکھدیا ہو۔ جو ماما کی ترکیب کے خلاف ہے۔ مثلاً مالکہ نے نیچے کے برتنوں کو اوپر رکھدیا اور اوپر والوں کو نیچے رکھدیا اب ماما اس ترکیب کو دیکھ کر نالہ وشیون کرنے لگے کہ ہائے میری تجویز کے خلاف کیوں ہوا۔ تو بتلایئے آپ اس کو احمق کہیں گے یا نہیں یقیناً ہر شخص اسے پاگل کہے گا آخر کیوں۔ اسی وجہ سے تاکہ تجویز کا حق مالکہ کو ہے ماما کو کسی تجویز کا حق نہیں پھر حیرت ہے کہ آپ کی ادنیٰ سی ملک تو ایسی ہو کہ اس کے

سامنے دوسروں کا حق باطل ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی حقیقی ملک کے سامنے آپ کی تجویز باطل نہ ہو یقیناً اگر خدا تعالےٰ کو مالک حقیقی سمجھا جاتا ہے تو آپ کو اور کسی کو تجویز کا حق نہ ہونا چاہیئے پس سمجھ لیجئے کہ حق تعالےٰ نے عالم کے دو درجے بنائے ہیں۔ آسمان اور زمین جیسے الماری کے دو درجے اوپر نیچے ہوتے ہیں جس میں انھوں نے بعض ارواح کو اوپر کے درجہ میں رکھا ہے۔ یعنی آسمان میں۔ اور بعض کو نیچے کے درجہ میں رکھا ہے یعنی زمین میں پھر وُہ کبھی اس ترتیب کو بدل کر اوپر کی روحوں کو نیچے بھیجدیتے ہیں۔ اور نیچے کی روحوں کو اوپر رکھدیتے ہیں اور وہ مالک ہیں ان کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے۔ اس میں ہم غلاموں کا اس لئے نالہ و شیون کرنا کہ ہائے ہماری تجویز کے خلاف کیوں کیا گیا حماقت ہے خوب سمجھ لو کہ انتقال کی حقیقت بالکل ایسی ہی ہے جیسے الماری کے ایک تختہ کے برتنوں کو نیچے سے اوپر کر دیا جائے اور اوپر سے نیچے کر دیا جائے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں آدمی مرکر بالکل معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ دنیا سے جو کہ نیچے کے تختہ ہے آخرت میں پہونچ جاتا ہے۔ جو اوپر کا تختہ ہے (اور یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مردہ کو مٹی میں گاڑ دیا جاتا ہے اور اس سے شاید کسی کو اس پر یہ شبہ ہو کہ آخرت میں پہونچنے کو اوپر کے تختہ پر جانا کیسے کہا گیا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو نہیں گاڑا جاتا بلکہ ایک بے جان لاشہ اور جماد محض کو گاڑا جاتا ہے وہ آدمی تھوڑا ہی ہے وہ تو صورت آدمی ہے کیونکہ آدمی اصل میں روح کا نام ہے اور روح کو مٹی میں نہیں گاڑا جاتا بلکہ اس کو اوپر بلا لیا جاتا ہے۔ اور یہ جو روایات میں آتا ہے کہ پھر روح کو جسم میں واپس کیا جاتا ہے تو یہ واپسی عالم برزخ میں ہوتی ہے اس گڑھے میں نہیں ہوتی۔ قبر حقیقی عالم برزخ ہے جو دنیا و آخرت کے درمیان ہے اور یہ قبر جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے اسی عالم برزخ سے ایک قسم کا تعلق رکھتی ہے اس کی حقیقت نہیں ۱۲ جامع) پس حق تعالےٰ اپنی مملوک چیزوں میں تصرف مالکانہ کرتے رہتے ہیں کبھی کسی کو نیچے بھیجدیا کبھی کسی کو اوپر بلا لیا مگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ نہیں سب نیچے ہی رہیں بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر حق تعالےٰ اس کے جواب میں یہ تجویز فرمائیں کہ اچھا پھر ہم بھی اوپر کی روحیں نیچے نہیں بھیجتے تو پھر کیا ہوگا، بس یہ ہوگا کہ سب کے سب اوت نپوت رہ جائیں گے کسی کے بھی اولاد نہ ہوگی مگر آپ کو

اس پر بھی چین نہیں اگر کسی کے اولاد نہ ہو تو وہ اولاد کے لئے ایسی گڑگڑاتا ہے جس کی حد نہیں یوں تمنا کرتا ہے کہ کچھ ہو جائے چاہے چوہے کا بچہ ہی ہو جائے۔ بس آپ کی تجویز کا حاصل یہ ہے کہ اوپر کی روحیں تو نیچے آتی رہیں مگر نیچے کی روحیں اوپر نہ جائیں۔ صاحب خدا کی رحمت ہے کہ انھوں نے ہماری اس تجویز کو پورا نہیں کیا ورنہ دنیا میں رہنے کو بھی جگہ نہ ملتی سوچ لو کہ جتنے آدمی آدم علیہ السلام کے وقت سے اس وقت تک مر چکے ہیں سب زندہ رہتے تو کہاں ٹھکانا ملتا اس وقت جو ہر شخص اپنے اپنے گھر میں چین سے گذر رہا ہے اس کا یہی تو سبب ہے کہ بہت سے آدمیوں کو حق تعالیٰ نے اوپر بلا لیا ہے۔ ورنہ اگر دادے پردادے سب زندہ ہوتے تو آج گھروں میں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ پھر سمجھو کہ کسی چیز کے فوت ہونے کا صدمہ جب ہوا کرتا ہے جبکہ اس کا عوض بھی نہ ملے اور اگر عوض مل جائے اور عوض بھی اصل سے زیادہ مل جائے تو غم کم ہو جاتا ہے مثلاً ایک شخص سے پیسہ لے لیا جائے اور اشرفی دیدی جائے تو اس کو پیسہ چھننے کا غم نہ رہے گا حق تعالیٰ نے اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں اسی مضمون پر متنبہ فرمایا ہے کہ مصیبت کے وقت تم یہ سمجھا کرو کہ ہم سب خدا تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں جو رحیم و کریم اور مہربان ہیں جن کی شان یہ ہے وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ کہ تم سے جو کچھ لیتے ہیں اس کا بدلہ بھی دیدیتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کو دنیا سے بلا لیا ان کو تو آخرت میں پہونچا دیا جس میں مسلمان کے لئے دنیا سے زیادہ راحت ہے تم اپنے مردوں کے ساتھ ایسا برا گمان کیوں کرتے ہو کہ خدانخواستہ وہ جہنم میں گئے ہوں گے جب ان کا خاتمہ اسلام پر ہوا ہے تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے مُردے راحت میں گئے ہیں اس خیال سے صدمہ کم ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم اگر دنیا کی راحتیں ان سے چھوٹتی ہوئی دیکھتے ہیں تو آخرت کی راحتیں اس سے زیادہ پیش نظر ہوں گی یہ بدلا تو ان کو ملا اور ہم کو یہ بدلہ ملا کہ عزیز کی مفارقت سے جو طبعی رنج ہوا ہے حق تعالیٰ اس پر بہت بڑا ثواب دیں گے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسلمان کا لڑکا مرتا ہے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندے کے جگر کا ٹکڑا چھین لیا وہ کہتے ہیں ہاں خداوندا فرماتے ہیں کہ پھر میرے بندے نے کیا کہا وہ عرض کرتے ہیں

خداوندا آپ کی حمد کی اور شکر کیا اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کہا ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو تو آپ نے دیکھا ایک چیز لے کر حق تعالےٰ نے آپ کو کتنی بڑی چیز دی۔ آخرت میں جب حساب وکتاب ہوگا اس وقت آپ کو اس کی قدر ہوگی وہاں نہ یہ اولاد کام دے گی جس کے لئے آپ روتے ہیں نہ بیوی اور مال کام دے گی وہاں ثواب ہی کام دے گا یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ (جس روز آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا ان میں ہر شخص ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور کی طرف متوجہ نہ ہونے دے گا) احادیث میں مصیبت کے ثواب کی بہت تفصیل ہے اس کو دیکھنا چاہیئے۔ پس اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ (ہم اسی طرف جانے والے ہیں) میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہم سب خدا کے پاس جائیں گے اور وہاں ہم کو مصیبت کا اجر ملے گا اور جو مر گئے ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کے پاس گئے ہیں جہاں ان کو دنیا سے زیادہ راحت ہے پھر صدمہ کی کیا بات ہے۔

اسی مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے تعزیت کے طور پر عرض کیا تھا۔ جب ان کے والد حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا وصال ہوا چنانچہ کہتا ہے ؎

اِصْبِرْ فَكُنْ بِكَ صَابِرِیْنَ فَاِنَّمَا   صَبْرُ الرَّعِیَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاْسِ

آپ صبر کیجئے تاکہ ہم بھی آپ کو دیکھ کر صبر کریں کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کا تابع ہے اگر بڑے بھی بے صبری کرنے لگیں تو پھر چھوٹوں کا کیا حال ہوگا۔ سبحان اللہ کیونکر صبر کی تعلیم دی ہے۔ پھر کہتا ہے ؎

خَیْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهٗ   وَاللّٰهُ خَیْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

یعنی آپ کے لئے وہ اجر وثواب حضرت عباس کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے جو ان کے وصال پر صبر کرنے سے آپ کو ملیگا اور حضرت عباس کے لئے اللہ تعالےٰ آپ سے زیادہ بہتر ہیں۔

پس خدا تعالیٰ نے ان کو وہ جگہ دی جو ان کے لئے بہتر تھی اور آپ کو وہ چیز دی جو آپ کے لئے بہتر تھی۔ پھر غم کا ہے کا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بڑھ کر کسی نے تعزیت نہیں کی غرض اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) میں دو جملے ہیں پہلے جملے میں حق تعالیٰ کی مالکیت کو ظاہر کر کے بندوں کی تجویز کا استیصال کیا گیا ہے پھر جب ہم پہلے سے کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز ہی نہ کریں گے تو کوئی واقعہ ہمارے خلاف مرضی نہ ہوگا کیونکہ خلاف مرضی ہونے کا مبنا تجویز ہی تھی جب وہ نہ رہی تو اب جو کچھ بھی ہوگا خلاف مرضی نہ ہوگا دوسرے جملے میں عوض ملنے پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے استحضار سے رہا سہا غم اور بھی ہلکا ہو جائے گا کیونکہ میں بتلا چکا ہوں کہ جس کلفت کا عوض اس سے زیادہ مل جائے اس پر رنج نہیں ہوا کرتا حزن عقلی تو ان دونوں مضمونوں کو پیش نظر کر لینے سے کبھی نہیں رہ سکتا البتہ مفارقت کا طبعی غم اس کے بعد رہ سکتا ہے سو گو طبعی غم پر مواخذہ نہیں اور نہ وہ دفعۃً زائل ہو سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کے کم کرنے کا بھی سامان کیا ہے چنانچہ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (اور ہم اللہ کے پاس جانے والے ہیں) میں اس کا بھی سامان موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہم کو جو موت عزیز سے مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے تو غور کر لیا جائے کہ یہ صدمہ نفس مفارقت پر نہیں بلکہ اعتقاد مفارقت دائمہ اس کا سبب ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب یہ ہمیشہ کے واسطے ہم سے جدا ہو گیا اگر یہ خیال ذہن میں نہ جمے تو نفس مفارقت سے زیادہ صدمہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں بھی بعض دفعہ اس سے مفارقت ہوتی تھی چنانچہ کبھی ہم کو سفر پیش آتا تھا کبھی عزیز کو سفر پیش آتا تھا جس میں مہینہ دو مہینہ اور بعض دفعہ سالہا سال کی مفارقت ہوتی تھی مگر یہ اس لئے گوارا تھا کہ پھر ملاقات کی امید رہتی ہے تو اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس مفارقت کو دائمی مفارقت نہ سمجھو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں جانے والے ہو جہاں یہ عزیز گیا ہے اور وہاں اس سے ملاقات ہو جائے گی پس یہ مفارقت ویسی ہی چند روزہ مفارقت ہے جیسی دنیا میں کبھی سفر وغیرہ سے پیش آیا کرتی تھی ایک دن یہ مفارقت ختم ہو کر مبدل بہ وصال ہو جائیگی۔

اور قاعدہ ہے کہ جس فراق کے بعد وصال کی یقینی امید ہو وہ زیادہ گراں نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد ایک شخص کو اپنے یہاں کسی اعلیٰ ملازمت پر بلالیں اور اس کے بھائی کو مفارقت کا صدمہ ہو نظام اس کے صدمہ کی خبر سن کر خط لکھدیں کہ گھبراؤ نہیں ہم تم کو بھی بلالیں گے تو غور کر لیجئے کہ نظام کے اس خط سے غمگین بھائی کا صدمہ فوراً زائل ہو جائے گا یا نہیں یقیناً پہلا سا غم تو ہرگز نہ رہے گا۔ البتہ اب اس فکر میں پڑ جائیگا کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے کہ میں بھی وہاں پہونچ جاؤں اور جب تک مفارقت رہیگی اس وقت تک گن گن کر دن گذارے گا اور امید وصال میں یہ فراق کے دن خوشی سے گذار دے گا پس ہم کو بھی کسی عزیز کی وفات پر یہی سمجھنا چاہیئے کہ یہ مفارقت چندروزہ ہے ایک دن خدا تعالیٰ ہم کو بھی بلالیں گے جیسا اسے بلایا ہے کیونکہ حق تعالےٰ نے ہمیں خبر دی ہے كُلٌّ اِلَيْنَا رَاجِعُوْنَ (ہر شخص ہمارے پاس آنے والا ہے) پھر حیرت ہے کہ نظام حیدر آباد کے تو اس کہنے سے کہ ہم تم کو بھی بلالیں گے مفارقت کا غم جاتا رہے اور خدا تعالیٰ کے فرمانے سے ہلکا بھی نہ ہو غرض ان نصوص سے معلوم ہوا کہ صاحب شریعت کا مقصود یہ ہے کہ صدمہ کے وقت ہمارے زخم پر مرہم لگا دیں چنانچہ حزن عقلی کے استیصال کا اور حزن طبعی کی تخفیف کا ہر طرح مکمل سامان کر دیا ہے مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا دل ہر وقت زخمی رہے اس لئے ایسے سامان کرتے ہیں جن سے غم تازہ ہو اور صدمہ کی یاد دہانی ہو جیسے بچہ چاہا کرتا ہے کہ زخم پر جو کھرنڈ آگیا ہے اس کو نوچ کر کھجلاوے تاکہ مزا آوے مگر اس کا انجام یہ ہے کہ زخم بڑھ جاتا اور بعض دفعہ ہلاکت تک پہونچ جاتا ہے اسی لئے اسی لئے باپ یہ چاہتا ہے کہ کھرنڈ جما رہے تاکہ زخم جلدی اچھا ہو جائے شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ جب حق تعالےٰ کو ہمارے ساتھ ایسی رحمت ہے کہ وہ ہمارا غمگین رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ حزن وغم کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر صدمہ بھیجتے ہی کیوں ہیں پوری رحمت تو یہ ہوتی کہ صدمہ اور رنج بھیجتے ہی نہ۔ جو بعد میں اس کے ازالہ کی فکر کی جائے اس کا جواب یہ ہے کہ رنج اور صدمہ بھیجنے میں حکمتیں ہیں اس لئے بھیجتے ہیں مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس حکمت کیلئے رنج صدمہ بھیجا جاتا ہے اس حکمت کو حاصل کرد رنج

ہی کو لے کر نہ بیٹھ جاؤ جیسے استاد بچے کو طمانچہ یا قمچی اس لئے لگاتا ہے تاکہ سبق یاد کرلے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ طمانچہ اور قمچی ہی کو سبق بنالے اگر وہ سبق جلدی ہی یاد کرلے گا تو پھر استاد شفقت سے اس کو پیار کرے گا چوٹ کی جگہ کو سہلائے گا اور اگر سبق مقصود کو اس نے یاد نہ کیا بلکہ مار ہی کو سبق بنالیا تو یقیناً اب استاد کا غصہ بڑھے گا۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ ناگوار واقعات ہماری تنبیہ اور اصلاح کے لئے بھیجے جاتے ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ ہم چوکنے ہو کر اعمال کی اصلاح کرلیں یہ مقصود نہیں کہ بس رات دن ناگوار واقعات ہی کا سبق رٹتے رہیں اور زخم کو نوچتے رہیں اور اس میں پڑ کر اصل مقصود کو بھول جائیں میں بقسم کہتا ہوں اور اس سمجھنے سے زیادہ کوئی ذریعہ تسلی کا نہیں کہ ناگوار واقعات میں حکمتیں ہوتی ہیں اور اہل اللہ کو مصیبت کے وقت تعیین کے ساتھ ہر واقعہ کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے گو اجمالاً اعتقاد تو سب کو ہے مگر اہل اللہ کو بالتعیین معلوم ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ میں ہمارے واسطے یہ حکمت تھی ان کو بیماری میں چوری میں اور دشمن کی ایذا میں اور ہر ناگوار معاملہ میں کھلی حکمت نظر آتی ہے واقعہ کے ساتھ ہی ان کے دل میں کوئی کھلاتا ہے کہ یہ معاملہ اس حکمت کیلئے کیا گیا ہے۔ بس وحی تو نہیں آتی نہ آواز سنائی دیتی ہے باقی سب کچھ ہوتا ہے رات دن ان کے قلب پر افعال الٰہیہ کی حکمتیں منکشف ہوتی رہتی ہیں پھر کیا ممکن ہے کہ ان کو ناگوار واقعات سے عقلی ناگواری ہو ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کو مصائب میں بھی عشق محبت کی ترقی ہوتی ہے، حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے کیونکہ وہ اس کی حکمت اور منفعت کو کھلی آنکھوں دیکھتے رہتے ہیں۔ واللہ اگر کسی وقت تمام دنیا ان کی مخالف ہو جائے جب بھی ان کی نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی رہے گی گو خاص احباب اور بعض اقارب بھی ان کو چھوڑ دیں کیونکہ ان کو اس میں بھی حکمت نظر آتی ہے ایک کھلی حکمت تو یہ ہے کہ اس وقت عارف کی نظر مخلوق سے بالکل ہٹ جاتی ہے اور اس کا دل دنیا سے سرد ہو کر ہمہ تن خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس کو بجز ذاتِ حق کے کسی سے امید نہیں رہتی اور دنیا کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ حقیقت وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

لہ گر گریزی بر امید راحتے ہم ازانجا پیشت آید آفتے
ٹہ ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

لہ (اگر تم فرصت کی امید پر گریز کرتے ہو ممکن ہے کہ اس وقت بھی تم کو کسی آفت کا سامنا ہو جائے)

ٹہ (کوئی گوشہ بغیر درندہ دھوپ اور دام کے نہیں سوائے تعلق مع اللہ کے آرام نہیں)

مصائب و آرام اور احباب کی بے مروتی سے سالک کو اس حقیقت کا پورا انکشاف ہوجا؟ اور وہ ہمہ تن خلوت مع اللہ میں مشغول ہو جاتا ہے خلوت گاہ سے مراد یہ نہیں کہ چلہ کشی کرے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کو ذات حق کے سوا کسی سے تعلق اور ربط نہ رہے جس کو یہ دولت حاصل ہو جائے وہ ہر دم خلوت میں ہے گو بظاہر مخلوق کے ساتھ ہو۔ اور جس کو ربط قلب باللہ حاصل نہ ہوا ہو وہ چلہ کشی بھی کرے خلوت سے محروم ہے ہاں یہ دولت حاصل ہوتی ہے اول خلوت اختیار کرنے ہی سے اس لئے اہل اللہ مبتدی سلوک کو چند روز یا چند ماہ پوری خلوت کراتے ہیں کہ اختلاط مع الخلق سے بالکل روک دیتے ہیں جیسے طبیب مسہل کے دن مریض کو خلوت کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ ہمہ تن دستوں کے تصور میں مشغول رہے۔ اختلاط اور بات چیت میں مشغول ہونے سے دستوں کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کا حاصل ہونا یکسوئی پر موقوف ہو اس کے لئے خلوت کا حکم ضروری ہے مگر لوگ اطبا پر تو اعتراض نہیں کرتے صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی میں کہتا ہوں کہ بدعت وہ ہے جو دین سمجھ کر اور ثواب کے اعتقاد سے اختیار کی جائے اور اگر کسی مباح کام کو جو شرعاً ممنوع نہ ہو علاجاً اختیار کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔ پس صوفیہ پر یہ اعتراض جب صحیح ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ چلہ کشی کو دین سمجھ کر ثواب کے اعتقاد سے اختیار کرتے ہیں بلکہ وہ تو محض علاجاً اس کو اختیار کرتے ہیں اور یہ جواب تو علی سبیل التنزل ہے ورنہ میں کہتا ہوں کہ خلوت اور عزلت گزینی کا ثبوت شریعت میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی سے پہلے

جبل حرا میں عزلت اختیار کی ہے احادیث میں آتا ہے کہ آپ ہفتہ عشرہ کے لئے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر غار حرا میں رہا کرتے تھے یہی تو چلہ کشی ہے (اور گو یہ واقعہ قبل نبوت کا ہے۔ مگر حضرات صحابہ نے بعد نبوت کے اس کو نقل فرمایا ہے اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا اور نہ یہ تنبیہ کی کہ یہ صورت اب ممنوع ہے لہذا تقریر صحابہ سے اس کا شرعاً مستحسن ہونا ثابت ہوگیا اور اگر غور کیا جائے تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تقریر ہے کیونکہ اس واقعہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے اور غالب یہ ہے کہ انھوں نے آپ سے سنکر بیان کیا ہے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فعل کو بلا انکار کے بیان فرمایا تو اس پر تقریر نبوی صلے اللہ علیہ وسلم بھی پائی گئی نیز یہ تو آپ کو معلوم تھا کہ میرے اس فعل کا سب کو علم ہے اس پر بھی آپ نے نکیر نہیں فرمایا یقینی تقریر ہے ۱۲ جامع) اور بعد میں ایسی خلوت اس لئے اختیار نہیں فرمائی کہ پھر ضرورت نہ رہی مگر بعد میں خلوت طویلہ کی ضرورت نہ رہی تھی مطلق خلوت کی کاملین کو بھی ضرورت رہتی ہے حق تعالیٰ نے نبوت کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص وقت خلوت مع الحق کے لئے مقرر کرنے کا حکم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے فَاِذَا فَرَغْتَ، فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ کہ جب آپ (تبلیغ احکام وغیرہ سے) فارغ ہو جایا کریں تو (عبادت میں) محنت کیا کریں اور (اس وقت) صرف اپنے رب ہی کی طرف راغب ہوا کریں یعنی گو آپ ہر وقت عبادت ہی میں رہتے ہیں اور تبلیغ وغیرہ میں بھی آپ کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف رہتی ہے مگر وہ توجہ بواسطہ ہے جس میں کسی قدر مخلوق کی طرف بھی التفات ہوتا ہے (گو وہ درجہ مرآۃ میں ہی ہو مگر توجہ دوسری طرف ہے تو) اس کام فارغ ہو کر ایک وقت عبادت کا ایسا مقرر کیجئے جس میں بجز ذات حق کے کسی طرف مطلق التفات نہ ہو اِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ میں جار مجرور کو فعل سے مقدم کرنا مفید حصر ہے اس لئے اس سے یہ مضمون مستفاد ہوا کہ اس وقت خدا ہی کی طرف راغب رہیں اور کسی طرف التفات نہ ہو ایک مقام پر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وقت خلوت کی تعیین بھی فرما دی ہے کہ وہ کون سا وقت ہونا چاہیئے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗ

اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۙ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ؕ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۙ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ؕ (ترجمہ :- اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف یا اس نصف سے کسی قدر کم کردو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں بیشک رات کا اٹھنا خوب مؤثر ہے کچلنے میں اور بات خوب نکلتی ہے بیشک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ ہوجائی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان آیات میں حق تعالےٰ نے رات کا آخری حصہ خلوت کے لئے مقرر فرمایا ہے خواہ نصف اخیر ہو خواہ ثلث اخیر یا اس سے بھی کم وبیش اور اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ آپ کو دن میں بہت کام رہتا ہے اس میں خلوت کاملہ کا موقع نہیں مل سکتا۔ اس لئے رات کو اٹھ کر تلاوت قرآن مع الترتیل اور ذکر اللہ میں مشغول ہوا کیجئے اور اس میں تبتل کامل یعنی پوری یکسوئی کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ پھر درمیان میں اس وقت کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے کہ رات کے اس حصہ میں عبادت کرنے سے نفس پر مجاہدہ کامل ہوتا ہے۔ اور زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ ٹھیک ادا ہوتی ہے یعنی زبان وقلب دونوں متوافق ہوتے ہیں (میں کہتا ہوں کہ ان آیات سے صوفیہ کی چند عادات کی اصل نکلتی ہے اور وہ عادات یہ ہیں۔ (۱) طالبین کے لئے ہر ایک کے مناسب کوئی طریقہ ذکر متعین کر دینا۔ جیسا کہ حق تعالےٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تہجد کی نماز میں تلاوت قرآن مع الترتیل اور اس کے بعد ذکر اللہ کو متعین فرمایا ہے۔ لِاَنَّ الْاَصْلَ فِي الْكَلَامِ التَّاسِيْسَ فَيَكُوْنُ ذِكْرُهٗ فِيْ قَوْلِهٖ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ غَيْرَ تِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ (اس لئے اصل کلام میں تاسیس ہے اس لئے ذکر وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ میں تلاوت قرآن کے علاوہ) (۲) طالبین کے لئے وقت ذکر متعین کر دینا (۳) اور اس وقت میں فرصت وفراغ کی رعایت کرنا (۴) طالبین کو ذکر میں یکسوئی کی تاکید کرنا اور در اصل تعیین ذکر وتعیین وقت فرصت وغیرہ اسی یکسوئی حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ کیونکہ

شیخ اگر کوئی ذکر متعین نہ کرے تو طالب کا ذہن مختلف اذکار کی طرف چلیگا کہ یہ کروں یا وہ کروں ایسے ہی کسی کو دو تین وقت فرصت کے ملتے ہوں تو اس کو ان میں بھی یہ تردد رہیگا کہ کونسا وقت زیادہ بہتر ہے کس کو ذکر کے لئے خاص کروں شیخ کی تعیین کے بعد یہ تردد زائل ہو جاتے ہیں اور ذکر میں یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے جو لوگ معمولات صوفیہ پر جلدی سے بدعت کا الزام لگا دیتے ہیں ان کو قرآن و حدیث میں کافی غور کرنے کے بعد زبان سے بات نکلنا چاہیئے۔ اگر کامل غور و خوض سے کام لیا جائے تو محققین صوفیہ کے تمام معمولات و احوال کی اصل قرآن و حدیث سے مل جائے گی جس کی دلیل حضرت حکیم الامت کا رسالہ حقیقۃ الطریقۃ اور رسالہ مسائل السلوک ہے اور ایک رسالہ التشرف جدید تصنیف ہوا ہے جس میں احادیث کثیرہ سے محققین طریق سے اصول و فروع کی تائید کی گئی ہے باقی جہلا صوفیہ کی رسوم کا کوئی ذمہ دار نہیں نہ ان کی تائید ہم کو مطلوب ہے ۱۲ جامع)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک خاص وقت میں خلوت کی ضرورت تھی تو اور تو کس شمار میں ہیں آپ سے زیادہ کون کامل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اہل اللہ ہمیشہ ایک خاص وقت[ع] خلوت کا مقرر فرماتے ہیں جس میں سوائے حضرت حق کے کسی طرف توجہ نہ ہو اور یہ حال ہو ؎

دلآرامے کہ داری دل دروبند دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

(جس محبوب سے تمھارا دلی تعلق ہو جائے تو پھر تمام جہان سے آنکھ بند کرلو)

اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

[ع] ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر وقت اشراق تک مراقبہ میں مشغول رہتے تھے اور یہی طریقہ حضرت مرشدی سید مولانا خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم کا ہے اور حضرت سیدی حکیم الامت دام مجدہم علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر جنگل کی طرف تنہا تشریف لے جاتے ہیں جس میں کامل خلوت کے ساتھ مشغول ذکر رہتے ہیں۔ ایک بار فرمایا کہ مجھے تو حق تعالے اس وقت میں یعنی سیر صحرا ہی میں بہت کچھ عطا فرما دیتے ہیں ۱۲ جامع

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار وگیر شاہی سے بہتر ہے) فراغ دل کے ساتھ تھوڑی دیر متوجہ ہوجانا بھی بہت بڑی دولت ہے اس لئے سالکین منتہیین کو بھی ایک وقت خاص مقرر کرنا چاہیئے خواہ دس پندرہ ہی منٹ ہو جس میں غیر کا خیال بالکل نہ آوے۔ بلکہ اپنا خیال بھی نہ آوے کیونکہ توجہ الی اللہ کے وقت اپنا خیال بھی غیر ہے اسی کو حضرت قلندر فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دھم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دھم

(یعنی مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا چہرۂ انور نہ دیکھنے دوں
اوران کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی طرف متوجہ ہونے کے وقت آنکھ اور کان سب کو معطل کردیتا ہوں جملہ اعضا سے بے خبر ہوکر آپ کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں اور اس کے لئے سب سے اچھا وقت تہجد کا ہے اہل اللہ نے ہمیشہ تہجد کا اہتمام کیا ہے یہ حضرات رات کی بہت ہی قدر کرتے ہیں آجکل عام لوگ شب قدر کا تو اہتمام کرتے ہیں اور راتوں کا نہیں کرتے مگر وہ حضرات ہر رات کو شب قدر ہی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

اے خواجہ چہ پرسی ز شب قدر نشانی
ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

(اے صاحب تم شب قدر کی نشانی کیا دریافت کرتے ہر رات شب قدر ہے اگر قدر جانو)

اور بات یہ ہے کہ شب قدر کی فضیلت کا اصل سبب کیا ہے اس کو دیکھنا چاہیئے احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اس رات میں غروب آفتاب سے طلوع فجر تک اہل عالم پر توجہ خاص فرماتے ہیں سو وہ توجہ خاص ہر رات میں ہوتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ شب قدر میں تمام رات اور اول درجہ میں ہوتی ہے اور بقیہ راتوں میں نصف وثلث اخیر میں اور دوسرے درجہ میں ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کی قلیل توجہ بھی بڑی دولت ہے

کما قال تعالیٰ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَصَرَّحُوْا فِیْھَا لِکَوْنِ التَّنْکِیْرِ لِلتَّقْلِیْلِ (حق تعالیٰ کی تھوڑی سی توجہ بھی بہت بڑی ہے تصریح کی ہے کہ رضوان کا نکرہ لانا تقلیل کیلئے ہے) گو کثیر توجہ اس سے بھی بڑی ہے لیکن قابل قدر تو دونوں ہیں۔ اس لئے اہل اللہ ہر رات کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ہاں شب قدر کی اوروں سے زیادہ قدر کرتے ہیں کہ اس میں وہ دولت قابل قدر اور زیادہ ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہ ہونا چاہیئے کہ اور راتوں کی بے قدری کی جائے لیکن اگر کسی سے بوجہ کثرت مشاغل کے رات کو اٹھنے کا اہتمام نہ ہو سکے تو وہ دن میں یا اول شب میں کوئی وقت خلوت کا مقرر کر لے (خواہ بعد نماز فجر یا بعد عصر یا بعد مغرب یا بعد عشاء یا اور جس وقت میں جس کو فرصت ہو ۱۲) یہ مضمون اس شعر کی شرح میں یہاں تک پہونچ گیا۔ ع

جز بخلوت گاہ حق آرام نیست (سوائے تعلق مع اللہ آرام نہیں ہے)

اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ مصائب و آلام میں حکمتیں ہیں جن کو اہل اللہ تعیین کے ساتھ سمجھ جاتے ہیں پس اب یہ اشکال رفع ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو ازالہ حزن و تخفیف غم کا اس قدر اہتمام ہے تو اول ہی غم کیوں دیا تھا۔ میں نے بتلا دیا کہ انھوں نے بعض حکمتوں کی وجہ سے ہم کو غم دیا ہے اور مقصود حق یہ ہے کہ ہم ان حکمتوں کو سمجھ کر ان کے مقتضا پر عمل کریں نہ یہ کہ اسی غم کا سبق پڑھتے رہیں اور اسی کو لے کر بیٹھ جائیں جیسا کہ رسوم محرم میں لوگوں نے یہی طرز اختیار کیا ہے پس محرم میں جو لوگ شہادت نامے پڑھتے ہیں یہ مقصود حق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں تجدید غم ہے اور حق تعالےٰ کا مقصود یہ ہے کہ واقعہ غم سے سبق حاصل کر کے پھر اس کو کم کیا جائے نہ یہ کہ ہر سال تازہ کیا جائے اور سبق حاصل کرنے کے لئے اس کی اجمالی یاد گو بلا قصد ہو کافی ہے جس میں نہ تفصیل واقعات پڑھنے کی ضرورت ہے نہ ماہ محرم کی تخصیص کی ضرورت ہے نہ کسی پر اظہار غم کی ضرورت ہے نہ سامان اظہار کی ضرورت ہے اور اجمالی قصد سب کو معلوم ہے کہ حضرت امام مع اپنے خاندان کے میدان کربلا میں یزید کی جماعت کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے اور سبب یہ تھا کہ آپ بوجہ فسق یزید کے اس کی بیعت قبول نہ فرماتے تھے اور جماعت یزید آپ کو

بیعت پر مجبور کرتی تھی۔ آپ کے نزدیک یزید کو خلافت سے معزول کرنا واجب تھا اسی کا سامان کرنے کے لئے آپ کوفہ جا رہے تھے کہ وہاں جماعت یزید کا مقابلہ ہو گیا اور جن لوگوں نے امداد کا وعدہ کیا تھا وہ سب اپنی بات سے پھر گئے آپ اپنی بات پر جمے رہے آخر کار آپ کو شہادت نصیب ہوئی۔ اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ دین کے کام میں اگر ایک شخص اپنے نزدیک حق پر ہو تو اسے کسی کی مخالفت کا خوف نہ کرنا چاہیئے چاہے سارے مسلمان اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور کچھ لوگ جان و آبرو کے بھی درپے ہو جائیں دین کے مقابلہ میں اس کی پروا نہ کرنا چاہیئے آخر موت ایک دن آئے ہی گی پھر دین پر جم کر آ جائے تو اس سے کیا بہتر ہے اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق کا مدار کثرت رائے پر نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت شخص واحد ہی کی رائے حق پر ہو۔ چنانچہ جس وقت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت یزید سے انکار کیا ہے اس وقت تمام صحابہ اور تابعین کی رائے ان کے خلاف تھی۔ سب نے یزید کی بیعت کو قبول کر لیا تھا۔ اور اکثر نے امام حسین کو ارادہ خروج سے منع بھی فرمایا اور خیر خواہانہ نصیحت بھی کی تھی۔ مگر حضرت امام چونکہ اپنی رائے کو انشراح صدر کے ساتھ صحیح سمجھے ہوئے تھے اس سے نہ ہٹے اور اسی پر جان دیدی۔ کیا آج کسی کا منہ ہے جو یوں کہہ سکے کہ امام کی رائے غلط تھی کیونکہ کثرت رائے ان کے خلاف تھی یہ کثرت رائے کی شاخ آجکل ہی نکلی ہے سلف میں بجز صورت اجماع کے جس میں سب کا اتفاق ضروری ہے محض کثرت کا کوئی اعتبار نہ تھا چنانچہ مسائل فقہیہ میں بکثرت ایسے مسائل موجود ہیں جن میں ایک امام تمام عالم سے تفرد کرتا ہے اور کوئی اس کی رائے کو کثرت رائے کے خلاف ہونے کی وجہ سے غلط نہیں کہتا۔ اگر کوئی اس کا رد بھی کرتا ہے تو جواب میں احادیث یا نصوص پیش کرتا ہے محض کثرت رائے کی آڑ کوئی نہیں پکڑتا۔ پھر مخالفین کی جواب میں وہ متفرد بھی احادیث و نصوص پیش کر دیتا ہے اور اس کے مقلد یہ دیکھ کر کہ ہمارے امام کے پاس بھی اپنی رائے کی ثبوت یہ نصوص شرعیہ موجود ہیں اس کی تنہا رائے کو قبول کر رہے ہیں اور اس کے موافق عمل کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ حنفیہ کے نزدیک قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہے جو تمام ائمہ

مذاہب کے خلاف ہے۔ دارالحرب میں حربی کافر کے ساتھ معاملہ ربوٰ جائز ہے جس میں جمہور ائمہ کا حنفیہ سے خلاف ہے اگر تفرد دلیل غلط ہے اور کثرت رائے دلیل صواب ہے تو ان مسائل میں آپ نے امام ابوحنیفہ کی تقلید کو کیوں نہیں ترک کر دیا (اگر واقعہ امام حسینؓ میں کوئی یہ کہے کہ اس وقت بھی بہت لوگ امام کی رائے سے موافق تھے مگر خوف کی وجہ سے موافقت ظاہر کرتے تھے سو اول تو یہ غلط ہے کیونکہ حضرات صحابہ و تابعین کی شان یہ ہے لَا يَخَافُوْنَ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (ملامت کرنے والوں کی ملامت سے دین کے بارہ میں نہیں ڈرتے) وہ اظہار حق میں کسی سے کیا ڈرتے امام کی شہادت کے بعد یزید کے منہ پر ایک صحابی نے ایسی کوری کوری سنائی تھی کہ یزید ہونٹ چاٹتا رہ گیا تھا۔ کیا ان حضرات پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خوف کی وجہ سے امام کا ساتھ نہ دیا۔ نہیں بلکہ ان کو درحقیقت امام کی رائے ہی سے اختلاف تھا اور اگر مان لیا جائے کہ خوف کی وجہ سے صحابہ و تابعین نے ساتھ نہیں دیا تھا تو اس سے ان لوگوں کو پوری سند ملتی ہے جن کو آپ آجکل ڈرپوک کہتے ہیں اور یہ مشہور کرتے ہیں کہ یہ جمہور کے ساتھ خوف کی وجہ سے شریک نہیں ہوتے وہ آپ کے اس الزام کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر کے ان صحابہ کے طرز عمل کو دلیل میں پیش کر دیں گے جنھوں نے آپ کے نزدیک خوف کی وجہ سے ایک امر واجب میں امام حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا تھا۔

نیز وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم جو ہم کو منفرد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ ہماری رائے کے ساتھ بہت علماء کو موافقت ہے جو خوف عوام ولعن وطعن جہلاء کے خوف سے اپنی موافقت ظاہر نہیں کرتے جیسا کہ صحابہ و تابعین کے خوف کی وجہ سے امام کی موافقت ظاہر نہ کی تھی۔ اور جو علماء تمہارے ساتھ ہیں ان میں بھی بعض افراد دل سے ہماری رائے کو صحیح جانتے ہیں مگر خوف یا طمع کی وجہ سے تمہارے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اور یہ محض الزامی جواب نہیں بلکہ اگر تفتیش و انصاف سے کام لیا جائے تو اس کا صدق واضح ہو جائے گا۔

(بقیہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ)

غرض آپ امام حسین رضی اللہ عنہ کو متفرد مانیں یا غیر متفرد ان کا مدعیٰ ہر طرح سیدہا ہے"۔

جامع) ایک سبق اس واقعہ سے یہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کو بتلادیا گیا کہ کاملین کا بھی امتحان ہوا کرتا ہے۔ اوران کو بھی تکلیف پیش آیا کرتی ہے جس سے ان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون ولی ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور حد درجہ محبوب تھے جن کے بارہ میں پیشین گوئی ہے۔ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ (اہل جنت کے جوانوں کے سردار ہیں) مگر دیکھ لیجئے ان کو بھی کیسا امتحان وابتلاء پیش آیا اور گو کوئی شخص اپنے محبوب کو تکلیف نہیں دے سکتا مگر درحقیقت اہل اللہ کے لئے ان واقعات میں کلفت جسمانی سے زیادہ روحانی راحت ولذت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے یہ کلفت جسمانی کچھ نہیں معلوم ہوتی اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم چاہو تو یہ جسمانی کلفت تم کو نہ دی جائے تو وہ کبھی اس کو گوارا نہ کریں گے اور یوں کہیں گے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمھاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت ہو کہ اس پر آپ خنجر آزمائیں)

صاحب محبت تو وہ چیز ہے کہ اس میں بعض لوگ ادنیٰ ادنیٰ محبوبوں کے لئے خوشی کے ساتھ جان فدا کر دیتے ہیں حالانکہ جان دینے کے بعد وہ محبوب ان کو اس جان نثاری کا کچھ صلہ بھی نہیں دے سکتا۔ تو پھر یہ کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ عاشقان الٰہی کو جان دینے میں کچھ بھی روحانی پریشانی ہوتی ہوگی جبکہ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم رضائے محبوب کے لئے جان دے رہے ہیں اور یہ بھی یقین ہے کہ مرنے کے بعد وہ اس کا صلہ بھی بہت کچھ دیں گے شہادت کا صلہ اتنا عظیم الشان ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت کے رہنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جو دوبارہ دنیا میں آنا چاہے سوا شہید کے کہ وہ شہادت کا صلہ دیکھ کر تمنا کریگا کہ میں دوبارہ دنیا میں جاؤں اور پھر شہید ہوں پھر جاؤں اور پھر شہید ہوں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم

جیسے کال فرماتے ہیں وَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی۔ (پسند کرتا ہوں اس بات کو کہ اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں)

صاحبو شہادت میں کچھ تو لذت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں بار بار اس کی تمنا فرماتے ہیں آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیا گذرتی ہوگی جو یہ بات آپ کی زبان پر آئی ورنہ آپ تو بڑے ضابط تھے (شہید جب جان دینے کے لئے بڑھتا ہے تو زبان حال سے حق تعالےٰ کی جناب میں یوں کہتا ہوا جاتا ہے ؎

بجرم عشق توام می کشند وغوغا ئیست
تو نیز برسر بام آکہ خوش تماشا ئیست

(یعنی وہ محبوب حقیقی سے عرض کرتا ہے کہ لوگ آپ کے عشق و جرم میں مجھے قتل کر رہے ہیں۔ ذرا آپ بھی ایک نظر یہ تماشا دیکھ لیجئے۔)

پھر چونکہ مسلمان کو یقین ہے کہ حق تعالےٰ دیکھ رہے ہیں۔ تو محبوب کے سامنے اس کے نام پر جان دینے کی اسے کیا کچھ لذت آتی ہوگی اس کو وہی جان سکتا ہے ۱۲ ج مع)

شہادت کی فضیلت کے لئے کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور وہ پاک صاف ہو کر خدا کی جناب میں جاتا ہے تو جس کو خدا سے محبت وعشق ہوگا وہ کیونکر اس کا متمنی نہ ہوگا۔ حقیقی شہادت کی تمنا ہر قلب مسلم میں ہے اور جس کے دل میں اس کی آرزو نہیں اس کے ایمان میں نقص ہے۔ مگر ہاں کسی موقعہ پر پیش قدمی کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ موقعہ شہادت حقیقی کا موقعہ ہے جس میں شرعاً جان دینا مطلوب ہے اور اگر شرعاً کسی موقعہ پر شہادت کے شہادت ہونے میں شبہ ہو جاوے وہاں عارف کبھی جان نہ دے گا۔ بلکہ ایسے موقعہ پر وہ اپنی جان کی حفاظت کرے گا۔ گو اس صورت میں لوگ اس کو ملامت بھی کریں بزدل اور ڈرپوک جو چاہیں کہیں اس کی کچھ پروا نہ کرے گا کیونکہ وہ حقیقی شہادت کا طالب ہے جس سے سوائے رضائے حق واعلائے کلمۃ اللہ کے کچھ مقصود نہ ہو۔ پھر جہاں رضائے حق حاصل ہونے ہی میں شبہ ہو

وہاں محض مخلوق کی نظر میں بہادر اور جری بننے کے لئے وہ کبھی اقدام نہ کرے گا کیونکہ اس کا مشروب تو ہے ؎

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے ہم ننگ و نام کے خواہشمند نہیں ہیں)

اور وہ یوں کہتا ہے ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
اور جو خود ناکام ہو اس کو کسی سے کام کیا

عاشق کی ناکامی محرومی کی ناکامی نہیں ہوتی بلکہ طلب ترقی کی وجہ سے وہ اپنے کو ناکام و نامراد سمجھتا رہتا ہے وہ کسی حالت پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ جتنا وصال سے کامیاب ہوتا ہے اس سے آگے ترقی کا طالب ہوتا ہے اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اس لئے ناکام کہدیا اور اس طریق میں یہ ناکامی ہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو شخص اپنے کو کامیاب سمجھ کر کسی خاص حالت پر قناعت کرے اور طلب کی پیاس کو بجھا دے وہ اس طریق میں ناکام ہے۔ خوب سمجھ لو۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت امام کے واقعہ میں جو سبق ہمارے لئے ہے اس کے واسطے گاہے گاہے اجمالی یاد کافی ہے تفصیلی واقعات کی کچھ ضرورت نہیں اور اجمالی واقعہ سے کوئی مسلمان نا آشنا نہیں۔ پھر اس کے لئے خاص طور پر ہر سال مجلسیں منعقد کرنا اور اس میں اظہار غم کے طور پر یہ واقعہ دل خراش پڑھنا اور مسلمانوں کے دلوں کو تازہ غم دے کر زخمی کرنا اور شہداء پر نوحہ و ماتم کرنا بالکل خلاف عقل[عہ] و خلاف مقصود ہے حق ہے۔

[عہ] لطیفہ :- ایک سرحدی کابلی محرم کے زمانہ میں ہندوستان آیا تو اس نے تعزیہ و علم وغیرہ نکلتے ہوئے دیکھے اور اس کے پیچھے کچھ لوگوں کو ماتم و نوحہ کرتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ لوگوں نے کہا تم کو معلوم نہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اس مہینہ میں شہید ہوئے ہیں۔

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

صاحبو! میں کہہ چکا ہوں کہ صدمہ اس واقعہ میں ہوتا ہے جو مبتلا کے خلاف مرضی ہو تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ واقعہ ان حضرات کے خلاف مرضی ہوا اور وہ شہادت کے طالب نہ تھے ہرگز نہیں۔ تو جب وہ شہادت کے طالب تھے تو اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ اس کے لئے نوحہ و ماتم کیسا۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالےٰ ان حضرات شہدار کو وہ مراتب و منازل عطا نہ فرماتے جو اب حاصل ہوئے۔ کیا آپ کے نزدیک ان حضرات کو اس واقعہ سے اجر نہیں ملا۔ اور بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر آپ کے سلف دین کے لئے ایسی جان نثاری اور جانفروشی نہ کرتے تو آج آپ کو اس کے لئے ہمت کیونکر ہوتی اور اگر یہ نظیریں آپ کے سامنے نہ ہوتیں تو ایسے مواقع میں دین کے لئے جان دینے کو تمہارے دل کیسے بڑھتے۔ قاعدہ ہے کہ نظائر سے انسان کی ہمت بلند ہوتی ہے اور سلف کے کارناموں کو یاد کرکے پچھلوں کو ان کے اتباع کا شوق ہوتا ہے اگر اس واقعہ کا ظہور نہ ہوتا تو یہ سبق ہم کو کیسے حاصل ہوتا جب اس واقعہ میں ہمارے لئے بھی حکمت ہے۔ اور ان حضرات کا بھی یہ مطلوب تھا اور ان کو اس پر اجر بھی بہت بڑا ملا ہے۔ تو پھر کیا ہر سال اس قدر اظہار غم جو آجکل کیا جا رہا ہے منشار حق کے خلاف نہ ہوگا۔

شائد اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ پھر کیا اس واقعہ کے وقوع کے وقت بھی غم نہ کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ بات تو اس وقت بھی تھی۔ یہ واقعہ تو اس وقت بھی ان کے لئے باعث اجر تھا اور شہادت ان کی مطلوب تھی اور اس وقت بھی ہمارے لئے اس میں حکمت تھی۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس وقت کا غم کرنا غیر اختیاری ہوتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵ کا) سرحدی نے کہا وہ تو تیرہ سو برس پہلے شہید ہو چکے ہیں کیا ہندوستان میں اب خبر آئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ بہت ہی غافل ہیں کہ تیرہ سو برس کے واقعہ پر آج غم کرنے بیٹھے ہیں اور مثنوی میں ایک ایسی ہی حکایت ایک شاعر کی جو حلب میں زمانہ محرم میں آیا تھا لکھی ہے۔ واقعی مقتضائے عقل تو یہی ہے کہ صرف واقعہ کے وقت غم کیا جائے سالہا سال تک غم کو لیکر بیٹھنا بقول اس سرحدی کے غفلت ہی کی علامت ہے ۱۲ جامع

قاعدہ ہے کہ ظہور حادثہ کے وقت طبعی غم بلا اختیار ہوا کرتا ہے۔ اور امر غیر اختیاری میں انسان معذور ہے۔ لیکن جب طبعی غم کی حد گذر جائے اس کے بعد غم کو لے کر بیٹھنا یہ مذموم ہے۔ بس اب اس کی حکمتوں پر نظر کرنا چاہیئے۔ اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے۔ مثلاً ایک شخص ڈاکٹر سے خود کہے کہ میرا اپریشن کردو۔ اس کے لئے وہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اس کی خوشامد بھی کرتا ہے مگر اپریشن کے وقت اس کے منہ سے آہ اور چیخ بھی نکلتی ہے کیا آپ اس شخص کو اس آہ پر کچھ ملامت کریں گے ہرگز نہیں آخر کیوں محض اسی وجہ سے کہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔ بس اسی طرح یہاں سمجھئے کہ گو وقت وقوع بھی اس واقعہ کی حکمتیں عقلا رکی پیش نظر ہوتیں مگر اس وقت غیر اختیاری غم بھی ساتھ ساتھ ہوتا اور اس میں وہ معذور ہوتے۔ لیکن اب جو ہم رنج صدمہ ظاہر کرتے ہیں یہ عقلی غم ہے طبعی نہیں اور اس کی ممانعت ہے۔ جیسے مثال مذکور میں اپریشن ختم ہونے اور زخم کے اچھا ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اپریشن کا غم کرتا رہے اور ہر سال اس پر ماتم کیا کرے تو اس کو یقیناً سب لوگ بے وقوف کہیں گے اور اس رنج وغم میں اُسے کوئی معذور نہ کہے گا۔ طبعی رنج وغم کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پوری ہو جائے پھر طبعی رنج نہ ہوگا بلکہ عقلی ہوگا فقہاء نے نصوص شرعیہ سے اس حد کو سمجھا ہے واقعی صوفیہ اور فقہا یہ دونوں فرقے حکمار امت ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان دونوں میں باہم جدال ونزاع ہے جس کی وجہ ہماری بد قسمتی ہے کہ بعض لوگ ان دونوں جماعتوں میں غیر محقق بھی ہوتے ہیں۔ ان ناقصین میں نزاع ہوتا رہتا ہے ورنہ اگر دونوں محقق ہوں تو کبھی نزاع نہ ہو۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ تین روز کے بعد تعزیت کرنا پاس والوں کو ممنوع ہے ہاں جو لوگ باہر رہتے ہوں ان کو تین دن کے بعد بھی تعزیت کی اجازت ہے وجہ یہ ہے کہ تین دن میں طبعی غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد تعزیت کرنا اس کو بڑھانا ہے۔ اب یاد دہانی سے غم تازہ ہوگا۔ اور شہری آدمی تین دن کے اندر اندر آسکتا ہے اس کو تین دن کے بعد تعزیت نہ کرنا چاہیئے۔ ہاں مسافر کو اجازت ہے کیونکہ وہ تین دن کے اندر نہیں آسکتا تھا وہ تو بعد ہی میں پہونچے گا۔ اب اگر وہ آکر تعزیت نہ کرے تو طرفین میں بدمزگی

ہو گی صاحب واقعہ اپنے دل میں کہیگا کہ اس ظالم کو میری مصیبت سے غم ہی نہیں ہوا اس نے ایک حرف بھی تسلی کا نہ کہا اس لئے مسافر کو تین دن کے بعد بھی جب وہ آئے تعزیت کرنی چاہئے اور اس کی تعزیت سے صاحب واقعہ کا غم نہ بڑھے گا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص ضرورت کی وجہ سے اتنے دنوں کے بعد تعزیت کر رہا ہے پہلے نہ آ سکتا تھا۔ فقہاء نے تین دن کی حد کو غالباً اس حدیث سے استنباط کیا ہو لا یحل اَلْمُؤْمِنُ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ کوئی شخص اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ہجراں نہ کرے یعنی اگر کسی سے دنیوی معاملہ میں رنج و تکرار ہو گیا ہو تو تین روز تک تو بات چیت سلام کلام ترک کرنا جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں کیونکہ شارع علیہ السلام نے عادت انسانیہ سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ طبعی غم و غصہ تین دن میں کم ہو جاتا ہے اس کے بعد بہ تکلف بڑھانے سے رنج بڑھے گا۔ اگر اسباب زیادہ اختیار نہ کئے جائیں تو تین دن کے بعد رنج کا غلبہ باقی نہیں رہ سکتا تو جب تک طبعی رنج کا غلبہ تھا اس وقت تک شریعت نے بھی اس کو ترک کلام میں معذور سمجھا۔ جب غلبہ جاتا رہا اب یہ معذور نہیں۔ اب ترک کلام و سلام محض خبث نفس کی وجہ سے ہے اس کی اجازت نہیں۔ اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی رحمت فرمائی کہ تین دن تک ہجراں کی اجازت دیدی۔ اگر کوئی فلسفی ہوتا تو ایک دن کے لئے بھی ہجران کو جائز نہ رکھتا اور یہ کہتا کہ ہجران اتفاق و اتحاد باہمی کے خلاف ہے پس رنج و تکرار کو جلد رفع کرنا اور فوراً صفائی کر لینا چاہیئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جذبات نفس پر بڑی گہری نظر ہے۔ آپ نے تین دن تک ہجراں کی اس لئے اجازت دی کہ فوراً صفائی کرنا عادۃً دشوار اور نفس پر بہت گراں ہوتا ہے آپ نے ہمارے اوپر گرانی اور دشواری ڈالنا گوارا نہیں فرمایا۔ دوسرے رنج و تکرار کے وقت چونکہ دونوں طرف نفس میں رنج و غصہ بھرا ہو گا تو فوراً صفائی کرنے سے یہ صفائی بیکار ہو گی۔ گو ظاہر میں دونوں بات چیت کرنے لگیں گے مگر دلوں میں سخت غبار ہو گا۔ اس حالت میں صفائی کرنے سے کینہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے جو غرض تھی یعنی اتحاد و اتفاق وہ مطلق حاصل نہ ہو گی۔ اس لئے آپ نے معاً صفائی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ تین روز تک ترک کلام و ہجراں سے دل کا غبار نکالنے کی

اجازت دیدی جب تین دن میں دل کا غبار نکل گیا اور غلبۂ رنج فرو ہو گیا اب ملنے جلنے کا حکم دیا اس وقت صفائی سے نفع بھی ہوگا اور چونکہ غبار نکل چکا ہے اس لئے کینہ بھی پیدا نہ ہوگا۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جذبات نفس کی جس درجہ رعایت ہے اس کی نظیر نہیں مل سکتی (اور یہ حکم دنیوی رنج و تکرار کا ہے اور اگر کسی سے دینی معاملہ میں رنج ہو گیا ہو تو اس میں یہ حد نہیں بلکہ جب تک دوسرا شخص معصیت سے جو سبب ہجراں تھی توبہ خالص نہ کرے اس وقت تک ہجراں کی اجازت ہے اور بعض مواقع میں واجب ہے ۱۲ جامع) اس حدیث سے تین دن کے بعد رنج کو لے کر بیٹھنے کی ممانعت ثابت ہوئی دوسری خرابی شہادت ناموں کے پڑھنے اور مجالس منعقد کرنے میں یہ تھی کہ اس میں اظہار غم ہے اور اظہار غم جائز نہیں اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے بعض صحابہ کو دیکھا کہ انھوں نے اپنی چادریں اتار دی ہیں اہل عرب کا لباس ازار و ردا تھا اس کو عربی میں حلہ کہتے ہیں مہذب لوگ قمیص بھی پہنتے تھے مگر زیادہ لوگ چادرہ اور لنگی ہی پہنتے تھے اس وقت القاء ردا (چادر اتارنا) غم کی علامت تھی جیسے آجکل بازو پر سیاہ کپڑا باندھنا لوگوں نے انگریزوں سے سیکھا ہے اور جو لوگ کرتہ پہنتے تھے وہ گریبان چاک کرتے تھے ان کے یہاں شق جیب علامت غم تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چادرہ اتارے ہوئے دیکھ کر فرمایا أَفِعْلَ الْجَاهِلِيَّةِ تَأْخُذُوْنَ أَوْ بِأَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ تَتَشَبَّهُوْنَ لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَدْعُوَ عَلَيْكُمْ دَعْوَةً تَرْجِعُوْنَ فِيْ غَيْرِ صُوَرِكُمْ (فَأَخَذُوْا أَرْدِيَتَهُمْ وَلَمْ يَعُوْدُوْا لَهٗ بَعْدُ) أَخْرَجَهُ ابْنُ مَاجَهْ كَمَا فِي الْمِشْكٰوةِ بِسَنَدٍ ضَعِيْفٍ فِيْهِ مَتْرُوْكٌ وَلٰكِنْ تَأَيَّدَ مَعْنَاهُ بِحَدِيْثِ لَيْسَ مِنَّا مَنْ شَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ ۱۲ جامع) ترجمہ۔ کیا تم جاہلیت کا طریقہ اختیار کرتے ہو یا اہل جاہلیت کے ساتھ مشابہت کرتے ہو۔ میرا مقصد ہوا تھا کہ تم پر ایسی بد دعا کروں جس سے تمہاری صورتیں بدل جائیں اس وعید کو سنکر صحابہ نے فوراً چادریں اوڑھ لیں۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ اظہار غم ناجائز ہے حالانکہ چادرہ اتارنے میں کوئی زیادہ اظہار نہیں مگر آپ کو اتنا بھی ناگوار ہوا۔ پھر یہ رونا اور ماتم کرنا اور اس کے لئے

مجالس منعقد کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے جو سراپا اظہار ہے۔ رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صاحبزادہ کے واقعہ انتقال میں اَنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ہم تمھارے فراق میں اے ابراہیم غمگین ہیں) فرمانا سو اتنا اظہار غم وقت ظہور واقعہ کے مضائقہ نہیں جب بیان اور شکایت الٰہی نہ ہو چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا اَلْعَيْنُ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا یعنی آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں اور دل غمگین ہے مگر زبان سے وہی کہیں گے جس سے خدا راضی ہو رہا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر یہ فرمانا [عہ]

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا ؁ صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

(مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑی ہیں۔ اگر دنوں پر پڑتی تو وہ راتیں ہو جاتیں)

سو اول تو بقاعدہ محدثین اس کا ثابت ہونا مشکل ہے کہ یہ اشعار حضرت فاطمہ رضؓ ہی کے ہیں (اہل سیر کی روایت ہے جس میں رطب و یابس سب بھرے ہوتے ہیں ۱۲ جامع) دوسرے یہ غلبۂ حال تھا، تیسرے اس میں کوئی شکایت تھوڑا ہی ہے صرف صدمہ کی عظمت بتلائی ہے جیسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کے انتقال پر اَنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ (ہم تمھاری جدائی میں اے ابراہیم غمگین ہیں) فرمایا تھا۔ رہا اس کو نظم میں فرمانا تو نظم و شعر اہل عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے ان کو نظم و نثر دونوں برابر ہیں۔ چوتھے یہ بھی تو خیال کیا جائے کہ وہ واقعہ کیسا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال کیسی مصیبت عظمیٰ تھی اس وقت اگر دل پھٹ جاتا تو تعجب نہ تھا یہ بھی حضرات صحابہ رضؓ و اہل بیت کا غایت تحمل ہے کہ انھوں نے دو چار باتوں ہی پر اکتفا کیا۔ پانچویں حضرات صحابہ کو انقطاع نزول وحی کا صدمہ زیادہ تھا کہ اب بار بار حق تعالیٰ کا کلام نازل نہ ہوگا۔ یہ نعمت ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ سو محض وفات پر اظہار غم نہ تھا بلکہ انقطاع برکات کا صدمہ بھی زیادہ تھا جس کو انھوں نے ظاہر کیا ہے۔

[عہ] اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا اس غم کا اظہار جائز ہے کیا یہ دوسرے غموم سے جن کے اظہار کی ممانعت ہے مستثنیٰ ہے (۱۲ جامع) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غم دین کا ہے جو علامت ہے حب خالق کی بخلاف غم دنیا کے کہ علامت ہے حب خلق کی ۱۲ منہ

الغرض قواعد شرعیہ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اظہار غم کی ممانعت ہے اس سے ان امور کا ممنوع ہونا بھی ثابت ہو گیا جو آجکل محرم میں کئے جارہے ہیں اور جتنے قصے آجکل اس قسم کے ہوتے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ اہل مال و اہل دولت کو دراصل روپیہ خرچ کرنے اور نام پیدا کرنے کی خواہش ہوتی ہے اس کے لئے یہ بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں جو اہل دولت دنیا دار ہیں وہ تو اپنی اولاد کی بسم اللہ اور ختنہ اور شادی وغیرہ میں دل کے حوصلے نکال لیتے ہیں اور جو اولاد سے محروم ہیں وہ گدھے گدھیوں کی شادی کر کے حوصلے نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی کی طرف ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں۔ ایک جگہ بندر بندریا کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی اور جو اہل دولت دیندار ہیں انھوں نے دین کی صورت میں روپیہ خرچ کرنے کا بہانہ نکال لیا کسی نے مولود شریف اختیار کیا کسی نے محرم میں ماتم برپا کیا کسی نے گیارھویں شریف نکالی کسی نے شب برات کا حلوا ایجاد کیا جو لوگ ربیع الاول میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر خوشی ظاہر کرتے ہیں کوئی ان سے یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی تو اسی مہینہ میں ہوئی ہے اس پر غم بھی تو ظاہر کرو۔ واقعی حق تعالٰے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و وفات دونوں کو ایک مہینہ میں جمع کر کے اس حکمت کا اظہار فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو اس زمانہ میں نہ فرط غم ظاہر کرنے کا موقع ملے بموجب زمان ولادت ہونے کے نہ فرط سرور ظاہر کرنے کا موقع ملے بوجہ زمان وفات ہونے کے بس جب یہ مہینہ آتا ہے تو خوشی اور غم دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں جس سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے یہ تو عوام کی حالت تھی۔ اب خواص کی سنئے انھوں نے بھی اظہار شوکت و شان کے لئے بعض صورتیں نکالی ہیں مولویوں نے تو مدارس کے جلسے نکالے ہیں جن میں اکثر نام و نمود کا اظہار ہوتا ہے چنانچہ کانپور میں ایک سال دو مدرسوں کا جلسہ تھا ہر ایک چاہتا تھا کہ اپنی کارروائی دوسرے سے زیادہ دکھلائے تو ایک مدرسہ والوں کے دوسرے مدرسہ کے طلبہ کو توڑ کر اپنے یہاں بلایا کہ تم ہمارے مدرسہ سے سند اور دستار لینا دوسرے مدرسہ والوں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان طلبہ کو برا بھلا کہا وہ اس ارادہ سے رک گئے تو پہلے مدرسہ والوں نے ایک طالب علم کو کسی بہانہ سے بلا کر کوٹھری میں بند کر دیا اور جلسہ کے وقت تک بند رکھا

تاکہ بھاگ نہ جائے اور دستار بندی کے وقت نکال کر اسے سند اور دستار دے کر اپنے مدرسہ کی طرف منسوب کر لیا پھر کہدیا کہ اب جاؤ جہاں چاہو۔ بھلا یہ دین ہے۔ واللہ بجز شہرت اور نام کے اس سے کچھ مقصود نہیں۔ پھر جلسوں میں رقمیں ایسی صرف ہوتی ہیں جو جلسہ کے لئے مخصوص نہیں ہوتیں لوگوں نے تو نہ معلوم کیا سمجھ کر چندہ دیا تھا اور یہاں وہ رقمیں جلسہ کے انتظامات میں صرف کی جاتی ہیں انھیں رقموں سے امراء و رؤسا کی بھی دعوت ہوتی ہے اور غربا کو بھی کھلایا جاتا ہے اور اس کو ہم سب کھاتے ہیں۔ اگر ان جلسوں کا منشاء محض دین ہوتا تو ان میں حدود شرعیہ کا بھی تو لحاظ ہوتا مگر کچھ نہیں ان کا منشا بجز شہرت کے کچھ نہیں اس لئے حدود کی کچھ پروا نہیں۔ یہ تو مولویوں کی حالت تھی ستم یہ ہے کہ صوفیوں نے بھی جن کا مشرب اپنے کو مٹانا اور گمنام کرنا ہے نام و نمود کی بعض صورتیں نکالی ہیں چنانچہ ہر سال جا بجا عرس ہوتے ہیں جن میں چار طرف سے مدعیان تصوف کا ہجوم ہوتا ہے تاکہ لوگ جان لیں کہ عرس میں جتنے حضرات تشریف لائے ہیں یہ سب صوفی ہیں۔ پھر قوالی میں حال اور وجد سے تو اچھی طرح اپنے تصوف کو ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ ہاں ہمارے اندر بھی کچھ ہے۔ صاحبو! حقیقی صوفی کبھی ان طریقوں کو پسند نہیں کر سکتا علماء کے فتوے سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو یہ عرس وغیرہ اسباب شہرت ہونے کی وجہ سے خود طریقت کے بھی خلاف ہیں آہ اب مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب جیسے بے نفس کہاں ہیں جو شہرت و نام سے بھاگتے تھے اور اپنے کو مٹانا چاہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لباس ایسا موٹا جھوٹا ہوتا تھا کہ صورت سے کوئی نہ سمجھے کہ یہ بھی کوئی بڑے عالم یا شیخ ہیں مگر ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی
نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(ولی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہلِ دل کو ہوتا ہے)

وہ کتنا ہی اپنے کو چھپاتے بھلا کہاں چھپ سکتے تھے پہچاننے والے پہچان ہی لیتے تھے تو پھر آپ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ جب کہیں سفر میں جاتے ساتھیوں کو نام ظاہر کرنے سے

منع فرما دیتے تھے کہ میرا نام کسی کو نہ بتلانا اگر کوئی مولانا ہی سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے تو فرماتے حافظ خورشید حسن ' یہ مولانا کا تاریخی نام تھا اس لئے کذب بھی نہ ہوتا اور سائل کو پتہ بھی نہ چلتا کیونکہ یہ نام مشہور نہ تھا ۔ لوگوں میں مشہور نام مولانا محمد قاسم ہی تھا ۔ خورشید حسن سن کر سائل یہ سمجھتا کہ یہ کوئی اور شخص ہے ۔ مولانا محمد قاسم صاحب نہیں ہیں اور اگر کوئی پوچھتا کہ آپ کا وطن کہاں ہے ۔ فرماتے الہ آباد ۔ بعض مخلصین کو شبہ ہوا کہ اس میں تو کذب ہوگیا تو مولانا سے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وطن الہ آباد کدھر سے ہوگیا ۔ فرمایا کہ نانوتہ بھی تو خدا تعالیٰ ہی کا آباد کیا ہوا ہے تو لغۃً وہ بھی الہ آباد ہی ہے ۔ مولانا تھے بڑے ذہین ۔ بات بات سے ذہانت ٹپکتی تھی ۔

غدر کے موقعہ میں مولانا نے ایک دفعہ عجیب ذہانت سے بچاؤ کیا ۔ بعض لوگوں نے آپ کی شکایت کر دی تھی کہ یہ بھی غدر تھانہ بھون میں شریک تھے تو تین روز تک آپ روپوش رہے ۔ تین دن کے بعد آپ ظاہر ہوگئے ۔ لوگوں نے کہا حضرت ابھی تک آپ کی تلاش جاری ہے اور وارنٹ موقوف نہیں ہوا ابھی کچھ دنوں اور چھپے رہیئے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر تین ہی دن غار ثور میں روپوش رہے تھے بس سنت پر عمل کر لیا ہے اس سے زیادہ مدت تک مخفی رہنا زائد علی السنت ہے ۔ سبحان اللہ اتباع سنت اسے کہتے ہیں کہ روپوشی میں بھی اس کا لحاظ رہا کہ سنت سے زیادہ نہ ہو آجکل لوگ نوافل و تسبیحات ہی میں اتباع سنت کو منحصر سمجھتے ہیں کمال اتباع یہ ہے جو مولانا کے فعل سے ظاہر ہوا غرض تین دن کے بعد آپ علانیہ پھرتے تھے کئی مرتبہ گھر پر دوڑ آئی مگر آپ اپنی ذہانت سے بچ جاتے تھے ۔ ایک دفعہ مولانا چھتے کی مسجد میں تھے کسی نے مخبری کر دی اور فوراً دوڑ آگئی مولانا اس وقت جہاں بیٹھے تھے اس جگہ سے ذرا کھسک کر بیٹھ گئے ۔ پولیس کے افسر نے صورت سے نہ پہچانا کہ یہی مولانا محمد قاسم ہیں کیونکہ لباس مولانا کا عالمانہ نہ ہوتا تھا عامیانہ لباس پہنتے تھے اس نے سمجھا کہ یہ کوئی عالم نہیں معمولی آدمی ہے تو اس نے مولانا ہی سے پوچھا کہ یہاں مولانا محمد قاسم صاحب آئے تھے تو آپ نے اپنی پہلی جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ابھی تو یہیں تھے دیکھ لو ۔ یہ کہہ کر اپنے

جوتے ہاتھ میں لے پولیس کے درمیان سے نکل گئے۔ بعد میں افسر پولیس کو معلوم ہوا کہ جس سے میں نے باتیں کی تھیں وہی مولانا محمد قاسم صاحب تھے وہ مولانا کی ذہانت پر بڑا حیران ہوا کہ جھوٹ بھی نہیں بولا اور صاف بچ بھی گئے۔ غرض اس ذہانت سے بچتے رہے مگر تین دن کے بعد روپوش نہیں ہوئے۔ خیر یہ تو مولانا کی ذہانت کا ایک لطیفہ تھا مجھے بتلانا یہ تھا کہ یہ حضرات شہرت سے کس درجہ بھاگتے تھے کہ صورت سے کوئی ان کو عالم یا شیخ نہ سمجھتا تھا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ رات کے وقت دیوبند سے نانوتہ جا رہے تھے۔ ایک جگہ پہونچکر راستہ بھول گئے۔ کیونکہ رات کچھ باقی تھی تو آپ نے ایک شخص سے پوچھا کہ بھائی نانوتہ کا راستہ کدھر کو ہے اس نے کہا ارے تو کون ہے جو صبح ہی صبح نانوتہ کا نام لیتا ہے (مشہور ہے کہ صبح کو نانوتہ کا نام لینے سے دن بھر کھانا نہیں ملتا) فرمایا بھائی پھر کیا کہوں کہا پھوٹا شہر کہہ۔ آپ نے فرمایا اچھا بھائی پھوٹے شہر کا راستہ کس طرف کو ہے۔ اس نے بتلایا۔ کچھ دور چل کر پھر راستہ بھول گئے تو ایک شخص اور ملا اس سے پوچھا بھائی پھوٹے شہر کا راستہ کدھر کو ہے وہ کوئی نانوتہ کا رہنے والا تھا اس نے کہا ارے تو کون ہے جو ہمارے شہر کو پھوٹا شہر کہتا ہے۔ فرمایا پھر کیا کہوں نانوتہ کیوں نہیں کہتا فرمایا اچھا بھائی نانوتہ کا راستہ بتلادے کہا یہ سامنے نانوتہ ہی تو ہے اس وقت مولانا نانوتہ میں پہونچ گئے تھے۔ مگر اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہ ہوا کہ میں گھر کے قریب آگیا ہوں غرض راستہ میں جو بھی ملتا اور مولانا اس سے راستہ پوچھتے وہ برا بھلا ہی کہتا تھا۔ اور مولانا سب کی سنتے جا رہے تھے کسی کی بات کا برا نہ مانا۔ نہ کسی سے اپنا نام ظاہر کیا ورنہ اگر نام ظاہر کر دیتے تو ان اطراف کے سب لوگ آپ کو جانتے تھے نام سن کر وہ لوگ پیروں میں گر پڑتے مگر ان کو تو اس میں ہی مزا آتا تھا کہ یہ نفس ذلیل ہو۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آگئی طلبہ سب کتابیں لے لیکر اندر چلے گئے پھر سب اپنے جوتے اٹھانے آئے تو دیکھا کہ مولانا نے ایک چادرہ میں سب کے جوتوں کو جمع کر رکھا ہے اور اٹھانا

چاہ رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر لوگوں کو وجد آنے لگا اور دیر تک قلوب پر اس کا اثر رہا بھلا آج تو کوئی ایسا کر کے دکھا دے کہ اپنے شاگردوں کے جوتے سمیٹنے لگے صاحبو حکایتیں بیان کر دینا اور بات ہے مگر کر کے دکھلانا اور بات ہے۔ مولانا کو لوگ خشک کہتے تھے یعنی متشدد کہتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی کی تربیت کرتے ہوئے مولانا کو دیکھا ہوگا اس وقت مولانا سیاست و تنبیہ فرما رہے ہوں گے وہ احمق سمجھا کہ بس یہ رات دن اسی حالت میں رہتے ہیں جیسے کوئی شخص کسی رحمدل جج کو خون کا مقدمہ فیصل کرتے ہوئے دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ جج تو بڑا خونی ہے ارے ظالم جج تو خونی نہیں بڑا مہربان ہے مگر افسوس تو اس کے پاس ایسے وقت گیا جب وہ ایک ڈاکو کے لئے سزائے موت تجویز کر رہا تھا اگر تو اس کے بنگلہ پر جا کر ملتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کیسا مہربان ہے ایسے ہی سیاست و تربیت کے وقت کسی بزرگ کو سختی کرتے ہوئے دیکھ کر سخت مزاج سمجھ لینا بڑی حماقت ہے۔

اصلاح و تربیت میں تو ضرورت کی وجہ سے یہ حضرات سختی برتتے ہیں باقی فی نفسہ سخت مزاج نہیں ہوتے تمھیں فارغ اوقات میں ان حضرات سے ملنا چاہیئے جب حقیقت معلوم ہوگی کہ تم خشک ہو یا وہ خشک ہیں۔ ایک سخی کی عادت تھی کہ جب اس کے یہاں کوئی مہمان آتا تو بڑی خاطر مدارات کرتا تھا مگر رخصت کے وقت یہ کہہ دیتا تھا کہ مہربانی کر کے دوبارہ آپ یہاں نہ آئیں۔ لوگ اسے بدنام کرتے تھے کہ یہ بڑا ہی بخیل اور تنگ حوصلہ ہے جو مہمانوں سے یوں کہتا ہے پھر یہاں نہ آنا۔ ایک عاقل نے بھی یہ بات سنی اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص تو بڑا سخی اور عالی حوصلہ ہے آخر یہ بات کیا ہے اس کی تفتیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ خود اس سخی کا مہمان بنا اس نے خوب خاطر کی اس کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کئے اس نے بھی کچھ تکلف نہ کیا اور اس کی ہر خدمت کو گوارا کرتا رہا کسی بات میں مزاحمت نہ کی کہ تم یہ کام کیوں کرتے ہو میں خود کر لوں گا جب چلنے لگا تو سخی نے کہا میری یہ درخواست ہے کہ آپ پھر بھی یہاں تشریف لائیں۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ میرے ساتھ اس نے وہ معاملہ نہیں کیا جو لوگوں میں مشہور ہے آخر اس سے ہی پوچھا کہ آپ کی نسبت جو یہ بات مشہور ہے کہ آپ مہمان سے چلتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ یہاں پھر نہ آنا۔

اس کی کیا اصل ہے میں اسی کی تحقیق کے لئے آیا تھا مگر میرے ساتھ آپ نے برعکس معاملہ کیا کہا وہ بات غلط نہیں بالکل صحیح ہے واقعی میں ایسا کہتا ہوں مگر اس کا راز یہ ہے کہ جو کوئی میرے یہاں مہمان بن کر آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی خدمت کروں اسے راحت پہونچاؤں مگر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جب میں کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اس سے روکتے ہیں کہ آپ تکلیف نہ کریں ہم خود یہ کام کرلیں گے مجھے اس تکلف سے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگ ایک تو مجھے خدمت سے محروم کرتے ہیں۔ دوسرے خود بھی تکلیف اٹھاتے ہیں کیونکہ بعضے کام صاحب خانہ جس سہولت اور عمدگی سے کرسکتا ہوں اجنبی اس طرح نہیں کرسکتا اور مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مہمان میری نظر کے سامنے تکلیف اٹھائے اور میں اس کو راحت نہ دے سکوں اس لئے میں کہدیتا ہوں کہ آپ پھر یہاں نہ آئیں اور تم نے کسی بات میں تکلف نہیں کیا جس طرح میرا دل راحت پہونچانے کو چاہتا تھا تم نے مجھے ویسے ہی کرنے دیا کسی بات سے نہیں روکا اس سے میرا دل بہت خوش ہوا اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم پھر آؤ۔ دیکھئے اس غریب کے متعلق شہرت کیا تھی۔ اور حقیقت کیا نکلی تفتیش سے معلوم ہوا کہ اس کا وہ بات لوگوں سے کہنا بھی غایت کرم پر مبنی تھا وہ مہمانوں کو راحت پہنچانا چاہتا تھا اور مہمان اس کی راحت رسانی سے روکتے تھے۔ یہی حال مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کا تھا کہ لوگ بیڈھنگا پن خود کرتے تھے اس سے مولانا کو تکلیف ہوتی تھی ورنہ اگر کوئی ڈھنگ سے مہمان ہوتا تو مولانا سے زیادہ خوش اخلاق کوئی نظر نہ آتا۔ یہ قاعدہ یاد رکھو کہ مہمان کو میزبان کے کام میں دخل نہ دینا چاہیئے مصالح کی رعایت وہی خوب کرسکتا ہے مہمان کو ان مصالح کی اطلاع نہیں ہوسکتی۔

حضرت مولانا کے یہاں ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ایسے وقت آئے کہ مولانا اس وقت درس حدیث میں مشغول تھے مولانا معمولی طور پر مزاج پرسی کر کے درس میں مشغول ہوگئے اور یہ بھی غایت کرم تھا کہ مولانا نے ان سے دو چار باتیں کرلیں۔ ورنہ حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جس قدر عظمت مولانا کے قلب میں تھی اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس وقت کسی سے ایک بات بھی نہ کرتے۔ صاحبو! اگر کوئی شخص اپنے محبوب کا خط پڑھتا ہو تو

کیا اس وقت وہ کسی سے بات کرتا گوارا کرسکتا ہے اس کو عشاق اپنے دل میں خود غور کرلیں لیکن مولانا نے تطییب قلب مسلم کے لحاظ سے اس وقت اپنی طبیعت پر جبر کرکے ان سے کچھ باتیں کیں، پھر حدیث میں مشغول ہوگئے اس کی ان ڈپٹی صاحب نے یہ قدر کی کہ مولانا سے بدظن ہو گئے کہ یہ تو بہت روکھے ہیں کہ دو چار باتیں کرکے پھر التفات بھی نہ کیا غرض ان کو یہ طرز ناگوار ہوا۔ پھر اس کی انھوں نے اس طرح کسر نکالی کہ مولانا کو گورنمنٹ کی طرف سے کوئی خطاب دیا جانا تجویز ہوا تھا ڈپٹی صاحب سے بھی رائے لی گئی۔ انھوں نے اس کو روک دیا اور بڑے فخر سے اپنی کارروائی کو ظاہر کیا کہ مولانا نے ہم سے بے رخی کی تھی تو ہم نے بھی ان کو خطاب سے محروم کر دیا مولانا کو یہ خبر پہونچی تو بہت ہنسے، فرمایا کہ میں تو ان کی اس کارروائی سے ممنون ہوا کہ مجھے ایک بلا سے بچا دیا اگر میں خطاب لے لیتا تو درباروں میں جانا پڑتا۔ اگر نہ لیتا اور واپس کرتا تو اس میں حکومت کی توہین تھی تو میں تو خطاب کے پہونچنے سے ایک پریشانی میں مبتلا ہو جاتا کہ کیا کروں خدا ان کا بھلا کرے کہ انھوں نے خطاب کو مجھ تک آتے ہی نہ دیا بالا بالا ہی واپس کر دیا۔ ہمارے حضرات اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کے مقرب بنیں اور درباروں میں شریک ہوتے پھریں اور اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کی توہین کریں۔ حکام کو برا بھلا کہیں۔ یہ تو آجکل ہی نیا دستور نکلا ہے کہ حکام کو بندر اور سور کہا جاتا ہے چاہے وقت پر کچھ بھی نہ ہو سکے صرف زبان ہی بہادر ہے موقعہ پر یہ لوگ جو حکومت سے مقابلہ کرتے ہیں خود ہی بندروں کی طرح بھاگتے نظر آتے ہیں۔ پھر نہ معلوم یہ کونسی تہذیب ہے کہ حکام کو گالیاں دی جائیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ بہادر آدمی اپنے مقابل کو گالیاں نہیں دیا کرتا بلکہ قوت سے جواب دیا کرتا ہے۔ یہ طریقہ کمزوروں کا ہے کہ مقابل کو گالیاں دیکر اپنی زبان گندی کرتے ہیں۔ یاد رکھو اسلام نے یہ طریقہ ہم کو نہیں سکھایا۔ اسلام نے ہم کو تہذیب سکھلائی ہے اور یہ طریقہ جو آجکل اختیار کیا گیا ہے تہذیب اسلامی کے بالکل خلاف ہے چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ حکومت کے خطاب کو واپس کرکے اس کی توہین کی جائے۔ غرض ایسے ایسے مخلص ہوں تو وہ شہرت سے

بھاگیں ورنہ ہم تو اکثر شہرت کے طالب ہیں۔ امام شعرانی نے اخلاص کی ایک علامت بیان فرمائی ہے۔ واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اے عزیز اخلاص کی علامت یہ ہے کہ جو کام دین کا تو کر رہا ہے اگر تیری بستی میں اس کا کام کرنے والا کوئی دوسرا آجائے تو اس سے خوش ہو اور خدا کا شکر بجا لادے کہ اس نے ایک آدمی تیرا بوجھ ہلکا کرنے کو بھیجدیا اور اس کے آنے کے بعد تو اپنے شاگردوں اور مریدوں سے کہدے کہ اس سے جاکر مستفید ہوں اس سے فیض حاصل کریں۔ پھر تو اپنا کام اس کے حوالہ کرکے اطمینان سے خدا کی یاد میں مشغول ہو (بشرطیکہ وہ دوسرا شخص صاحب کمال اور قابل اطمینان ہو۔ اور اگر ناقص وغیر قابلِ اطمینان ہو تو ایسا نہ کرنا چاہیئے مگر اس کے ساتھ عداوت وحسد بھی نہ کرنا چاہیئے ۱۲ جامع) بتلایئے ہمارے اندر ایسے کتنے افراد ہیں ہماری حالت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے سے جلتے ہیں اگر بستی میں کوئی واعظ ہے تو وہ دوسرے واعظ کے آنے سے جلتا ہے۔ کوئی شیخ ہے تو دوسرے شیخ سے جلتا ہے اگر کسی جگہ ایک مدرسہ ہے اور وہاں دوسرا مدرسہ قائم ہونے لگے تو پہلے مدرسہ والوں کو دوسرے سے حسد وعداوت ہو جاتی ہے پھر اس حالت کے ساتھ اخلاص کہاں۔ بس ہم لوگ اسی وقت تک مخلص ہیں جب تک بستی میں اکیلے ہیں ہمارے اخلاص کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب کوئی دوسرا کام کرنے والا ہمارے جیسا بستی میں آجاتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ مولویوں نے شہرت اور اظہار شان وشوکت کے لئے یہ سالانہ جلسے نکالے ہیں جیسے اہل دولت نے مولد شریف اور محرم وشب برات کی رسمیں نکالی تھیں۔ الغرض یہ سب حوصلے نکالنے کی باتیں ہیں۔ دیکھئے جو امور بدعت ہیں وہ چند روز میں اپنی حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ مولد شریف اول تو محض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوا تھا پھر قیام کی قید بڑھی پھر اس میں تعیین تاریخ وماہ کا اضافہ ہوا پھر مٹھائی تقسیم ہونے کی شاخ بڑھی۔ پھر گانے والے خوش الحان تجویز ہوئے جن میں اکثر امارد ہوتے ہیں اور بعض جگہ مرد وعورتیں سب شریک ہوتی ہیں اب وہ مولود کیا ہوا اچھی خاصی بیاہ شادی کی تقریب ہوگئی جس میں اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ بعض دفعہ

اس اہتمام میں نماز بھی قضا ہوجاتی ہے اور جماعت تو بہتوں کی فوت ہوجاتی ہے اور جو امور شرعیہ اصلیہ ہیں ان میں حدود سے کبھی زیادتی نہیں ہوتی دیکھئے نماز روزہ تلاوت قرآن تہجد اور اشراق یہ دین کے اصلی کام ہیں۔ ان میں کبھی زیادتی نہیں ہوتی جس حالت پر تھے اب تک اسی حالت پر چلے آرہے ہیں نیز امور بدعت کی یہ بھی علامت ہے کہ سخت پریشانی کے وقت میں حذف ہوجاتے ہیں اور جو دین کے اصلی کام ہیں وہ حذف نہیں ہوتے چنانچہ طاعون وہیضہ کے زمانہ میں تیجہ و دسواں و چالیسواں سب حذف ہوجاتا ہے اور نماز جنازہ و کفن دفن حذف نہیں ہوتا اگر کسی سال ربیع الاول میں طاعون و ہیضہ کا زور ہوجائے تو مجالس مولود بھی حذف ہوجائیں گی اور جو ہونگی بھی تو محض ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا۔ مٹھائی اور حلوا اور گانا بجانا تو ضرور حذف ہوجائے گا کیونکہ یہ سب فرصت کی باتیں ہیں یہی دلیل ہے ان کے زائد اور فضول ہونے کی خیر یہ تو لطیفہ تھا میں دلائل سے بیان کرچکا ہوں کہ دلائل شرعیہ سے اظہار غم ممنوع ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے غم کو ترقی ہوتی ہے اور ترقی غم سے اعمال شرعیہ اور معمولات راتبہ میں خلل پڑجاتا ہے اور اس کا ضرر بہت سخت ہے جس کو میں پہلے بتلاچکا ہوں حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان غم سے پریشان نہ ہوں چنانچہ اسی لئے پیشگی اطلاع فرمادی کہ ہم تم کو طرح طرح کی تکالیف سے آزمائیں گے تاکہ دفعۃً کلفت آنے سے پریشانی نہ ہو پہلے سے اس کے لئے آمادہ رہیں پھر چونکہ لَنَبْلُوَنَّكُمْ (ہم تمہارا ضرور امتحان لیں گے) سے معلوم ہوگیا کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (آپ صابرین کو بشارت دیدیجئے) اس جملہ سے معلوم ہوگیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابرین ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دیجایا کرتی ہے جو امتحان میں پاس ہوں اور اس سے بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بے صبری فیل ہونے کا سبب ہے پھر اس جگہ بَشِّرْ میں بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ تو صابرین کو بشارت دیدیجئے تفصیل نہیں کی کہ کس چیز کی بشارت دے دیجئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوش خبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل کردی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا ان ہی میں بشارت کا حصر ہوجائیگا اور جب اجمالاً کہدیا گیا کہ صابرین کو خوشی ہونے کی خبر دیدیجئے تو اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے جس سے تمام خوش ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہوگیا کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گی اور یہ کام حق تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کی خواہش کو پورا کردیں ورنہ انسان کو تو ایک بچہ ہرا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس قصبہ میں ایک بچہ نے اپنے والدین کو ہرا دیا تھا اس نے رونا شروع کیا اور ضد کرنے لگا کہ میں تو فلاں چیز لوں گا والدین نے اس کا انتظام کردیا۔ پھر ضد کرنے لگا کہ میں تو وہ چیز کھاؤں گا وہ بھی لاکر رکھدی۔ پھر ضد کرنے لگا اور کوئی چیز مانگی وہ بھی لاکر دیدی جب ساری ضدیں پوری ہوگئیں تو کہنے لگا ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپاؤ۔ بس یہاں والدین عاجز ہوگئے اور دو چار طمانچے مار کر اسے خاموش کیا۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔

ایک دفعہ اکبر نے بیربل سے کہا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹیں بہت سخت ہیں جن کا پورا کرنا مشکل ہے۔ راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ۔ تو ان میں بادشاہ اور عورت کی ضد کا دشوار ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ دونوں عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کسی وقت سوچ کر ایسی دشوار بات کہیں جو کسی سے پوری نہ ہوسکے مگر بچہ کی ہٹ کا پورا کرنا کیا مشکل ہے اس میں اتنی سمجھ کہاں جو سوچ سوچ کر دشوار باتیں نکالے اور دوسروں کو عاجز کردے۔ بیربل نے کہا حضور سب سے زیادہ مشکل بالک ہٹ ہی ہے جس کے پورا کرنے کے لئے بڑی عقل درکار ہے۔ اکبر نے کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا' اس کا امتحان ہونا چاہیئے۔ بیربل نے کہا حضور پھر میں بچہ بنتا ہوں آپ میری ضدیں پوری کیجئے۔ کہا اچھا۔ چنانچہ

بیربل بچوں کی طرح رونے لگا۔ اکبر نے پوچھا کیوں روتا ہے کہا ہم تو کلھیا لیں گے اکبر نے فوراً ایک کلھیا منگا دی۔ وہ پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اکبر نے فیل خانہ سے ایک ہاتھی منگا دیا۔ وہ پھر رونے لگا کہا اب کیوں روتا ہے کہا اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھدو بس اکبر عاجز ہوگیا اور کہا اچھا اب ہم بچے بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو اس نے کہا بہت اچھا۔ اکبر کو اور کچھ تو سبق آتا نہ تھا۔ بیربل ہی کا پڑھایا ہوا سبق دہرادیا کہ ہم تو کلھیا لیں گے اس نے کلھیا منگادی پھر کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اس نے بازار سے مٹی کا ایک ذرا سا ہاتھی منگادیا پھر کہا اس کو کلھیا میں رکھدو اس نے اٹھا کر رکھدیا۔ بس خاموش ہوگئے۔ بیربل نے کہا حضور آپ نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی فرمایش پر اتنا بڑا ہاتھی منگایا آپ کو ہاتھی بھی بچے کے مناسب منگانا چاہیئے تھا میں کہتا ہوں کہ اکبر نے بیربل ہی کا سبق دہرادیا تھا اس لئے بیربل نے اسے جلدی ہی پورا کردیا اگر وہ تھانہ بھون کے اس بچہ سے سبق لیتا تو بیربل کے باپ سے بھی یہ ضد پوری نہ ہوتی کہ ہائے چاند کیوں نکل رہا ہے اسے چھپاؤ۔ غرض بَشِّرْ کا عموم قدرت کے عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اس میں بجائے نُبَشِّرُ (ہم بشارت دیتے ہیں) صیغہ متکلم کے بشر صیغہ امر اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ بشارت بواسطہ زیادہ موثر ہوتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ہم سے خود تکلم فرماتے تو غلبہ جلال و ہیبت ایسا ہوتا کہ اس غلبہ کے سامنے لذت بشارت حاصل نہ ہوتی۔ اور جنت میں ہمارے قوی بڑھ جائیں گے وہاں ہم کو اس ہیبت و جلال کا تحمل ہوجائےگا تو تکلم بلاواسطہ مفید ہوگا۔ باقی دنیا میں تکلم بلا حجاب کا ہم کو تو کیا تحمل ہوتا حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو بھی تحمل نہ ہوا ان سے بھی حجاب کے ساتھ کلام ہوا ہے اور ایک دفعہ بے حجاب ہونے کی تمنا کی تھی تو دیکھنے سے پہلے ہی غلبہ انوار سے بے ہوش ہوگئے۔ بعض لوگ تَجَلّٰی رَبُّہٗ (تجلی ڈالی ان کے پروردگار نے) سے وقوع رویت سمجھ گئے ہیں یہ غلط ہے اور دھوکا اس سے ہوا کہ اردو میں تجلّی کے معنے رویت مشہور ہوگئے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں تجلی کے معنے ظہور ہیں اور یہ فعل حق تعالیٰ کا ہے رویت موسیٰ علیہ السلام کا فعل ہے تو حق تعالےٰ

کا فعل تو واقع ہوا کہ وہ ظاہر ہوئے لیکن اس سے موسےٰ علیہ السلام کے فعل رویت
کا وقوع کیونکر لازم آیا قرآن میں جو ان کا فعل مذکور ہے وہ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا
(موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے) ہے رویت کا کہیں ذکر نہیں بلکہ اس
سے پہلے لَنْ تَرٰىنِیْ (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتا) مذکور ہے جو نفی موبد کو مفید
ہے اور قابل نسخ نہیں (کیونکہ نفی موبد میں نسخ نہیں ہوا کرتا كَمَا ثَبَتَ فِی الْاُصُوْلِ
جیسا کہ اصول میں ثابت ہے) لیکن یہ تابید محض دنیا کے اعتبار سے ہے کیونکہ آخرت
میں وقوع رویت ہوگا ۱۲ جامع) بعض لوگوں کو اس سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ آیت میں
تجلی کا ذکر پہلے اور خرور وصعق کا ذکر بعد میں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خرور کا سبب
تجلی تھی تو شبہ ہوتا ہے کہ تجلی مقدم اور خرور مؤخر تھا تو لازم آیا کہ موسیٰ علیہ السلام
تجلی کے بعد بے ہوش ہوئے تجلی کے ساتھ بے ہوش نہیں ہوئے تو رویت پائی گئی
اس کا جواب یہ ہے کہ تجلی وخرور میں تقدم وتاخر ذاتی تھا اور زماناً مقارنت تھی تقدم
وتاخر ذاتی کے لئے زماناً تقدم وتاخر لازم نہیں جیسا کہ اہلِ علم اس کو جانتے ہیں۔
پس تجلی کے سبب خرور ہونے سے دونوں کے مقارنت فی الزمان کی نفی نہیں ہوتی
خوب سمجھ لو بہرحال دنیا میں انبیاء علیہم السلام کو بھی بلا حجاب کے کلام الٰہی کا تحمل
نہیں ہوا۔ تو ہم کیا تحمل کر سکتے ہیں۔ مگر حجابات انبیاءؑ و حجابات غیر انبیاءؑ میں
فرق ضرور ہے۔ ان کے لئے کم حجاب ہیں کیونکہ ان میں دوسروں سے زیادہ تحمل ہے
اور ہمارے لئے زیادہ حجابات ہیں کیونکہ ہمارے اندر تحمل کم ہے اس لئے بشارت
بواسطہ کو اختیار فرمایا کیونکہ ہم لذت بشارت کو اس صورت سے ادراک کر سکتے
ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ مقرر کر کے بھی صیغہ بَشِّرْ اختیار فرمایا یہ نہیں کہا
وَقُلْ لَهُمْ اَنَا نُبَشِّرُهُمْ (اور ان سے کہہ دیجئے کہ ہم ان کو بشارت دیتے ہیں)
یعنی واسطہ کے بعد بھی صیغہ تکلم نہیں فرمایا تاکہ لوگ بے فکری سے سن لیں کیونکہ قاعدہ
ہے کہ اگر بادشاہ پس پردہ ہو اور تکلم اپنی زبان پر کر رہا ہو کہ جہاں پناہ یوں فرماتے
ہیں جب بھی جلال کا غلبہ ہوتا ہے گو اس قدر نہ ہو جتنا تکلم بلا حجاب میں ہوتا اور اگر وہ

پس پردہ بیٹھ کر وزیر سے یوں کہے کہ تم ان لوگوں سے یوں کہدو تو اس صورت میں جلال کم ہوجاتا ہے گو اس وقت بھی وزیر کا کلام بادشاہ ہی کا کلام ہوگا مگر چونکہ وہ اپنی زبان پر تکلم کر رہا ہے بادشاہ کی زبان پر تکلم نہیں کر رہا اس لئے جلال کا اثر کم ہوجاتا ہے اسی طرح یہاں حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ رکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کون جن کی شان یہ ہے رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کہ آپ ہمارے ہی میں سے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں کوئی اجنبی اور غیر شخص نہیں اور اپنے ہم جنس وہم قوم سے انس بھی زیادہ ہوتا ہے فیض بھی زیادہ ہوتا ہے اس کو بھی ہمارے حال پر زیادہ شفقت ہوتی ہے تو ان وسائط کا اثر ایسا ہے جیسے گرمی کی لو خس کی ٹٹی کے اندر ٹھنڈی ہوکر آیا کرتی ہے کہ یہ حجابات خس کی ٹٹی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ حالت ہوجائے جو حدیث میں وارد ہے لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَا انْتَهٰى اِلَيْهِ بَصَرُهٗ (البتہ جل جاتے ہیں تمام پردے جہاں تک اس کی نظر پہونچتی ہے) غرض جملہ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (صابرین کو آپ بشارت دیجئے) میں یہ بھی بتلادیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے کون ہیں اور یہ بھی بتلادیا کہ پاس ہونیکا طریقہ کیا ہے پھر ساتھ ساتھ ان کو انعام ملنے کی بشارت بھی دیدی اور عموم بشارت سے انعام وجزا کی عظمت اور اپنے عموم قدرت کو بھی واضح کردیا پھر صیغہ امر اختیار کرکے بشارت بواسطہ کا زیادہ مفید ومؤثر ہونا بھی بتلادیا (پھر چونکہ عادت یہ ہے کہ کسی علم وفن میں امتحان دینے والی جماعت کو اسی شخص کے ہاتھ سے انعام دلواتے ہیں جو اس فن میں کامل وممتاز ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابرین کے لئے واسطہ بشارت بناکر یہ بھی ظاہر کردیا گیا کہ آپ اکمل الصابرین ہیں اور تحمل مصائب میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں كَمَا وَرَدَ فِي الْحَدِيْثِ اُوْذِيْتُ فِي اللّٰهِ مَالَمْ يُؤْذَ اَحَدٌ ۱۲ جامع) (مجھ کو اتنی ایذا پہونچائی گئی ہے کہ کسی کو اتنی اذیت نہیں پہونچائی گئی) قرآن کے ایک ایک لفظ میں اتنی دلالتیں اور اس قدر رعایتیں اعجاز قرآن کی دلائل ہیں آگے فرماتے ہیں اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

(وہ ایسے لوگ ہیں جب ان پر کوئی مصیبت
پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی مملوک ہیں
اور ہم اسی کے پاس جانے والے ہیں)

یہ جملہ یا تو صفت مادحہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ بشارت جن صابرین کے لئے ہے ان کی یہ خاص مدح ہے یا صفت مقیدہ ہے کہ صابرین میں جن کی یہ شان ہے صرف انہی کے لئے بشارت ہے۔ بہرحال اس سے ہر مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چراغ گل ہوجانے پر بھی اِنَّا لِلّٰہ پڑھا کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ روشنی نعمت ہے واقعی رات کو اندھیرے مکان میں جب چراغ روشن کیا جاتا ہے تو جان میں جان آتی ہے اندھیرے گھر سے وحشت سی معلوم ہوتی ہے اس لئے آپ نے چراغ گل ہونے پر اِنَّا لِلّٰہ پڑھ کر روشنی کا نعمت عظمیٰ ہونا اور اندھیرے کا مصیبت ہونا ظاہر کر دیا۔ مگر آجکل اِنَّا لِلّٰہ بہت بدنام ہوگیا ہے۔ لوگوں نے اس کو مردوں کے لئے خاص کر لیا ہے۔ گنگوہ میں ایک لڑکا ہر بات پر اِنَّا لِلّٰہ پڑھا کرتا تھا تو ایک بڑھیا نے کہا بچے خدا سے خیر مانگ تو ہر بات پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ کے کس کو مارے گا۔ شاید بڑھیا کو اپنی ہی فکر ہوئی ہوگی کہ بس سب سے زیادہ میری عمر ہے کہیں اِنَّا لِلّٰہِ سن کر ملک الموت گھر میں نہ آگھسیں اور مجھے سب سے زیادہ عمر والی دیکھ کر اپنے ساتھ لیجائیں اسی طرح لاحول بھی بہت بدنام ہے۔ کانپور کا ایک قصہ ہے کسی نے دوسرے کو دور سے دیکھ کر سمجھا کہ یہ فلاں شخص ہے پاس پہونچا تو اور تھا اس نے اپنی غلطی پر لاحول پڑھ دی۔ وہ دوسرا شخص اس کے سر ہوگیا کہ تم نے مجھکو شیطان کہا وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ میں نے تم پر لاحول نہیں پڑھی اپنی غلطی پر پڑھی ہے مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ بہت مشکل سے اس نے پیچھا چھڑایا۔ سورۂ یٰسین بھی بہت بدنام ہے اس کو بھی لوگوں نے مردوں کے لئے خاص کر لیا ہے حالانکہ حدیث شریف میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے۔ اس سورت کے دم کرنے سے بڑے مہلک امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے مگر میں جب کسی مریض پر یہ سورت دم کرتا ہوں تو آہستہ پڑھتا ہوں کہیں زور سے پڑھنے میں وہ بیمار یا اس کے گھر والے یہ نہ کہیں کہ مارنے کو آیا تھا۔

دہلی میں ایک دفعہ مومن خاں شاعر تراویح میں قرآن سنتے تھے ایک ڈوم بھی

ان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا وہ مومن خاں سے چند روز کے بعد کہنے لگا کہ خانصاحب جب وہ سورت آوے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھ سے ایک دن پہلے کہدینا تاکہ میں اس دن نہ آؤں اس کے سننے سے آدمی مرجاتا ہے مومن خاں نے وعدہ کرلیا چندروز کے بعد اس نے یہ بات پھر یاد دلائی تو مومن خاں نے مذاق میں کہدیا کہ وہ سورت تو پڑھی بھی گئی مجھ کو کہنا یاد نہیں رہا۔ بس وہ ڈوم یہ سن کر سہم ہی تو گیا کہ ہائے وہ سورت پڑھی گئی اور وہم کی وجہ سے اس کی روح تحلیل ہوگئی اور دو تین دن میں مرگیا۔ یہ محض اس کے وہم کا اثر تھا اس سورت کا اثر نہ تھا۔ ورنہ آجکل لوگ کیوں نہیں مرجاتے ایک شخص نے کسی گاؤں میں جاکر حافظ ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ پورا حافظ نہ تھا کہیں کہیں سے کچھ سورتیں یاد تھیں۔ رمضان میں آپنے قرآن سنایا اور جتنا یاد تھا وہ چند روز میں سناکر کہدیا کہ قرآن ختم ہوگیا مٹھائی بانٹو۔ اور مجھے نذرانہ دو۔ گاؤں والے اس کے جھوٹ یا سچ کو کیا سمجھتے مگر ایک شخص کو ان میں سورۂ یٰسین یاد تھی اس نے کہا حافظ جی آپنے یہ کیسا ختم کیا سورۂ یٰسین تو پڑھی ہی نہیں تو وہ کیا کہتا ہے کہ بے وقوف تو زندوں پر یٰسین پڑھوانا چاہتا ہے، ابے وہ تو مُردوں پہ پڑھی جاتی ہے اگر میں تراویح میں اسے پڑھ لیتا تو تم سب مرجاتے۔ گاؤں والے بہکانے میں آگئے اور الٹا معترض ہی کو دھمکانے لگے کہ تو ہمیں مارنا چاہتا ہے جو زندوں پر یٰسین پڑھواتا ہے۔ اسی جہالت کا یہ اثر ہے کہ لوگ سوائے مواقع موت کے اور کسی جگہ اِنَّا لِلّٰہ پڑھنے سے رکتے ہیں حالانکہ (حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان پر کوئی مصیبت آوے وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھے تو حق تعالےٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناتے ہیں اور جب کبھی اس مصیبت کو یاد کرکے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھے گا تو وہی ثواب ملے گا جو صدمہ اولیٰ کے وقت ملا تھا ۱۲ جامع) میں بتلا چکا ہوں کہ اِنَّا لِلّٰہ کا مضمون ایسا ہے کہ اس کو مستحضر رکھنا غم کو بہت ہلکا کردیتا ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے افسوس لوگوں نے مرہم کو نشتر سمجھ لیا ہے یہ محض جہالت ہے اس خیال کو دل سے نکال کر مصیبت کے موقعہ میں اِنَّا لِلّٰہ پڑھنا چاہیئے اور اس کے مضمون میں غور کرنا چاہیئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

غم پاس کو بھی نہ رہے گا اور ہلکا تو ضرور ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ نے یہ دوسرا سامان کیا ہے تخفیف حزن کا کہ رنج و غم کے موقعہ کے لئے ایسا مراقبہ ہم کو تعلیم کیا ہے جو غم کو ہلکا کرتا ہے تاکہ صبر آسان ہو جائے اور ہم مصیبت کے وقت صابرین میں داخل ہو کر امتحان میں پاس ہو جائیں اور صابرین کے لئے جس انعام کی بشارت ہے اس کے مستحق ہو جائیں۔

اب صبر کی حقیقت سنئے تاکہ وہ غلطی رفع ہو جائے جس میں عام طور پر لوگ مبتلا ہیں کیونکہ تمہید میں معلوم ہو چکا ہے کہ لوگ صرف جزع فزع نہ کرنے کو صبر سمجھتے ہیں اور مداومت اعمال کو صبر میں داخل نہیں سمجھتے ان کے نزدیک بے صبری فقط جزع و فزع کا نام ہے۔ حالانکہ مصیبت کے وقت اعمال میں کوتاہی اور کمی کر دینا بھی بے صبری میں داخل ہے اور اس کا انجام جزع و فزع سے بھی اشد ہے اس کے لئے اول صبر کے معنے سمجھنے چاہئیں تو صبر کہتے ہیں لغت میں حبس کو یعنی رکنے کو اور اصطلاح شرع میں صبر کے معنے حبس النفس ہیں یعنی نفس کو روکنا۔ عربی میں صبر کا استعمال مختلف صلات سے ہوتا ہے اور صلات سے لفظ کے اصل معنی کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایک لفظ کا استعمال مختلف صلات سے ہوتا ہے تو لوگوں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا اصلی صلہ کونسا ہے اور عارضی صلہ کونسا ہے اسی لئے حقیقت میں خلط واقع ہو جاتا ہے لفظ صبر کی حقیقت بھی بعض لوگوں پر اسی لئے مخفی ہو گئی کہ وہ اس کا استعمال مختلف صلات سے دیکھتے ہیں چنانچہ کبھی لازم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے جیسے[1] ایک شاعر کا قول ہے اِصْبِرْ لِكُلِّ مُصِيبَةٍ وَتَجَلَّدِ (صبر کر ہر مصیبت پر اور جما رہے) کہیں صلہ فی سے آتا ہے جیسے وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی اور بیماری میں، کہیں عن سے آتا ہے جیسے حدیث شریف میں ایک منافق کا قول آتا ہے

---

[1] اس تقریر سے حکیم الامۃ دام مجدکم کا تبحر عربیت میں اور وسعت نظر طرق کلام میں اور مذاق صحیح فہم حقائق الفاظ میں بخوبی واضح ہے میں نے بہت غور کیا کہ صبر کا کوئی صلہ ان صلات مذکورہ کے سوا اور بھی ہے مگر نہیں ملا ۱۲ جامع۔

جو غزوہ تبوک میں اس نے کہا تھا اِنِّیْ امْرَأٌ لَا اَصْبِرُ عَنِ النِّسَاءِ (میں ایسا آدمی کہ عورتوں سے صبر نہیں کرسکتا) کہیں علیٰ سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ (اور تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر) کہیں باء سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے) کہیں مع سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو اپنے رب کی عبادت صبح و شام کرتے ہیں) یہ تو وہ حروف ہیں جو بطور صلہ کے لفظ صبر کے ساتھ مستعمل ہوتے ہیں اور بعض حروف ایسے بھی ہیں جو اس کے ساتھ مستعمل ہیں مگر ان کو صلہ صبر نہیں کہا جا سکتا جیسے وَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (تو آپ صبر کیجئے جیسا اور ہمت والے رسولوں نے صبر کیا ہے) اور وَاصْبِرْ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (اور صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجدیں) کیونکہ کاف اور حتیٰ ہر فعل کے بعد مستعمل ہو سکتے ہیں جن سے مقصود تشبیہ اور بیان غایت ہوتا ہے اور تشبیہ اور غایت ہر فعل کیلئے ہو سکتی ہے اس لئے ان کا استعمال بطور صلہ کے نہیں بلکہ صلات وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی صلہ عن و علیٰ ہیں باقی صلات باعتبار خصوصیات مقام کے ظروف ہیں اور وجہ عن و علیٰ میں حصر کی یہ ہے کہ صبر کا مدخول یا مامور بہ ہے یا منہی عنہ ہے کیونکہ صبر کے معنی حبس کے ہیں بس کبھی کسی بات کے اوپر حبس ہوتا ہے کبھی کسی بات سے حبس ہوتا ہے جس بات کے اوپر روکا جائے وہ مامور بہ ہے اور جس بات سے روکا جائے وہ منہی عنہ ہے حبس کے یہی دو محل اصلی ہیں اس کے سوا اور کوئی حالت اصلی نہیں بس جہاں صبر کا استعمال بدون علیٰ و عن کے معلوم ہوتا ہے وہاں یہ اصلی صلہ مقدر ہوگا مثلاً وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ (وہ لوگ مستقل رہنے والے ہیں تنگدستی میں اور بیماری میں) کی اصلی تقدیر یہ ہے۔ اَلصَّابِرِيْنَ عَلٰى اَحْكَامِ اللّٰهِ وَالْمُحْتَرِزِيْنَ عَنْ مَعَاصِيَتِهٖ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ (اللہ تعالیٰ کے احکام پر مستقل رہنے والے ہیں اور گناہوں سے تنگدستی اور بیماری میں

اور احتراز کرنے والے ہیں) اور وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں) کی اصل یہ ہے وَاصْبِرْ عَلٰى حُكْمِ اللّٰهِ حَالَ كَوْنِكَ جَالِسًا مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ الخ (اور آپ مستقل رہیں اللہ کے حکم پر اس حال کہ آپ بیٹھنے والے ہوں ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں) اور وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے) کی اصل یوں تھی وَاصْبِرْ عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ وَمَا صَبْرُكَ عَلَيْهِ قَائِمًا بِشَيْءٍ اِلَّا بِاللّٰهِ (اور صبر کیجئے اللہ کے حکم پر اور نہیں آپ کا صبر کرنا قائم کسی چیز کے ساتھ بجز اللہ تعالےٰ کے) اسی طرح ہر جگہ غور کر لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں یہ لفظ عن و علی کے بغیر استعمال ہوا ہے وہاں اصلی صلہ مقدر ہے اور جو حرف جر مذکور ہے وہ صبر کا صلہ نہیں بلکہ کسی فعل محذوف کا صلہ ہے اور زیادت تعمق سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کا اصلی صلہ صرف ایک ہی ہے یعنی علی اور عن بھی اصلی صلہ نہیں بلکہ عارضی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ صبر فی نفسہ مامور بہ ہے اور مامور بہ میں اصل افعال وجودیہ ہیں نہ کہ تروک پس صبر کا مدخول اصلی فعل مامور بہ ہی ہونا چاہیئے اور اس کے مناسب صلہ حروف علی ہی ہے نہ کہ عن اور جہاں صبر کا صلہ عن آیا ہے وہاں گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدخول صبر منہی عنہ ہے مگر تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی ایک نہ ایک مامور بہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ تروک کی دو قسمیں ہیں ایک ترک عدمی ایک ترک وجودی اور یقیناً تروک عدمیہ متعلق صبر نہیں ہو سکتے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ صبر مامور بہ ہے اور اس میں اجر ثواب کی بشارت دی گئی ہے پس لازم ہے کہ اس کا مدخول ایسی شے ہو جس پر ثواب مل سکے اور تروک عدمیہ پر اجر نہیں ہے اور نہ چاہیئے کہ قیامت میں ہر شخص مسلم کے حسنات غالب اور سیئات مغلوب ہوں کیونکہ ہر وقت میں انسان کرتا ایک کام کو ہے اور ہزاروں گناہوں کو ترک کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کھانا کھا رہا ہے اس وقت وہ زنا اور

غیبت اور چوری ڈاکہ ظلم وغیرہ سے بچا ہوا ہے۔ پانی پیتا ہے تو اس وقت بھی وہ ہزاروں گناہوں کو ترک کئے ہوئے ہے، سوتا ہے اس وقت بھی وہ دنیا بھر کے فضول اور لغو کاموں سے الگ ہے یا فرض کرلو کہ ایک شخص کسی گناہ کا مرتکب ہے، تو وہ اس وقت ایک گناہ کے سوا باقی تمام گناہوں سے بچا ہوا ہے تو چاہیئے کہ ہر گناہ کے ساتھ اس کے نامۂ اعمال میں ہزاروں نیکیاں بھی لکھی جائیں اور اس صورت میں حسنات کا سیئات پر غالب ہونا لازم ہے کہ ایسا کوئی شخص نہ نکلے گا جس کے سیئات غالب ہوں حالانکہ یہ نصوص قرآنیہ کے خلاف ہے پس ثابت ہوا کہ تروک عدمیہ پر کوئی اجر نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں ترک غیر اختیاری ہے نہ کہ اختیاری اور ثواب امور اختیاریہ پر ملتا ہے نہ کہ غیر اختیاریہ پر (قانون یہی ہے گو حق تعالیٰ کسی کے ساتھ اپنے فضل سے اس کے خلاف بھی معاملہ کرسکتے ہیں مگر اس سے قاعدہ پر نقض وارد نہیں ہوسکتا ۱۲ جامع) جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب میں کہتا ہوں کہ جہاں صبر کا صلہ عن ہوتا ہے وہاں متعلق صبر ترک وجودی ہوگا نہ کہ ترک عدمی اور ترک وجودی بھی مامور بہ کی ایک فرد ہے پس گو بعض جگہ مدخول صبر منہی عنہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ بھی مامور بہ ہے مثلاً اس منافق کے قول میں جو لَا اَصْبِرُ عَنِ النِّسَاءِ (میں عورتوں سے صبر نہیں کرسکتا) وارد ہے اس کی اصل یہ ہے لَا اَصْبِرُ عَلٰی کَفِّ النَّظَرِ عَنِ النِّسَاءِ (میں عورتوں سے نظر روکنے سے صبر نہیں کرسکتا) اس جگہ مدخول صبر کف النظر ہے جو کہ ترک وجودی ہے اور یہ حقیقت میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (اور آپ مسلمانوں سے کہدیجئے اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں) اس میں غض بصر کا امر ہے اور یہی کف النظر ہے پس کف النظر کا مامور بہ ہونا ثابت ہوگیا۔ لہٰذا یہ بات محقق ہوگئی کہ صبر کا اصلی صلہ علیٰ ہے عن بھی اصلی صلہ نہیں بلکہ یہ بھی خصوصیت مقام کے لحاظ سے بطور ظرف کے آتا ہے۔ جب صبر کا اصلی صلہ متعین ہوگیا تو معلوم ہوا کہ مافیہ الصبر جسے محل صبر بھی کہتے

ہیں اور ما علیہ الصبر اور عنہ الصبر ایک ہی چیز ہے یعنی عمل۔ اب اس کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور ثابت ہوگیا کہ صبر کے معنی حبس النفس علی الاعمال ہیں یا حبس النفس علی احکام اللہ ہیں یعنی نفس کو اعمال طاعات و احکام الٰہیۃ پر جمانا اور رو کے رکھنا اس میں سب اعمال آگئے جن میں تروک وجود یہ بھی آگئے پس حقیقت صبر استقامت علی الاعمال ہے اور اس میں ترک منہیات بھی داخل ہے لہٰذا بَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ (صابرین کو بشارت دیدیجئے) کا حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ مصائب میں اعمال طاعات پر جمے رہتے ہیں ان کے لئے بشارت ہے پس صبر کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ مصائب میں جزع فزع کو ترک کردے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ناگوار واقعات میں بھی اپنے معمولات پر مستقل رہے اور منہیات سے بچا رہے پس یہ کتنی بڑی غلطی تھی کہ لوگوں نے صبر کے مفہوم اصلی کو تو اس کی حقیقت سے خارج کر دیا اور اس کی ایک فرد یعنی جزع فزع نہ کرنے میں اس کو منحصر کر دیا حالانکہ جس طرح مصیبت کا یہ حق ہے کہ اس وقت جزع فزع نہ کرے یہ بھی ایک بڑا حق ہے کہ اعمال میں تقلیل و اختلاط نہ ہونے پائے بدون اس کے حقیقت صبر کا وجود نہیں ہوسکتا اور جو شخص ایسے وقت میں اعمال میں کوتاہی کرنے لگے وہ صابر کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا لہٰذا مصائب میں اہتمام اعمال کی سخت ضرورت ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کی بالکل پروا نہیں بس جہاں کوئی ناگوار بات پیش آئی اب ذکر بھی ناغہ ہے اور تہجد بھی رخصت ہے تلاوت قرآن بھی ندارد ہے اور جماعت کا اہتمام بھی فوت ہے اس وقت انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس مصیبت کے بعد معمولات کی پابندی شروع کردوں گا۔ مگر یہ اس کی غلطی ہے کیونکہ ممکن ہے اس کے بعد دوسری مصیبت آجائے پھر یہ کہو گے کہ اس کے بعد پابندی کروں گا ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی حادثہ ہو جائے تو تم اسی امروز و فردا میں رہو گے اور عمر بھر پابندی نصیب نہ ہوگی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر گریزی بر امید راحتے　　ہم آنجا پیشت آید آفتے

(اگر فرصت اور راحت کی امید پر گریز کرتا ہے اس وقت بھی ممکن ہے کہ تجھ کو کوئی آفت کا سامنا ہو جائے)

صاحب اس طرح عمر گذر جائے گی اور آپ کو فراغ کا وقت نہ ملے گا پس اگر پابندی چاہتے ہو تو ہمت کر کے مصیبت ہی میں کام شروع کر دو کام کا خاصہ ہے کہ وہ بخود بخود فراغ پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ دھوا اور دام سے خالی نہیں ہے سوائے تعلق مع اللہ آرام اور راحت نہیں ہے) انسان چاہتا ہے کہ ذکر اللہ اور اعمال طاعات سے پہلے فراغ و راحت قلب حاصل ہو جائے تو پھر ان میں مشغول ہوں مولانا فرماتے ہیں کہ فراغ و راحت اس کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا پس جس چیز کے تم منتظر ہو اس کا ذریعہ وہی ہے جس کو تم چھوڑے ہوئے ہو اور اس کے بغیر تمھارا فراغ و راحت کو طلب کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں یوں کہے کہ دریا میں اس حال سے کیونکر جاؤں میں تو ناپاک اور وہ صاف شفاف اور پاک نہیں مجھے پاک ہو کر دریا میں جانا چاہئے تو دریا اس سے یہ کہے گا کہ مجھ سے دور رہ کر تو پاک ہو ہی نہیں سکتا پاک ہونے کی تو یہی صورت ہے کہ تو اسی حال سے میرے اندر چلا آ اسی ہمارا یہ خیال خام ہے کہ غم سے خالی ہو کر ذکر و طاعات میں مشغول ہوں گے صاحب غم سے خالی ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ آپ اسی حالت میں کام شروع کر دیں وہ خود سارے غموں کو دور کر دے گا واللہ مصیبت کے وقت ذکر و طاعات ہی سے غم ہلکا ہوتا ہے اور ان میں کمی کر کے اور زیادہ پریشانی بڑھتی ہے آجکل میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں پر مصائب کا نزول[1] ہو رہا ہے اور نہ معلوم یہ کب تک زائل ہوں آجکل لوگوں کو اس کی وجہ سے تشویش ہے اور زیادہ وقت اسی قسم کی باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ معمولات کی پابندی بالکل فوت ہو گئی ہے جو لوگ اسی قسم کی باتوں میں مشغول ہیں انھوں نے تو معمولات سابقہ کو بالائے طاق رکھ ہی دیا ہے مگر جو لوگ فضول باتوں سے الگ بھی ہیں میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی تشویش سے خالی نہیں ہیں ان کے معمولات میں بھی خلل واقع ہو رہا ہے اور جو ہمت کر کے معمولات کی پابندی پر جمے ہوئے بھی ہیں ان کا بھی بعض دفعہ پریشانی کی وجہ سے کام میں دل نہیں لگتا۔ مجھے خود اپنے اندر یہ بات محسوس ہوتی ہے اور میں نے تجربہ

---

[1] واقعہ سہارنپور اور فتنہ ارتداد کی طرف اشارہ ہے ۱۲ جامع

کیا ہے کہ جب مجھے کسی بات پر عمل دشوار ہوتا ہے تو میں اسی کے متعلق بیان کر دیتا ہوں اس سے مجھے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے یہ مضمون میں نے اپنی اصلاح کی غرض سے بھی اختیار کیا ہے اور یہ بھی مقصود ہے کہ اگر کسی اور کو یہ بات پیش آ رہی ہو تو وہ بھی اپنی اصلاح کر لے اور سامعین میرے واسطے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ مجھے مصائب میں ایسا استقلال عطا فرمائیں کہ تشویش سے معمولات فوت نہ ہوں اور ہمیشہ کی طرح دل جمعی سے پورے ہوتے رہیں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے اوپر سے ان مصائب کو دور فرمائیں اور جس حکمت کے لئے یہ بھیجے گئے ہیں اس کا اثر ہمارے اندر ظاہر ہو۔ کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ناگوار واقعات میں حکمت ہوتی ہے جس سے مبتلا کو سبق لینا چاہیئے یہ بڑی غلطی ہے کہ حکمت کو چھوڑ کر واقعہ ہی کو سبق بنا لیا جائے جیسا ہم لوگوں نے کر رکھا ہے کہ بس رات دن اسی کے تذکرہ میں رہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ مصیبت ہم پر کیوں نازل ہوئی ہے اگر ہماری حالت میں کوئی نقص ہے تو اس کی تلافی کر کے حالت کو درست کرنا چاہیئے تاکہ پھر حق تعالیٰ کا فضل و کرم متوجہ ہو اور یہ تازیانہ عبرت ختم ہو مگر افسوس ناگوار واقعات سے سبق لینے کی ہم کو عادت ہی نہیں بس یہ سبق سیکھ رکھا ہے کہ مصیبت کو مشغلہ بنا لیتے ہیں چنانچہ طاعون و ہیضہ کے زمانہ میں بعض لوگوں کو اسی کا شغل ہو جاتا ہے کہ آج اتنے مرے کل اتنے مرے اصلاح اعمال پر بہت کم توجہ ہوتی ہے یہی طریقہ ہم نے آج کل اختیار کر رکھا ہے کہ سوائے اخباری باتوں کے اور کچھ شغل ہی نہیں رہا جہاں بیٹھتے ہیں بس یہی باتیں ہیں اور اسی کا تذکرہ، میں یہ نہیں کہتا کہ آپ رفع مصیبت کی تدبیر نہ کریں نہیں جس طرح طاعون و ہیضہ کے لئے حفظ ما تقدم کا اہتمام جائز ہے اور بیماری کی دوا دارو مسنون ہے اسی طرح ہر مصیبت کی تدبیر جائز ہے اگر کچھ تدبیر کرنی ہو شوق سے کرو مگر کیا وہ باتیں جو ہم رات دن کرتے ہیں یہ بھی تدبیر میں داخل ہیں ہر گز نہیں بلکہ ان سے بجز مشغلہ کے اور کچھ مقصود نہیں آجکل جو ہر مجلس میں باتیں ہوتی ہیں وہ تدبیر کی باتیں نہیں محض دل بہلانے کا مشغلہ ہے لوگوں کو اس میں مزہ آتا ہے کہ ادھر اُدھر کی نئی باتیں کی جائیں چنانچہ آجکل یہ تازہ واقعہ ہندو مسلمانوں کے فساد کا ظاہر ہوا ہے لوگوں نے

اسی کی باتوں کو مجلس آرائی کا ذریعہ بنالیا۔

میں تدبیر کو منع نہیں کرتا۔ تدبیر کریں مگر کون وہ لوگ جو اہل تدبیر ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر عامی نتھو خیرا مدبر نہیں ہوسکتا تدبیر کرنے والے خاص خاص لوگ ہوتے ہیں نہ کہ ہر شخص۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ یہ باتیں تدبیر کے لئے ہوتی ہیں اگر تدبیر کرنی ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک باطنی ایک ظاہری، باطنی تدبیر تو یہ ہے کہ اس وقت مصیبت کے حقوق شرعیہ کو ادا کرنا چاہیئے شریعت نے مصیبت کے وقت صبر کی تعلیم دی ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال طاعات پر استقلال و پابندی ہو اور جزع فزع و اظہار غم سے احتراز ہو جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اور میں بتلا چکا ہوں کہ غم زائل ہونے میں ذکر اللہ و اعمال طاعات کو بڑا دخل ہے مگر افسوس آجکل اس طرف کسی کو بھی توجہ نہیں ان واقعات میں اعمال کا تو خون ہی ہوتا ہے اور جزع فزع و اظہار غم بھی بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ پہلی تحریکات میں شریعت سے بہت کچھ تجاوز کیا گیا کفریات و معاصی میں بہت لوگ مبتلا ہوئے اور صاف کہا جاتا تھا کہ یہ وقت مسائل کی بحث کا نہیں کام ہونا چاہیئے۔ افسوس وہ اسلامی کام ہی کیا ہوا جس میں خدا تعالیٰ کو ناراض کیا گیا اس کے علاوہ سڑکوں اور گلیوں میں اسلام کا نوحہ اشعار میں پڑھا جاتا تھا یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو محرم میں شہادت نامہ والوں نے اختیار کر رکھا ہے آجکل واعظوں اور تقریروں میں بھی یہی سبق رہ گیا ہے کہ دل خراش الفاظ میں اسلام اور مسلمانوں نے ضعف کو ظاہر کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مصائب میں مسلمانوں کو استقلال و ثبات کے ساتھ رہنا چاہیئے کسی طریقہ سے اظہار غم کر کے اپنی کمزوری کو طشت از بام نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے غیر اقوام کے حوصلے بلند ہوتے اور مسلمان انکی نظروں سے گر جاتے ہیں چنانچہ یہ نتائج بد اس حرکت کے اب ظاہر ہو رہے ہیں مگر افسوس اس مفسدہ پر کسی کی بھی نظر نہیں پس سب سے پہلا کام اس وقت ہمارے ذمہ یہ ہے کہ معمولات سابقہ میں کمی نہ کریں خدا کی یاد اور طاعت میں جس طرح پہلے مشغول تھے اسی طرح اب بھی مشغول رہیں اور جزع فزع و اظہار غم سے کلی اجتناب کریں اور کوئی کام خلاف شریعت نہ کریں یاد رکھو معمولات میں کمی کر کے اور اعمال میں حدود شریعت سے تجاوز کر کے کبھی مصیبت زائل نہیں ہوسکتی چاہے تم کتنی ہی تدبیر کرو۔ اس حالت سے غم کو ترقی اور پریشانی میں زیادتی

ہی ہوگی۔ دوسری صورت تدبیر ظاہری کی ہے اس کی آسان اور سہل صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنا بڑا بنا لو اور بڑا ایسے شخص کو بناؤ جس کی ذہانت اور تقویٰ پر پورا اعتماد ہو کہ یہ کسی مصیبت یا پریشانی میں شریعت سے تجاوز نہ کرے گا نیز اس کی عقل و تدبیر پر بھی اعتماد ہو ایسے شخص کو بڑا بنا کر اس سے پریشانی ظاہر کر دو اور بے فکر ہو جاؤ پھر وہ جو کچھ بتلاوے اس کے موافق عمل کرو۔ تم تدبیریں نہ کرو وہ خود تدبیر کریگا تم اپنے دینی اور دنیوی کام میں بے فکری سے لگے رہو اور سارا بوجھ اس کے اوپر ڈالدو۔ اور چونکہ وہ خدا تعالےٰ سے تعلق رکھتا ہے اور خدا نے اس کو عقل و تدبیر بھی کامل دی ہے وہ اس بوجھ سے گھبرائے گا نہیں بلکہ اپنے متبعین سے یوں کہیگا ؎

من غم تو می خورم تو غم مخور
من بہ تو مشفق ترم از صد پدر

(میں تیرا غم کھاتا ہوں تو غم مت کر میں تجھ پر سیکڑوں باپوں سے زیادہ شفیق ہوں)

اس صورت میں مسلمانوں کا نہ کوئی دینی کام بند ہوگا نہ دنیوی سب کام اپنے قاعدہ سے چلتے رہیں گے۔ اور اگر کوئی بات حکام وقت سے کہنے کی ہو تو اپنے بڑوں سے مشورہ کر کے حکام کو اطلاع کر دو۔ اب جو کام ان کے کرنے کا ہے وہ خود کریں گے۔ اگر پھر بھی تم پر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو وقت پر صبر کرو اور اگر کوئی ہنگامہ ہو جاوے تو تم کو لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو۔ اور اپنی حفاظت کرو اس صورت میں غالب تو یہ ہے کہ دوسرا بھی ظلم سے باز آجائے گا اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہو جاؤ گے اس میں بھی مسلمان کا نفع ہے۔ شہادت وہ چیز ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ اس کے لئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ بِبَلَدِ رَسُوْلِکَ

(اے اللہ مجھ کو اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما اور میری موت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں کر)

(پرنٹنگ محل کراچی)

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تمنا کیا کرتے تھے وَدِدْتُّ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی (محبت رکھتا اس بات کو کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں)

(میں اوپر تفصیل کے ساتھ اس کی فضیلتیں کسی قدر بیان کر چکا ہوں مگر اتنی بات پھر کہے دیتا ہوں کہ جان دینا اسی وقت شہادت ہے جب شریعت کے موافق ہو۔ ورنہ خودکشی ہے ۱۲)

تو ظاہری تدبیر کی یہ صورت ہے مگر افسوس آجکل ہر مسلمان متفکر نظر آتا ہے یہ خود رائی کا نتیجہ ہے ان کے سر پر کوئی بڑا نہیں ہے نہ کسی کو بڑا بناتے ہیں۔ اس لئے ہر کس خود تدبیر کرنا چاہتا ہے اور ایرا غیرا نتھو خیرا تدبیر کے اہل نہیں تو پریشانی ہی پریشانی بڑھتی ہے ہمارے اندر اتفاق واتحاد نہیں اس لئے ہمارا کوئی مرکز نہیں اور بدون کسی مرکز کے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ پہلی تحریکات ؎ میں ہم کو شرکت کے لئے کہا جاتا تھا ہم نے کہا کہ شرکت کے لئے کچھ شرائط ہیں جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کوئی بڑا اور سردار ہو اور وہ اس شان کا ہو کہ اگر کوئی اس کے حکم کی مخالفت کرنا چاہے تو قوت سے اس کو دبا سکے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدون اتفاق واتحاد باہمی کے کوئی کام نہیں چل سکتا اور جس طرح کسی اہم کام کے لئے حدوث اتحاد کی ضرورت ہے بقاء اتحاد کی بھی ضرورت ہے اور بقاء اتحاد بدون کسی سردار کے نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص ایسا بھی تو ہونا چاہیئے جو اپنی قوت وشوکت سے اس اتحاد کو قائم رکھ سکے بس وہ قہری وحدت ہو ورنہ ارادی وحدت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان تحریکات میں آپ نے جن لوگوں کو بھائی بنایا تھا انہوں نے دشمنی کا برتاؤ شروع کر دیا۔ وہ ارادی اتحاد تھا۔ جب انہوں نے چاہا زائل کر دیا

؎ مراد تحریکات خلافت ہیں اس کے بعد دوسری تحریکات انسداد فتنۂ ارتداد کی پیدا ہوئیں جو اس وعظ کے وقت ابتدائی حالت میں تھیں ۱۲ جامع

ضروری اطلاع:۔ خط وکتابت کرتے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

تو یہ اتحاد جو بدون کسی سردار کے ہو لڑکوں کی یاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لڑکے آپس میں دوستی کرتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر کہدیتے ہیں کہ جاؤ آج سے یاری کٹ کردی یہ تو نئے بھائیوں کا حال ہوا اور جو پہلے سے قدیم بھائی تھے یعنی مسلمان ان کو اصحاب تحریکات نے فاسق اور ڈرپوک بنا کر ان سے بائیکاٹ کرکے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بائیکاٹ نہیں بلکہ بھائی کاٹ ہے کیونکہ اس کی زیادہ تر مشق مسلمانوں ہی پر کی گئی ہے تو اب ان کے ہاتھ سے دونوں جلتے رہے۔

وہی قصہ ہو گیا کہ جہانگیر نے نور جہاں کو بچپن میں شادی سے پہلے ایک موقعہ پر دو کبوتر دیئے تھے کہ ان کو اپنے ہاتھ میں لئے رہ میں ابھی آتا ہوں اس کے ہاتھ سے ایک کبوتر نکل گیا۔ جہانگیر نے جو واپس آکر ایک ہی کبوتر دیکھا، پوچھا دوسرا کہاں گیا۔ نور جہاں نے کہا جہاں پناہ اڑ گیا۔ جہاں گیر نے غصہ سے کہا کہ کیسے اڑ گیا۔ نور جہاں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا جہاں پناہ ایسے اڑ گیا۔ بس جہانگیر اس ادا پر فریفتہ ہو گئے اور زبان حال سے یہ کہنے لگے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ
بحیرتم چہ عجب تیر بے کماں زدۂ

(میرے سینے کے اندر تو نے زخم بے نشاں کے مارا ہے حیرت میں ہوں کیسا عجیب تیر بے کماں تو نے مارا ہے)

اور آخر کار نور جہاں سے نکاح کر لیا۔ واقعی دل کے آنے کا بھی کوئی قاعدہ نہیں بعض دفعہ ذرا سی بات پر دل آجاتا ہے تو جس طرح ایک کبوتر تو اتفاقاً اڑ گیا تھا ایک کو نور جہاں نے خود چھوڑ دیا۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں کو ہندوؤں نے تو اتفاق کرکے چھوڑا اور انھوں نے اپنے قدیم بھائیوں سے نفاق کرکے انہیں خود چھوڑ دیا اب دونوں ہاتھ خالی رہ گئے (دایاں بھی اور بایاں بھی کیونکہ قدیم بھائی اصحاب الیمین تھے۔ اور جدید بھائی اصحاب الشمال ۱۲ جامع)

افسوس مسلمان مصائب کے وقت سیاسیات میں دوسری قوموں کی دست نگری کرتے ہیں حالانکہ سیاست میں بھی شریعت کے مکمل احکام ان کے پاس موجود ہیں اور اسلامی سیاست تو وہ چیز ہے جس سے دنیا بھر کے سیاست داں سبق لیتے ہیں مگر مسلمان ہیں کہ دوسروں کے محتاج ہیں۔ بس وہ حال ہے ؎

یک سبد پرناں ترا برفرق سر　　　تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

اور یہ حال ہے ؎

تا بزنوئے میاں قعر آب　　　وز عطش وز جوع گشتستی خراب

یعنی جیسے ایک شخص کے سر پر روٹیوں سے بھرا ہوا ٹوکرا رکھا ہو۔ اور وہ بھوک کی حالت میں اس سے بے خبر ہو کر ہائے بھوک ہائے بھوک کہتا پھرے یا ایک شخص گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہو۔ اور ہائے پیاس ہائے پیاس گاتا پھرے۔ یہی حال آج کل مسلمانوں کا ہے۔ یہ اپنے گھر کے جواہرات سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی کوڑیوں کے محتاج ہیں مسلمانوں نے بڑی غلطی کی کہ ان تحریکات میں شریعت کی تعلیم کو بالکل چھوڑ دیا واللہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم شریعت کو اختیار کر لو تو تشویش تمہارے پاس بھی نہ ہوگی گو تشویشناک واقعات کیسے ہی پیش آئیں کیونکہ متبع شریعت کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

ہمہ شہر پرز خوباں منم و خیال ماہے　　　چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

(تمام شہر حسینوں سے بھرا پڑا ہے میرا خیال ایک محبوب کی طرف ہے چشم بدخو کو کیا کروں کہ اس کے علاوہ کسی پر نظر نہیں کرتی)

اس کی نظر ہر واقعہ میں ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اس کے سوا کسی پر نظر نہیں ہوتی وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے پھر تشویش کیسی بس اس کو تو یہ فکر رہتی ہے کہ حق تعالےٰ راضی رہیں۔ پھر دنیا میں جو چاہے ہوتا رہو چاند سورج بھی نکلیں یا نہ نکلیں اسے اسکی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کا تو مذاق یہ ہوتا ہے ؎

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

ترجمہ:۔ (بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی کی طرف متوجہ ہو جاؤ)

اور وہ یوں کہتا ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دارو گیر شاہی سے بہتر ہے)

خاقانی اسی کو فرماتے ہیں ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یک دم با خدا بودن باز ملک سلیمانی

(تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک گھڑی خدا کے ساتھ مشغول ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے)

واللہ جب تھوڑی دیر عارف کو حق تعالیٰ کا حضور بے کیف میسر آجاتا ہے اس کی وہ لذت ہوتی ہے جو تمام غموں کو کافور کر دیتی ہے پھر اس کے پاس پریشانی کہاں اس شخص کو مصیبت کے وقت یہ فکر تو ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں کہیں ناراضی کی وجہ سے تو یہ سزا نہیں دی۔ پھر جب اعمال و حالت قلب میں غور کر کے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ناراض نہیں ہیں تو اب اس کا دل قوی اور منشرح ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی کلفت میں اس کو راحت نظر آتی ہے اور گو وعدہ تو نہیں مگر وقوع اکثر یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہری واقعات تشویش سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور باوجود قلت جماعت و قلت سامان کے غالب و فائز رہتے ہیں (کما فی الحدیث لا یزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرھم من خالفھم ولا اری لا یضرھم فی الدین خلاف من خالفھم ولو اضر دنیاھم احیاناً ۱۲ جامع)

اور اگر بالفرض کبھی ان کو ناکامی بھی ہو تو اتباع شریعت کی برکت سے معاملہ الٹا نہیں پڑتا کہ قہر کی سی صورت ہو جائے آجکل تو مشکل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں پر بھی زیادتی کرنے لگتے ہیں

بھلا عورتوں اور بچوں نے کیا قصور کیا پھر اس غلطی کی وجہ سے معاملہ ہم پر ہی الٹ جاتا ہے اور قہر کی سی صورت بن جاتی ہے۔ ان تشویش ناک واقعات میں جھوٹ اور مبالغہ اور تجاوز حدود بہت ہی ہوتا ہے۔ جس سے دین برباد ہوجاتا ہے۔ چنانچہ پہلی تحریکات میں ہمارے ہی بھائیوں نے بعض مسلمانوں کی طرف ایسے جھوٹ الزامات عائد کئے ہیں کہ کوئی مسلمان ان کا مصداق ہرگز نہیں ہوسکتا خصوصاً وہ مسلمان جس کی حالت کا عرصہ دراز تک تجربہ بھی کرلیا گیا ہو پھر ان باتوں کا انجام فساد ذات البین ہوا کہ دوستوں اور بھائیوں میں عداوت اور بغض پیدا ہوگیا اور فساد ذات البین وہ بلا ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اِیَّاکُمْ فَسَادَ ذَاتِ الْبَیْنِ فَاِنَّھَا ھِیَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ یعنی مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرماتے ہیں کہ فساد ذات البین کو اپنے سے دور رکھو کیونکہ یہ مونڈنے والی چیز ہے میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے یاد رکھو مصائب میں حدود شرع سے تجاوز کرنا اعلیٰ درجہ کی بے صبری ہے صابر وہی ہے جو ایسے مواقع میں شریعت پر جما رہے اور کوئی کام خلاف مرضی حق نہ کرے ایسے ہی صابرین کے لئے بشارت ہے اور انہی لوگوں کی فضیلت احادیث و قرآن میں بیان کی گئی ہے آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَةٌ ط یعنی صابرین پر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی اس میں صابرین کے لئے دوسری بشارت ہے جو بلا واسطہ سنائی گئی ہے۔ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ (آپ صابرین کو بشارت دیدیجئے) میں بشارت بواسطہ تھی یہ بلا واسطہ ہے اور یہ مبنی ہے اس قاعدہ پر کہ تاکید سے تاسیس اولیٰ ہے بعض علماء نے اس کو بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ہی کا بیان سمجھا ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ مستقل کلام ہے ماقبل کا بیان نہیں کیونکہ دونوں مستقل آیتیں ہیں پس ظاہر یہی ہے کہ دونوں کا مفہوم بھی مستقل ہو بیان کہنے میں یہ آیت مضمون سابق کی تاکید ہوگی اور مستقل ماننے میں تاسیس ہے اس لئے یہی اولیٰ ہے پس میرے ذوق میں بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ میں بواسطہ بشارت ہے اور اس جملہ میں بلا واسطہ بشارت ہے۔ بہرحال اس میں بتلایا

گیا ہے کہ صابر پر خاص و عام دونوں طرح کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ خاص رحمت تو آخرت میں ہوگی اور رحمت عامہ کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے صابرین کو صبر و استقلال کا ثمرہ دنیا میں بھی حق تعالیٰ کھلی آنکھوں دکھلا دیتے ہیں بشرطیکہ صبر کی حقیقت صحیح طور پر موجود ہو جس کو میں مفصل بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ایک تیسری بشارت تو ایسی بیان فرمائی ہے کہ وہ جزا تو ہر مومن صابر کو ضرور ہی حاصل ہے یعنی وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ کہ یہی لوگ راہ صواب پر چلنے والے ہیں صاحب جو شخص ناگوار واقعات میں شریعت پر کامل طور پر جما رہتا ہے گو ظاہر میں اس کو کیسی ہی کلفت ہو۔ مگر دل میں اس کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ خدا کے فضل سے میں حق پر ہوں۔ دیکھئے میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص تو وہ ہے جو اپنے نزدیک صحیح راستہ پر چل رہا ہے مگر راہ میں کچھ کانٹے اور گڑھے بھی اس کو تنگ کرتے ہیں اور ایک شخص راستہ بھولا ہوا ہے اور اسے جا بجا باغات اور عمدہ عمدہ پھل ملتے جاتے ہیں غور کر کے دیکھ لیجئے کہ ان دونوں کی حالت میں فرق ہے یا نہیں بخدا زمین آسمان کا فرق ہوگا جو شخص ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اس کے قلب میں سکون و اطمینان ہوگا وہ کانٹوں اور گڑھوں کو بھی اطمینان سے طے کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ راستہ یہی ہے۔ اور جو شخص راستہ بھولا ہوا ہے اس کو قدم قدم پر پیر کا اٹھانا بھاری ہو جائے گا اور جتنے نئے نئے باغات اور پھل پھلواریاں اُسے راستہ میں نظر آئیں گی اتنی زیادہ وحشت ہوگی کہ اے اللہ میں کدھر نکل آیا یہ باغات تو میرے راستہ میں کبھی نہ آتے تھے آج یہ کیا معاملہ ہے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ متبع شریعت کو اگر کوئی کلفت بھی پیش آتی ہے تو وہ گھبراتا نہیں کیونکہ وہ راستہ کو دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ مقصود کا راستہ یہی ہے اگر کسی وقت اس کو جان پر بھی خطرہ آتا ہے جب بھی یہ مسرت اس کا دل بڑھاتی رہتی ہے کہ بحمد اللہ میں خدا کے راستہ میں جان دے رہا ہوں اور جو شخص خدا کا مجرم ہے حدود سے گذر گیا ہے اس کو جان دیتے ہوئے یہ خوشی ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔ میں منزل مقصود یعنی جنت پر نہ پہونچوں گا بلکہ نہ معلوم کہاں جا کر گروں گا۔ اس لئے ہدایت پر ہونا واللہ بڑی بشارت ہے اور

یہ وہ جزا اور وہ نعمت ہے جو صابر مومن کو دنیا میں ضرور ہی حاصل ہوتی ہے۔

مجھے ہدایت کا نعمت ہونا ایک بار سفر میں بخوبی محسوس ہوا عرصہ ہوا کہ میں ایک بار سہارنپور سے براہ لکھنؤ کانپور کا ارادہ کرکے ریل میں سوار ہوا میرے ایک دوست بابو صاحب بھی اسی گاڑی میں آکر پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے جب گاڑی چل پڑی تو آپس میں باتیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے کہا میرٹھ جاؤں گا۔ میں نے کہا ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جاتے ہوں افسوس ہے کہ یہ گاڑی تو میرٹھ نہ جائے گی۔ یہ تو لکھنؤ جائیگی اب یہ سنکر جوان کی حالت ہوئی کچھ نہ پوچھئے وہ سخت پریشان ہوئے۔ اور بار بار اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ میں اُن سے باتیں کرنا چاہتا اور وہ جھلاتے تھے کہ میاں تمہیں دل لگی سوجھی ہے یہاں خود ہی پریشانی ہے کہ میں نے یہ بڑی غلطی کی۔

سردی کا موسم تھا ان کو اس لئے اور بھی فکر تھی کیونکہ وہ بالکل بیک بینی و دو گوش تھے جنٹلمین سردی کا سامان ساتھ لیکر سفر کرنے کو عیب سمجھتے ہیں بلکہ لوٹا بھی ساتھ نہیں لیتے اس بھروسہ پر رہتے ہیں کہ جہاں پیاس لگے گی اسٹیشن پر پانی مل جائے گا پی لیں گے نماز کی تو انھیں ضرورت ہی نہیں مگر بعض دفعہ جب اسٹیشن پر پانی نہیں ملتا اور پیاس لگتی ہے تو ان کا بُرا حال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار سفر میں ایک جنٹلمین صاحب نے ایک اسٹیشن کے قریب مجھ سے لوٹا مانگا کہ میں اس میں پانی لے سکتا ہوں میں نے لوٹا دے دیا اس میں کچھ پانی موجود تھا مگر جنٹلمین صاحب نے اسے پھینک دیا کیونکہ اسٹیشن قریب آنے والا تھا اتفاق سے وہاں جو اترے تو پانی نہ ملا اب آپ بڑے کھسیانے ہوئے اور خود ہی کہنے لگے

کہ بڑی حماقت ہوئی میں نے پھلا پانی بھی پھینکدیا۔ یہ واقعی یہ لوگ اپنے کو اصولی سمجھتے ہیں یہ خاک بھی اصولی نہیں ہاں وصولی تو ہیں کہ رقمیں وصول کرنا خوب جانتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی اصول ہے کہ بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑ دیں تو وہ بابو صاحب بھی اسی مذاق کے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور ان کے ساتھ کوئی کپڑا نہ تھا۔ کیونکہ یہ بھی آجکل اصول میں داخل ہے

خلاصہ یہ کہ ان کو کسی طرح بشاشت و اطمینان حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ مجھ میں اور ان میں اس وقت کس بات کا فرق ہے میں مطمئن کیوں ہوں اور یہ بے چین کیوں ہیں۔ بس اس کے سوا کچھ فرق معلوم نہ ہوا کہ میں راہ پر تھا اس لئے مطمئن تھا اور وہ بے راہ تھے اس لئے بے چین تھے اس وقت معلوم ہوا کہ واقعی راہ پر ہونا بھی بڑی اطمینان بخش دولت ہے بے راہ گو ظاہر میں کتنا ہی سامان رکھتا ہو اس کے دل کو اطمینان و سکون حاصل نہیں ہوسکتا پس اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ؕ (اور یہی لوگ راہ پر ہیں چلنے والے) حقیقت میں بڑی بشارت ہے اور راہ پر ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو خود محقق ہوں کہ راستہ کو دیکھ رہا ہو یا کسی محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دیدے۔ جیسا کہ ظاہری راستہ پر چلنے کی بھی دو ہی صورہیں۔ یا تو خود سوانکھا ہو کہ آنکھوں سے راستہ کو دیکھتا ہو اور جو خود اندھا ہو تو کسی سوانکھے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر منزل پر پہونچ سکتا ہے یہی قاعدہ طریق حق کا ہے۔ واقعی محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے آدھا غم تو فوراً ہی ہلکا ہو جاتا ہے۔

میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ بیماری میں محقق طبیب کی صورت دیکھنے ہی سے آدھا مرض جاتا رہتا ہے اسی طرح محقق عارف کے پاس جالے اور اس کی تسلی بخش باتوں کے سننے سے آدھا مرض تو خود زائل ہوجاتا ہے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عارف کی محض صورت دیکھنے ہی سے مرض جاتا رہتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

اے لقاء، تو جواب، ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(آپ کی زیارت ہی ہر سوال کا جواب ہے آپ سے بلا شک وشبہ مشکل حل ہوتی ہے)

اور محقق کی علامت یہ ہے کہ اس کی باتوں سے دل کو تسلی اور اطمینان ہوتا ہے غیر محقق کی باتوں سے اطمینان نصیب نہیں ہوتا جیسے سفر میں اگر آپ کے ساتھ کوئی ایسا رہنا ہو جس کو واقع میں راستہ معلوم نہیں تو اس کی باتوں سے آپ تاڑ لیتے ہیں کہ یہ واقف طریق نہیں ہے۔ ناواقف کی باتیں کچھ ایسی اکھڑی اکھڑی ہوتی ہیں جن سے سمجھنے والوں کو اس کا ناواقف ہونا خود بخود معلوم ہوتا ہے اور واقف کی باتیں دل میں گھر کر لیتی ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ ناواقف کو اپنی باتوں پر خود ہی اطمینان نہیں تو دوسرے کو اس سے اطمینان کا فیض کیسے پہونچے اور جاننے والا جو کچھ کہتا ہے اطمینان سے کہتا ہے تو دوسرے پر بھی اس کے اطمینان کا اثر پڑتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

وعدہا باشد حقیقی دلپذیر وعدہ ہا باشد مجازی تاسہ گیر

(حقیقی وعدہ سے دل کو یقین ہوتا ہے مجازی وعدہ سے اطمینان نہیں ہوتا)

پس راہ پر ہونے کی صورت یہ ہے کہ کسی محقق سے تعلق پیدا کرو۔ جبھی آپ کو مصائب میں کمال صبر کی دولت حاصل ہو سکتی ہے اور اسی وقت آپ کو یہ بشارتیں صلوات ورحمت وہدایت کی حاصل ہو سکتی ہیں۔ پس اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور خلاصہ وعظ پھر بیان کئے دیتا ہوں کہ مصائب میں شریعت نے ہم کو صبر کی تعلیم کی ہے مگر صبر فقط ترک جزع فزع کا نام نہیں۔ بلکہ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ کسی حال میں کسی مامور بہ میں خلل نہ آوے اور جو دینی معمولات پہلے سے اختیار کر رکھے ہیں ان پر مصیبت میں بھی دوام رکھا جاوے اگر اس طرح صبر کیا جاوے تو یہی ہر مصیبت اور ہر غم کا علاج بھی ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔ آمین والحمد للہ رب العالمین وصلے اللہ تعالے علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلے الہ واصحابہ

اجمعین

شریعت اور طریقت

اس پرفتن زمانہ میں منجملہ دوسری عام غلطیوں کے ایک اہم اور بڑی غلطی علم تصوف کے فہم میں ہوئی، کسی نے قول و فعل کی بے قیدی کا نام تصوف رکھ لیا۔ کسی نے چند ظاہری رسوم کو تصوف کا نام دیدیا۔ اور کسی نے صرف کثرتِ اوراد و وظائف کو تصوف سمجھ لیا۔ علیٰ ہذا تصوف کے مسائل سمجھنے میں صدہا غلطیاں کیں۔ جن سے ایک طرف تو ان کے عقائد درست نہ رہے بلکہ بعض تو شرک تک میں مبتلا ہو گئے۔ اور دوسری طرف بعض حضرات نے یہاں تک تجاوز کیا کہ اصل تصوف کا ہی انکار کر بیٹھے۔ اور حضرات اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی شان میں بے ادبی و گستاخی کے خوگر ہو گئے۔ تیرہ صدیوں کے مسلّمہ مسائلِ تصوف کو کتاب و سنت سے خارج اور شریعت کے خلاف سمجھ کر تصوف کے نام سے کوسوں دور بھاگنے لگے، یہ لوگ نہ صرف بزرگانِ دین کے برکات و فیوضات سے محروم ہی رہے بلکہ ان کے قلوب میں قساوت پیدا ہو گئی۔ ان کے علاوہ بعض حضرات تصوف کے منکر تو نہیں ہیں، حضرات اولیاء کے معتقد بھی ہیں لیکن علم تصوف کو شریعت کے علاوہ ایک علیحدہ علم سمجھتے ہیں اور مسائل تصوف کو غیر ثابت بالسنہ جانتے ہیں ان جملہ امور کے پیشِ نظر کتاب شریعت اور طریقت مرتب کی گئی ہے جس کے جملہ مضامین حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ الشاہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کا انتخاب ہیں۔ اس میں شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، بیعت، اخلاق، مجاہدات، اذکار، اشغال، مراقبات، احوال، توجہات، تعلیمات و مسائل مع دلائل و حقائق، سالک کے لئے طریق عمل اور ان کے متعلق ضروری تفصیلات مندرج ہیں جو قرآن مجید، احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں کتب فقہ کی طرز پر ابواب و فصول کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے، شاید ہی تصوف کا کوئی ایسا اہم مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اس کے مطالعہ سے اسلامی تصوف و سلوک کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق، اور اصلاح اعمال کا طریقہ نہایت واضح اور آسان ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی تضاد نہیں۔

قیمت مجلد بیس ۲۰ روپے علاوہ خرچہ ڈاک

ملنے کا پتہ

مکتبۂ تھانوی متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ملا
ایم۔ اے جناح روڈ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

تعظیمُ العلم

مع

تقسیمُ العلم

منجملۂ ارشادات

حکیمُ الامّۃ مجدّدُ الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی — دفتر الابقاء
مسافر خانہ بندر روڈ ایم۔ اے جناح روڈ کراچی

۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

وعظ مسمّٰی

تعظیمُ العِلم

مع

تقسیمُ العِلم

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شئ	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیونکر ہوا	کس لئے ہوا	کیا مضمون تھا	کن کو زیادہ مفید ہوا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
دہلی۔ مدرسہ عبدالرب	۱۰؍ شعبان سنہ بروز یکشنبہ۔	۲ گھنٹہ ۵ منٹ	کھڑے ہو کر	مدرسہ کے سالانہ جلسہ کی تقریب تھی۔	علم دین کی ضرورت اور اس کی اقسام	علماء و طلباء کو بالخصوص تحریکات حاضرہ کے شرکاء کو	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ عثمانی تھانوی۔	۳۵۰۰ تقریباً	حضرت حکیم الامت کو زکام وحرارت کی شکایت تھی پھر بھی بہت زور کا بیان تھا

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ

ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝

(کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ زمین میں موجود ہیں اور کامل کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے)

یہ ایک آیت ہے سورۂ لقمان کی اس میں حق تعالےٰ نے اپنے بعضے دلائل توحید ارشاد فرما کر منکرین توحید کی شکایت کی ہے اور ان کا انکار چونکہ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے اس لئے اس کو مجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا لیکن میرا مقصود اس وقت مضمون توحید کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی مخاطب توحید کا منکر نہیں بلکہ مجھ کو علم دین کی ضرورت اور اس کے بعضے انواع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون اگرچہ منطوقاً اس آیت کا مدلول نہیں ہے مگر اس سے مفہوم ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ تقریر استدلال سے واضح ہو جائیگا پس یہ آیت توحید پر تو صراحۃً دلالت کرتی ہے اور علم کی ضرورت اور اس کے اقسام پر اشارۃً دلالت کر رہی ہے اور چونکہ اس وقت ایک علمی مقام میں بیان ہو رہا ہے اور میرا معمول ہمیشہ یہ ہے کہ مناسب محل مضمون بیان کیا کرتا ہوں اس لئے دوسرے مضمون کو جو اشارۃً اس آیت سے مستنبط ہو رہا ہے اختیار کرنے میں ترجیح دی گئی لیکن ربط کے لئے دلیل توحید کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ ضرورت علم کی طرف اس آیت کے دوسرے جزو میں اشارہ ہے اور پہلے جزو میں صرف توحید کی دلیل مذکور ہے تو پوری آیت کی تفسیر اسی وقت سمجھ میں آویگی جبکہ دونوں اجزاء کو بیان کر دیا جائے۔ مگر پہلے جزو کا بیان محض ربط ہی کے لئے ہوگا اور اصل مقصود علم کے متعلق بیان ہے جو کہ دوسرے جزو میں مذکور ہے

اب سمجھنا چاہئے کہ وہ توحید کی دلیل کیا ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اس میں خطاب ہے عقلاء کو کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالےٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہاری تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں موجود ہیں یہاں سَخَّرَ لَکُمْ کے معنی وہ مراد نہیں ہیں جو اردو محاورہ میں

تسخیر کے لفظ سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ معنی محل اشکال بھی ہیں لیکن منشا اس اشکال کا محض غلط محاورہ ہے اور یہ مزلہ (پھسلنے کی جگہ) ہے اہل علم کے لئے۔ بعض علماء بھی محاورات السنہ میں فرق نہیں کرتے اس لئے ان کو قرآن میں اشکالات پیش آجاتے ہیں لیکن اہل علم کو پھر بھی یہ غلطی واقع ہوتی ہے کیونکہ ان میں اکثر حضرات محاورات ولغات میں فرق جانتے ہیں۔ البتہ ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ غلطی زیادہ پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض ترجمہ ہی کو دیکھتے ہیں اور لغات عربیہ ومحاورات قرآن سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ پس یہ لوگ اکثر قرآن کے محاورات کو اپنی زبان کے محاورات پر قیاس کر کے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی نے سَخَّرَ لَکُمْ کا ترجمہ کسی جگہ یہ دیکھا ہو "مسخر کر دیا تھا تمہارے لئے" پھر اس کو محاورہ اردو عربی میں خلط ہو گیا ہو اور اس نے تسخیر کے لفظ کو اردو محاورہ پر محمول کیا ہو۔ اور دوسرے معنی کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو۔ کیونکہ اس کے ذہن میں تسخیر کے وہی معنی بسے ہوئے ہیں جو محاورۂ اردو میں مستعمل ہیں۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو بات بسی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے دیوبند میں مجھے مسئلہ تسور شیخ کی تحقیق لکھ کر دی تھی کہ اس کو صاف کر دو کسی نے حضرت سے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تھا جس کے جواب میں آپ نے وہ تحقیق لکھی تھی مسئلہ تصور شیخ صوفیہ کا ایک شغل ہے جو زمانۂ قدیم میں رائج تھا۔ لیکن اب محققین نے اس شغل سے منع کر دیا ہے کیونکہ اب عقول سے سلامتی رخصت ہو گئی ہے۔ بہت لوگ اس شغل سے غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں باقی اگر کسی سالک کی فہم سلیم ہو تو اب بھی اسکی تعلیم کا مضائقہ نہیں۔ رفع خطرات وحصول یکسوئی کے واسطے یہ شغل بہت نافع ہے۔ غرض میں اس مسئلہ کی نقل لکھ رہا تھا کہ ایک نووارد طالب علم جو اب تک معقول میں منہمک تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ شیخ بو علی سینا کا۔ بس اس غریب کے نزدیک وہی ایک شیخ تھا اور تو سب جلاہے ہی تھے۔ سو اس کا منشا یہی تھا کہ معقول پڑھنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں شیخ بو علی سینا ایسا بسا ہوا تھا کہ شیخ کا لفظ سن کر ادھر ہی

ذہن منتقل ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کا خیال نہ گیا کہ کوئی اور بھی شئے ہو سکتی ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ جب علوم میں وسعت نہیں ہوتی تو ہر شخص ہر بات کو اپنے علم ہی پر محمول کرتا ہے۔ یعنی جو بات اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اسی کی طرف انتقال ذہن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقص الفہم لوگوں نے صفات الٰہیہ کو اپنی صفات پر قیاس کیا۔ قرآن میں حق تعالے کے لئے وجہ و ید و سمع و بصر و رحمت و غضب وغیرہ کا ذکر دیکھ کر بعض لوگ تجسم کے قائل ہو گئے اس کا منشا بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن میں صفات بشریہ ہی بسی ہوئی ہیں۔ اس لئے ان الفاظ سے تجسیم کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو گیا ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(بہتّر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چل سکا ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی)

اسی طرح ترجمہ دیکھنے والوں نے تسخیر کا لفظ تعویذ گنڈوں ہی میں سُنا ہو گا اس کے سوا اور کسی جگہ اس لفظ کو نہ سنا ہو گا۔ پس قرآن میں سَخَّرَ لَكُمْ کا ترجمہ "مسخر کر دیا تمہارے واسطے" دیکھ کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوا۔ اب وہ اس معنی کو ذہن میں لیکر علماء کے پاس پہنچے اور اپنے نزدیک بڑا اشکال لے کر آئے کیونکہ تسخیر کے معنی ان کے ذہن میں تابع و مطیع و منقاد کرنے کے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں اگر ہم کو بارش کی ضرورت ہو اور ہم بادل سے کہیں کہ برس جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ برسے گا وعلیٰ ہذا القیاس اگر سمندر میں طوفان آ رہا ہو اور ہم ہوا سے یہ کہیں کہ تھم جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ تھمے گی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس معنی کے اعتبار سے ہماری مسخر نہیں ہیں۔ اب ان کو قرآن پر اشکال ہوا کہ قرآن میں تو یہ فرمایا ہے کہ تمام چیزوں کو تمہارے واسطے مسخر کیا گیا ہے اور حالت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں سو بات یہ ہے کہ اس شخص نے تسخیر کا لفظ تو قرآن سے لیا اور معنی

اردو محاورہ کے موافق لئے اس سے یہ اشکال پیدا ہوا حالانکہ اس کو چاہئے تھا کہ تسخیر جس زبان کا لفظ ہے اسی زبان کے محاورات کے موافق اس کے معنے لیتا تو یہ اشکال نہ پڑتا ۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اکثر اشکالات کا سبب یہی ہے کہ لوگ حقائق کو تو سمجھتے نہیں محض غلط محاورات سے شبہ میں پڑجاتے ہیں ۔

چنانچہ ایک شخص تھانہ بھون میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے قرآن پر کچھ شبہ ہے جس کو میں بعد میں بیان کروں گا پہلے آپ اس آیت کا ترجمہ کردیجئے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۔ میں سمجھ گیا کہ اس کو کسی ترجمہ کے دیکھنے سے اشکال پیش آیا ہے میں نے کہا سنئے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے " اور پایا خدا تعالےٰ نے آپ کو ناواقف پس واقف بنادیا " یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے میں نے کہا فرمایئے وہ کیا اشکال ہے کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں ۔ سو منشاء اشکال کا یہ تھا کہ بعض مترجمین نے اس آیت کے ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ پایا آپ کو گمراہ الخ اور غالباً اس زمانہ میں اردو کا محاورہ گمراہ کے بارہ میں فارسی محاورہ کے موافق ہوگا ۔ فارسی میں گمراہ ناواقف کو بھی عام ہے ۔ یہی محاورہ اس وقت اردو کا بھی ہوگا ۔ اس لئے ان حضرات نے ضَالّ کا ترجمہ اس جگہ گمراہ سے کردیا ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اردو محاورہ فارسی کے مطابق اس وقت بھی نہ ہو لیکن مترجم نے فارسی محاورہ کا لحاظ کرکے یہ ترجمہ کیا ہو اور عوام کی گمراہی کا اندیشہ اس لئے نہ ہوا ہو کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ عوام کو ترجمۂ قرآن کسی عالم استاد سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیئے تو ان کو اطمینان تھا کہ پڑھاتے ہوئے ہم بتلادیں گے کہ اس جگہ فارسی محاورہ کے موافق یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ اس لئے انھوں نے آزادانہ یہ لفظ لکھ دیا لیکن اب اردو کا محاورہ بدل گیا ہے آجکل گمراہ محض ناواقف کو نہیں کہتے بلکہ یہ لفظ اس زمانہ میں مذمت کی جگہ بولا جاتا ہے یعنی جو شخص بعد وضوح راہ حق کے اس راہ کو چھوڑدے ۔ نیز آجکل عوام ترجمۂ قرآن کو علماء سے سبقاً سبقاً پڑھتے بھی نہیں اس لئے ان کو اشکالات پڑتے ہیں کہ انھوں نے گمراہ کا لفظ دیکھا جو کہ فارسی لفظ ہے اور معنی لئے اردو محاورہ کے موافق اس وجہ سے شبہ پیدا ہوا حالانکہ ان کو لازم تھا کہ جو لفظ جس زبان کا ہے اس کے معنے اسی زبان کے محاورہ کے موافق لیجیے ۔

پس سمجھنا چاہیئے کہ گمراہ کے دو معنی ہیں ایک وہ جس کو راستہ معلوم ہی نہ ہو اس معنے کیلئے آجکل اردو میں ناواقف کا لفظ مستعمل ہے۔ دوسرے وہ جو بعد بتلانے کے بھی غلط راستہ پر چلے اور عربی میں لفظ ضال بھی ان دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں ضال اور گمراہ سے پہلے معنی مراد ہیں یعنی ناواقف جس پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام علوم حق تعالیٰ ہی کے بتلانے سے حاصل ہوئے اس میں کیا اشکال ہے۔ اور دوسرے معنی جو ضال اور گمراہ کے ہیں وہ اس آیت میں ممتنع الارادہ ہیں وہ ہرگز مراد نہیں خوب سمجھ لو۔ تو جس طرح غلط محاورہ کی وجہ سے اس آیت میں اشکال پڑا تھا اسی طرح یہاں بھی ممکن ہے کسی کو اشکال پیش آیا ہو۔ کیونکہ تسخیر کے معنے ہمارے محاورہ میں یہ ہیں کہ کسی کو ایسا تابع کر دیا جائے کہ جو ہم کہدیں وہی کرنے لگے جیسا کہ تسخیر کے لئے تعویذ گنڈے لکھوائے جاتے ہیں اور وہاں تسخیر کے یہی معنی مراد ہوتے ہیں کہ دوسرا شخص ہمارا ایسا منقاد و مطیع ہو جائے کہ جو ہم کہیں وہی کرنے لگے۔ سو سمجھنا چاہیئے کہ تسخیر کے صرف یہی معنی نہیں ہیں بلکہ عربی میں تسخیر کے ایک اور معنی بھی ہیں یعنی کام میں لگا دینا اور اس آیت میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں پہلے معنی مراد نہیں کیونکہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں ہماری منقاد و مطیع نہیں ہیں کہ جو ہم کہدیں وہی کرنے لگے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مہمان تمہارے یہاں آوے اور تم اُس کی آسائش کے لئے اپنے نوکروں سے کام لو تو وہ نوکر مطیع تو تمہارے ہیں مگر تم نے اس وقت کام میں اس مہمان کے لگا دیا تو تمہارے کہنے سے یہ پانچ چھ گھنٹے جو نوکر اس کے کام میں لگے رہے یہ بھی تسخیر ہے حالانکہ وہ اس کے نوکر نہیں بلکہ تمہارے مطیع ہیں تم نے صرف ان کو اس کے کام میں لگا دیا ہے اور لغت عربیہ کے موافق کسی کو کسی کے کام میں لگا دینا بھی تسخیر کہلاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے آسمان و زمین وغیرہ کو تمہارے واسطے کام میں لگا دیا ہے پس یہی تسخیر ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں تمہاری مطیع نہیں بلکہ ممکن ہے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور انسان کو بھی خبر نہ ہو کہ میرے کام میں کون کون لگا ہوا ہے لیکن چونکہ تم کو ان سے منافع حاصل ہو رہے ہیں اور راحت پہونچ رہی ہے اور ان سے

تمہارے کام چل رہے ہیں اس لئے دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ حق تعالےٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے یعنی تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔ پس اب سَخَّرَ لَكُمْ میں تسخیر کے معنی وہ ہوئے جو شیخ سعدیؒ نے ان شعروں میں بیان کئے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند　　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار　　شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

یعنی بادل اور ہوا اور چاند و سورج سب کے سب اپنے اپنے کام میں اس لئے لگے ہوئے ہیں کہ تم کو روٹی مل جاوے اور پیٹ بھر کے تم خدا کی عبادت میں لگو اور غفلت میں عمر نہ گذارو دوسرے شعر میں از بہر تو کے معنے یہ ہیں کہ تمہارے نفع کے لئے اور تمہاری خاطر سے یہ سب مختلف کاموں میں لگائے ہوئے ہیں اور جو کام جس کے سپرد ہے اس کو اچھی طرح ہر ایک بجا لا رہا ہے۔ بہر تو کہ یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع کر دیا گیا ہے۔ پس از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار کے وہی معنی ہیں جو سَخَّرَ لَكُمْ کے ہیں۔ آگے بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری۔ یعنی جب یہ تمام چیزیں باطاعت احکام الٰہیہ تکوینیہ تیرے کام میں لگی ہوئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیرے اوپر سب سے بڑی حق تعالےٰ کی نعمتیں ہیں کہ ان سب کو تیرے کام میں لگا رکھا ہے تو یہ بہت ہی بے انصافی ہوگی کہ احکامِ الٰہیہ تشریعیہ کی فرمانبرداری نہ کرے کیونکہ جس قدر کسی پر منعم کا احسان زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس پر اوس منعم کا شکر زیادہ واجب ہوتا ہے اور اگر وہ ناسپاسی کریگا تو سب سے زیادہ مورد عتاب بھی ہوگا۔ پس انسان بھی اشرف المخلوقات اسی وقت ہے جبکہ وہ احکامِ الٰہیہ کا اتباع کرے ورنہ بصورتِ مخالفت جمادات و حیوانات ہی اس سے اچھے ہیں کہ وہ خدا تعالےٰ کے احکام کی مخالفت تو نہیں کرتے۔

اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شرف انسان کے لئے لوازم ذات سے نہیں بلکہ مبنیٰ شرف کا اعمال ہیں۔ بعض لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ شرف کو لوازم ذات سے سمجھتے ہیں گو افعال کیسے ہی ہوں۔ بعض لوگ فخر کرتے ہیں کہ ہم شیخ ہیں یا سید ہیں اور اس بنا پر وہ اپنے کو دوسری قوموں سے مطلقاً افضل سمجھتے ہیں گو ان شیخ و سید صاحب کے اعمال جلاہوں سے

بھی بدتر ہوں سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر انسان کے اعمال درست نہ ہوں تو وہ جلاہوں سے تو کیا افضل ہوگا وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہوگا اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں) بنا، شرف اعمال صالحہ وایمان ہے ورنہ سے

اَلنَّاسُ مِنْ جِھَۃِ التِّمْثَالِ اَکْفَاءُ اَبُوْھُمْ اٰدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّاءُ

یعنی صورت کے اعتبار سے سب آدمی یکساں ہیں کیونکہ سب کے سب آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ البتہ اگر اعمال درست ہوں تو پھر شرف نسب بھی ایک درجہ میں باعث فضیلت ہوسکتا ہے۔ لیکن اس پر فخر کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہاں تحدث بالنعمۃ (اظہار نعمت) جائز ہے۔ اور اگر انسان ہوکر اعمال خلاف انسانیت کرے تو پھر فخر و شرف کیسا ہاں اس صورت میں بھی استعداد تو اس کے اندر موجود ہے اگر اپنی استعداد کی طرف عود کرے تو پھر وہ اشرف المخلوقات ہے اور یہی محل ہے اس آیت کا وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنَاھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ (ہم نے اولاد آدم کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا)

اس آیت میں جو بنی آدم کو عموماً مکرم کہا گیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ ہر انسان میں استعداد ایسی موجود ہے کہ اگر وہ اس سے کام لے تو پھر ساری مخلوق سے زیادہ مکرم ومحترم ہوسکتا ہے اور اگر اعمال بد ہوئے تو کچھ بھی نہیں۔ بہرحال انسان پر حسب نعم الٰہیہ اور مخلوقات سے زیادہ ہیں تو نافرمانی واعمال بد کی صورت میں وہ دوسروں سے زیادہ مورد عتاب ہوگا۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس پر نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں اس پر شکر بھی زیادہ واجب ہوتا ہے اور ناشکری کی صورت میں اس پر عتاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ دیکھو رعایا میں سے ایک معمولی آدمی اگر احکام شاہی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس درجہ مورد عتاب نہیں ہوتا جیسا کہ ایک درباری آدمی خلاف ورزی احکام پر مورد عتاب ہوتا ہے۔

الغرض انسان اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مخلوق اُس کی

غلام ہے بلکہ اس کی مثال محض مہمان جیسی ہے کہ سارا سامان اسی کے واسطے ہوتا ہے مگر وہ مالک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے اور اشارہ کی صورت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک قضیہ شرطیہ ہے جس کے مقدم و تالی میں بظاہر ربط نہیں ہے مگر اس مقدمہ کے ملا لینے کے بعد ربط پیدا ہو جاتا ہے تو جس مقدمہ پر آیت کا مربوط ہونا موقوف ہے اس پر بھی آیت کی دلالت لازمی ہے گو بطریق اقتضا ہی سہی۔

وہ آیت یہ ہے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ (ترجمہ) اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے۔

اس آیت میں بظاہر مقدم و تالی میں ربط نہیں کیونکہ آدمیوں کے افعال پر مؤاخذہ کرنے کا نتیجہ ظاہر میں آدمیوں ہی کی ہلاکت ہو سکتی ہے نہ کہ تمام حیوانات کی ہاں اگر یہ فرماتے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ الْخَلْقَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ (اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتی ہے تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے)

یا یوں فرماتے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنَ الْاِنْسَانِ (اور اگر حق تعالےٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی انسان کو نہ چھوڑتے)

تو اس صورت میں ربط ظاہر تھا لیکن آیت اس طرح وارد نہیں ہوئی وہاں تو مواخذہ اعمال انسان پر تمام حیوانات اور جاندار چیزوں کی ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ کہ انسان کے گناہوں سے تمام مخلوق ہلاک ہو۔ ان دونوں مقدموں میں جوڑ کیا ہے۔ مگر تقریر گذشتہ کے ملانے سے اب اس اشکال کا جواب ظاہر ہے اس آیت کے ساتھ وہ مقدمہ ملا لیجئے۔ کہ انسان کے لئے سب کائنات پیدا ہوئے ہیں پس اب ربط پیدا ہو گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ انسان تو اس صورت میں اپنے گناہوں کی وجہ ہلاک ہوتا اور بقیہ مخلوقات اس لئے ہلاک

ہوئیں کہ وہ سب انسان کے لئے پیدا ہوئیں تھیں اور قاعدہ ہے اَلشَّیْئُ اِذَا خَلَا عَنْ غَایَتِہٖ اِنْتَفٰی (چیز جب غرض و غایت سے خالی ہوتی ہے تو منتفی ہو جاتی ہے) جب انسان ہی نہ رہا جس کے لئے یہ سب پیدا ہوئے تھے تو اب ان کے باقی رہنے میں کیا فائدہ اس لئے یہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

الغرض انسان اس عالم بمنزلہ مہمان کے ہے اور حق تعالیٰ ہماری عادت کے موافق ہمارے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں اور معزز مہمان کے بارے میں ہماری عادت یہ ہے کہ مہمان کے آنے سے پہلے سب کام درست کر دیا جاتا ہے اس کی نشست و برخاست کے لئے کمرہ صاف اور درست کر دیتے بستر وغیرہ انتظام کر دیتے اور تمام ضروریات کو پہلے سے مہیا کر دیتے ہیں جس سے بعض دفعہ ناواقف دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اس کمرہ کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کیوں کیا جا رہا ہے بلکہ ممکن ہے کہ کوئی نادان سامان دیکھ کر یوں سمجھنے لگے کہ شاید مالک کو اس کمرہ ہی سے زیادہ محبت ہے اسی لئے وہ اس کو زیادہ آراستہ رکھنا چاہتا ہے یا اس سامان ہی کو مقصود سمجھ جائے کہ اس کا محفوظ کرنا اور قرینہ سے رکھنا ہی مالک کو منظور ہے مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ نہ اس کمرہ سے مالک کو کوئی خاص محبت ہے نہ اس سامان کی حفاظت مقصود ہے بلکہ یہ سب کچھ کسی کی آمد کے لئے انتظام ہے چنانچہ ہفتہ دو ہفتہ کے بعد جب مہمان پہنچ جاتا اور اس تمام سامان میں تصرف کرنے لگتا ہے اس وقت حقیقت شناس کے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن نادان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مہمان تو ایک یا دو ہفتہ کے بعد آیا اور سامان پہلے مکمل ہو چکا کمرہ بہت پہلے سے آراستہ ہے تو وجود میں یہ سامان اور کمرہ کی آرائش مقدم ہے اور مہمان کی آمد مؤخر ہے اور مقدم مؤخر سے افضل ہوتا ہے اس لئے یہ سامان مہمان کے تابع نہیں۔ غرض یہ بیوقوف تقدیم وجودی ہی کو باعث شرف سمجھتا ہے۔ پھر قاعدہ یہ ہے کہ مہمان کے چلے جانے کے بعد بھی سامان کو فوراً منتشر نہیں کیا جاتا اس سے نادان کو سامان کے مقصود ہونے کا اور زیادہ شبہ ہو جاتا ہے کہ تقدیم فی الوجود و تاخیر فی البقاء اس کی علامت ہے کہ یہ سامان مہمان کے واسطے نہیں ورنہ اس کے چلے جانے

کے قبل ہی منتشر کر دیا جاتا مگر عاقل کے نزدیک یہ بھی اسی کی علامت ہے کہ یہ سب سامان مہمان ہی کے واسطے تھا کیونکہ مہمان عزیز کے سامنے سامان کو منتشر نہیں کیا کرتے تاکہ اسکو ایک منٹ کے لئے بھی تکلف نہ ہو چلنے وقت تک سارا سامان اسی طرح آراستہ رکھا جاتا ہے اس کی رخصت کے بعد توقف سے سامان کو منتشر کیا کرتے ہیں۔ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہماری عادت مہمان کے واسطے یہ ہے تو آپ سمجھئے کہ حق تعالے نے بھی ہماری ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حٰم میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ تمام کائنات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے اور دیگر آیات و احادیث سے یہ معلوم ہے کہ فنا پہلے انسان کا ہوگا اس کے بعد دوسری کائنات فنا ہوں گی۔ اس سے نادان کو یہ غلطی ہو سکتی ہے کہ اگر انسان مقصود ہوتا اور یہ کائنات اس کے لئے پیدا ہوتی تو اس کی طرف توجہ بھی سب سے پہلے ہوتی حالانکہ اس کو سب کے بعد پیدا کیا گیا ہے مگر یہ محض نادانی ہے کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ غایت ہمیشہ مقدم فی التصور اور مؤخر فی الظہور ہوا کرتی ہے تو انسان کا ظہور مؤخر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ توجہ بھی اس کی طرف بعد میں ہوئی بلکہ اصل مقصود خلق عالم سے انسان کا ظہور تھا لیکن حق تعالے نے انسان کی آسائش کے لئے نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ انسان ایک معزز مہمان ہے اس کی تمام ضروریات کو پہلے سے پیدا کر دیا یعنی بسائط کو۔ لیکن بسیط سے مراد یہ نہیں کہ وہ اشیاء بالکل ترکیب سے خالی ہیں فاقد الاجزاء ہیں بلکہ بسیط سے مراد یہ ہے جس میں ترکیب بصنعۃ العباد نہیں ہے چنانچہ جتنی چیزیں انسان کی ضرورت کی تھیں ان کے اصول ہر وقت عالم میں موجود ہیں انسان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ ان میں ترکیب و تحلیل کر کے جو کچھ چاہے تیار کر لے مثلاً درخت پہلے سے موجود ہیں انسان نے آکر اس کو کاٹا اور چیرا پھر لکڑی تختے کڑیاں وغیرہ بنالیں۔ خدا نے گیہوں پیدا کر دیا جس کو پیس کر آٹا بنایا جاتا اور پانی میں ملا کر گوندھا جاتا اور آگ پر رکھ کر روٹی پکائی جاتی ہے۔ اسی طرح جانوروں سے دودھ نکلتا اور اس سے گھی بنایا جاتا اور اس میں مٹھائی وغیرہ ملا کر حلوا تیار کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام چیزوں میں غور کر لیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کا

کام صرف تحلیل و ترکیب ہے اعدام و ایجاد انسان کا کام نہیں یعنی نہ وہ کسی چیز کو اپنے پاس سے وجود دے سکتا ہے نہ کسی کے وجود کو سلب کر سکتا ہے لیکن بعض لوگ تحلیل و ترکیب ہی کو ایجاد و اعدام سمجھتے ہیں اس لئے اپنے کو موجد کہنے لگے۔ چنانچہ نمرود کو یہی غلطی پیش آئی تھی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس نے وجود صانع پر دلیل کا مطالبہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایک کھلی ہوئی دلیل بیان فرمائی کہ "رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ" کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ تو نمرود کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یہ کہہ کر اس نے قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلایا جن میں سے ایک واجب القتل تھا اس کو تو رہا کر دیا اور ایک قیدی رہائی کے قابل تھا اس کو قتل کر دیا۔ حالانکہ یہ احیاء و اماتت نہ تھا کیونکہ احیاء کے معنے حیات بخشنے کے ہیں جس قیدی کو نمرود نے رہا کیا تھا اس کو پہلے سے حیات حاصل تھی نمرود نے اس کو اپنے گھر سے حیات نہ دی تھی اور اماتت ازہاق روح کا نام ہے اور جس قیدی کو اس نے قتل کیا تھا اس میں نمرود کا فعل صرف اس قدر تھا کہ اس نے اس کی گردن جدا کر دی اب یہ عادۃ اللہ ہے کہ انگلی یا ہاتھ کے جدا کر دینے سے جان نہیں نکلتی اور گردن کے جدا کر دینے سے جان نکل جاتی ہے پس گردن کا جدا کرنا نمرود کا فعل تھا اس کے بعد جان خود بخود عادۃ اللہ کے موافق نکل گئی انسان کا اس میں کچھ دخل نہ تھا پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے تفریق اجزاء و عدم تفریق اجزاء کو احیاء و اماتت کو سمجھا جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی کور مغزی دیکھی تو آپ نے دوسری دلیل کی طرف اس کو عجزٌ عن الفہمِ (فہم کے عاجز ہونے) کے سبب نہ کہ اپنے عجزٍ عن الجواب کے سبب انتقال کیا کیونکہ آپ نے یہ دیکھا کہ اگر میں اس کا جواب دوں اور احیاء و اماتت کی حقیقت بیان کروں اور یہ بتلاؤں کہ تیرا فعل احیاء و اماتت میں دخل نہیں تو یہ کوڑھ مغز اس فرق کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس لئے آپ نے دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ واضح بیان فرمائی وہ یہ کہ میرا خدا وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا کا منکر ہے تو مغرب سے آفتاب کو نکال۔ اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر ان کا منہ تکنے لگا

اور اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔ یہاں سے اہل مناظرہ کے ایک اشکال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا۔ اشکال یہ ہے کہ فن مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال کرنا مناظرہ کو جائز نہیں اور یہ ایک مسئلہ عقلیہ ضروریہ ہے کیونکہ اگر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز کر دیا جائے تو اس طرح سلسلۂ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا۔ تم نے ایک دلیل بیان کی خصم نے اس کو توڑ دیا تم نے اس انتقال کر کے دوسری دلیل بیان کر دی اس نے اس کو بھی توڑ دیا تم نے تیسری دلیل بیان کر دی تو یہ تو غیر متناہی سلسلہ ہو جائے گا۔ پھر حق کبھی ظاہر ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے علماء مناظرہ نے انتقال الی دلیل آخر کو ناجائز مانا ہے اور کوئی شخص اس اشکال کا یہ جواب نہ سمجھے کہ یہ تو علم مناظرہ کا ایک مسئلہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں ان کے ذمہ ہمارے اصول کا ماننا کب لازم ہے بلکہ ہم کو ہی ان کی بات کا ماننا لازم ہے جواب، ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ محض ہمارے اصول مسلمہ کی قسم سے نہیں بلکہ عقلی مسئلہ ہے جس کا تسلیم کرنا فی نفسہ ضروری ہے۔ پس اب اُس اشکال کا صحیح جواب سنئے۔ بات یہ ہے کہ مناظرہ میں انتقال الی دلیل آخر اپنی مصلحت سے تو ناجائز ہے لیکن خصم کی مصلحت سے جائز ہے مثلاً ہم نے ایک دلیل غامض بیان کی جس کو خصم نہیں سکتا تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دلیل غامض کو سہل عنوان سے بیان کیا جائے سو اگر اس میں تطویل زیادہ نہ ہو نیز مخاطب تسہیل کے بعد سمجھنے پر قادر ہو تب تو اس کی تسہیل کر دینی چاہیے اور اگر تسہیل میں تطویل ہو یا مخاطب ایسا بلید ہو کہ تسہیل کے بعد بھی دلیل غامض کو نہ سمجھ سکے تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ اس دلیل غامض سے انتقال کر کے دوسری واضح دلیل بیان کر دی جائے جس کو خصم بخوبی سمجھ سکے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت میں مخاطب کی مصلحت سے انتقال کیا تھا۔ کیونکہ آپ نے دیکھا کہ مخاطب بڑا ہی کوڑ مغز ہے اس لئے اس سے کیا امید تھی کہ وہ امانت و احیاء کی حقیقت کو سمجھے گا اور جھک جھک کرے گا۔ اگر نمرود کو کچھ بھی علم و فہم ہوتا تو

اس کی بات کا جواب بہت سہل تھا۔ ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ ازہاق روح تیری قدرت میں نہیں تیرا کام صرف گردن جدا کر دینا تھا۔ اس کے بعد روح کا نکل جانا عادۃ اللہ کے موافق ہوا تیرا اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ قاعدہ عقلیہ ہے اَلْقُدْرَۃُ تَتَعَلَّقُ بِالضِّدَّیْنِ کہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے جو شخص جان نکالنے پر قادر ہوگا وہ اس کے روکنے پر بھی ضرور قادر ہوگا پس تفریق گردن کے بعد اگر زہوق روح تیرے اختیار سے تھا تو اس پر بھی تجھ کو قدرت ہونی چاہیئے کہ ایک شخص کی گردن جدا کر کے اس کی جان کو نہ نکلنے دے اگر تو اس پر قادر ہے کہ گردن کاٹنے کے بعد جان کو روک لے اور نہ نکلنے دے تو ایسا بھی کر دکھا اس کا جواب اس کے پاس ہرگز کچھ نہ تھا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل کمزور نہ تھی اور نہ اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے دوسری دلیل کی طرف انتقال کیا تھا بلکہ محض اس وجہ سے انتقال کیا کہ پہلی دلیل کے سمجھنے کی اُس کوڑ مغز سے امید نہ تھی غرض انسان کا کام محض تحلیل و ترکیب ہے ایجاد و اعدام اس کا کام نہیں اور جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں چیز کا موجد ہے یہ اطلاق محض مجازی ہے کیونکہ جتنی ایجادیں عالم میں ہوئی ہیں ان کے اجزاء بسیطہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ ان اجزاء بسیطہ کو خدا تعالیٰ کے سوا پیدا نہیں کیا موجد کا کام صرف اس قدر ہے کہ ان سے ان اجزاء میں ترکیب دیدی ہے پس ظاہر میں اس کو صرف ہیئت ترکیبیہ اجتماعیہ کا موجد کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ہیئۃ اجتماعیہ کا موجد بھی مجازاً ہی ہے کیونکہ یہ قاعدہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قدرت ضدین سے متعلق ہوا کرتی ہے۔ پس اگر ہیئۃ اجتماعیہ کا وجود اس شخص کے اختیار سے ہوا ہے تو لازم ہے کہ اس کو اس پر بھی قدرت ہو کہ اجزاء بسیطہ کو ملا دینے کے بعد ان پر ہیئۃ اجتماعیہ کو طاری نہ ہونے دیں حالانکہ کسی شخص کو اس پر قدرت نہیں بلکہ جب چند اجزاء کو باہم ترکیب دیا جائے گا ہیئۃ اجتماعیہ لزوماً طاری ہو جائے گی خواہ تم چاہو یا نہ چاہو یہ اس کی صاف دلیل ہے

کہ انسان کا کام بجز ترکیب کے اور کچھ نہیں نہ وہ بسیط کا موجد ہے نہ مرکب کا نہ ہیئتہ اجتماعیہ کا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے لوہے اور مقناطیس کو باہم نزدیک کر دیا جائے کہ نزدیک کر دینا تو تمہارا فعل ہے اس کے بعد مقناطیس خود بخود اس کو جذب کرلے گا خواہ تم کتنا ہی چاہو کہ جذب نہ کرے اب تمہارا کوئی اختیار نہیں اسی طرح ترکیب کے بعد ہیئتہ اجتماعیہ خود بخود فائض ہوجاتی ہے اب تم کو کوئی نہیں پوچھتا کہ تم ہو کون۔ ہاں حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ ترکیب کے بعد بھی ہیئتہ اجتماعیہ کو فائض نہ کرے۔ چنانچہ ایک پتھر ایسا ہے کہ جب اس کو سرکہ میں ڈالدیا جائے تو وہ بھاگتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ مٹی کو سیال چیز میں ڈالدینے کا مقتضا تو یہ ہے کہ وہ ساکن ہوجائے اور دونوں مجتمع رہیں مگر یہاں خلاف مقتضا اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور بدون کسی مخلوق کے صنع کے وہ جدا ہوجاتے ہیں اسی طرح اس ہیئت اجتماعیہ کے آثار کی حالت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچا لیا حالانکہ اس اجتماع کا اثر اور مقتضا یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام جل کر خاکستر ہوجاتے مگر حق تعالیٰ نے اس اثر کو روکدیا اور اس کے خلاف دوسرا اثر پیدا کردیا۔ اسی طرح یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں عرصہ تک زندہ رکھا اور ان کو ہضم نہ ہونے دیا حالانکہ اس ترکیب و اجتماع کا اثر و مقتضا یہ تھا کہ وہ مچھلی کے معدہ میں جاکر ہضم ہوجاتے اور زندگی ختم ہوجاتی پس حقیقت میں ایجاد و اعدام حق تعالیٰ ہی کا کام ہے انسان کا کام صرف تحلیل و ترکیب ہے پس حق تعالیٰ نے انسان کی تمام ضروریات کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا کر دیا تھا کہ جب وہ دنیا میں آیا ساری ضرورت کی چیزیں اس کو تیار ملیں صرف تحلیل و ترکیب کرنا اس کا کام رہگیا اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

یا نبودیم و تقاضا ما نبود
لطف تو ناگفتۂ ما می شنود

ممکن ہے کہ اس پر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ جب خدا تعالیٰ کو انسان کی ایسی خاطر منظور تھی اور وہ معزز مہمان تھا تو پھر اس کو یہ تکلیف بھی کیوں دی گئی کہ وہ ترکیب وتحلیل کرتا پھرے۔ بس تمام چیزیں کامل ومکمل اس کے واسطے موجود ہوتیں تو بہتر تھا۔ درختوں پر بجائے گیہوں کے روٹی لگا کرتی کپاس کے بجائے بُنے بنائے کپڑے پیدا ہوا کرتے وعلیٰ ہذا القیاس میں کہتا ہوں کہ اس میں حق تعالیٰ نے طبیعت انسانی کی بہت زیادہ رعایت کی ہے کیونکہ اس وقت تو گیہوں الگ پیدا ہوتا ہے اور چنا الگ تم کو اختیار رہے کہ خالص گیہوں کی روٹی پکالو یا خالص چنے کی یا دونوں کو ملا کر۔ نیز یہ بھی اختیار رہے کہ روٹی پکاؤ یا گیہوں اُبال کر کھاؤ یا اس کا ستو بناؤ یا حلوا سوہن تیار کرو غرض سدھا قسم کی چیزیں بنا سکتے ہو اور اگر بجائے گیہوں چنے کے دونوں کی روٹیاں پکی پکائی لگا کرتیں تو بس ایک ہی غذا تم کو نصیب ہوتی یہ رنگ برنگ کی غذائیں تم تیار نہ کر سکتے اسی طرح رُوئی کے پیدا ہونے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی کے موافق **اس کا جیسا** چاہے لباس تیار کر سکتا ہے خواہ خالص سوت کا کپڑا بنائے یا سوت اور ریشم کو ملا کر یا اون اور سوت کو ملا کر نیز یہ بھی اختیار ہے کہ کرتہ بنائے یا پاجامہ یا قمیص یا اچکن اور اگر سِئے سلائے کپڑے درختوں پر لگا کرتے تو بس وہ اسی کام آتے جس کام کے لئے وہ موضوع ہوتے دوسرے لباس مختلف قسم کے تیار نہ ہو سکتے اور اگر ایسا ہو سکتا تو انسان ایک قسم کی غذا اور ایک ہی قسم کے لباس سے اکتا جاتا چنانچہ اس کا تجربہ ایک زمانہ میں ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو من وسلویٰ عطا فرمایا تھا کہ بے محنت ومشقت دونوں وقت ان کو بیٹھے بٹھلائے غذا مل جاتی تھی اور غذا بھی بہت نفیس تھی مگر ان سے ایک غذا پر نہ رہا گیا آخر کو اکتا کر کہنے لگے یَا مُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا الآیۃ اے موسیٰ ہم سے ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہو سکے گا۔ پس اپنے پروردگار سے

دعا کیجئے کہ ہمارے لئے دو چیزیں پیدا کرے جو زمین سے اگا کرتی ہیں یعنی ترکاریاں۔ اور ککڑی اور گیہوں اور مسورا ور پیاز قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم عمدہ چیز کے بدلے ادنیٰ کو لینا چاہتے ہو جاؤ کسی شہر میں اترو وہاں جو کچھ تم مانگتے ہو مل جائے گا تو صاحبو! اگر حق تعالیٰ پکی پکائی روٹی آسمان سے اتارا کرتے تو آپ بھی چند روز میں بنی اسرائیل کی طرح اس سے گھبرا جاتے اس لئے انسان کی راحت اسی میں ہے کہ ترکیب و تحلیل کا کام اس پر چھوڑ دیا گیا کہ جس طرح چاہے اپنی طبیعت کے موافق جوڑ توڑ کرتا رہے جیسا کہ قاعدہ ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا پان مزے نہیں لگتا تو ان کی راحت اور ان کا اعزاز یہی ہے کہ میزبان ان کے آگے پان دان لاکر رکھ دے کہ لو بھائی تم اپنے ہاتھ سے جیسا چاہو بنا لو۔ پس جس طرح پان دان سامنے رکھ دینے کو ہر شخص غایت اعزاز سمجھتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس شخص نے میزبان کی تحقیر کی کہ اس کو پان لگانے کی تکلیف دی اسی طرح تحلیل و ترکیب کو انسان پر چھوڑ دینے سے تکلیف اور بیقدری کا شبہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ حقیقت میں یہ بھی غایت اعزاز ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو ایک سی غذا ایک سے لباس پر مجبور نہیں کیا بلکہ مختلف اقسام و انواع کے استعمال کی اس کو گنجائش دی خاص خاص شرائط و حدود کے ساتھ جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے کیونکہ انسان ایک حالت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اور یہی حکمت ہے عبادات کے تنوع و تعدد میں بھی یعنی حق تعالیٰ نے ہمارے لئے ایک ہی قسم کی عبادت مشروع نہیں فرمائی بلکہ رنگ برنگ کی عبادات ہیں۔ ایک وقت نماز ہے دوسرے وقت تلاوت قرآن ہے ایک وقت تدریس و تعلیم ہے۔ کبھی وعظ و نصیحت ہے۔ کبھی استغفار و درود شریف ہے اور پھر ہر حالت کے مناسب الگ الگ دعا بتلائی گئی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس تاکہ ایک عبادت سے انسان اکتا نہ جائے اور جدید عبادت سے اس کا شوق

بڑھتا رہے دیکھئے پہلے رمضان سردی میں تھا تو لوگ اس سے اُکتاتے تھے کہ میاں یہ بھی کوئی روزہ ہے اُدھارے اُدھارے بیٹھے ہیں نہ بھوک ہے نہ پیاس ہے ذرا سا دن ہے خبر ہی نہیں ہوتی کہ روزہ بھی تھا یا نہیں روزہ تو گرمی کا لطف کا ہے کہ ذرا خبر بھی ہو کہ ہاں روزہ ہے پھر افطار میں شربت کا اور ٹھنڈے پانی کا اور بعض جگہ برف کا اہتمام ہوتا ہے۔ ٹھنڈے کنوؤں کی تلاش ہوتی ہے کہ جس کنویں کا پانی سب سے زیادہ ٹھنڈا ہو اس کا پانی لایا جاتا ہے سردی میں تو یہ باتیں ہوتی تھیں۔ اب جب رمضان گرمی میں آیا تو اس سے بھی گھبرا گئے۔

چنانچہ اب رمضان آنے والا ہے معلوم ہو جائے گا کہ کتنے آدمی روزہ رکھتے ہیں۔ اب یوں کہتے ہیں کہ صاحب رات تو ذرا سی ہوتی ہے۔ تراویح پڑھنے کے بعد سونے کا موقع ہی نہیں ملتا ادھر آنکھ لگی ادھر سحری کا وقت آیا اتنی دیر میں افطار کے وقت کا کھانا پانی بھی ہضم نہیں ہوتا اب سحری میں کیا کھالیں بس سحری کا لطف تو گرمیوں کی رات میں کچھ بھی نہیں۔ پھر دن ایسا پہاڑ کہ گھنٹے گنتے گنتے تھک جاؤ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا پیاس کے مارے کلیجہ نکلا جاتا ہے پھر افطار کے وقت پانی اس بری طرح پیا جاتا ہے کہ تراویح پڑھنا محال ہو جاتا ہے۔

بس گرمیوں میں نہ تراویح کا لطف ہے نہ روزہ کا۔ لیجئے اب گرمیوں کے رمضان کی برائی ہونے لگی۔ غرض انسان کو کسی ایک حالت پر قرار و چین نہیں بس اس کو تو جنت ہی میں جا کر آرام ملے گا۔ مگر وہاں بھی اس کا چلبلا پن نہ جائے گا۔

ایک خدا کے بندے کو بیٹھے بٹھلائے کھیتی کا شوق ابھرے گا بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ جب تجھے بیٹھے بٹھلائے بے مانگے ہر چیز مل رہی ہے پھر تجھے کھیتی کی ضرورت کیا ہے کچھ نہیں صرف وہی چلبلا پن کہ اس سے ایک حالت میں رہا نہیں جاتا جنت میں جو بے محنت و مشقت کھانے کو ملے گا تو آپ کو اپنی وہی حالت یاد آئے گی کہ ایک وقت میں ہم کھیتی کر کے کھایا کرتے تھے۔ یوں ناج بوتے ہل چلاتے کھیتی کاٹتے تھے اب وہ بات ہی نہیں اس لئے اس کو کھیتی کا

شوق ہوگا چنانچہ یہ شوق بھی اس کا پورا کیا جائے گا ادھر دانہ پڑا ادھر پیدا ہوا اور پکا اور تھوڑی دیر میں غلہ کا ڈھیر سامنے آجائے گا پھر ارشاد ہوگا دُوْنَكَ یَا اِبْنِ اٰدَم فَلَنْ یُشْبِعَكَ شَیْئٌ کہ اے ابن آدم لے (یہ کھیتی بھی تیار ہوگئی) مگر تجھے کوئی چیز سیر نہیں کرسکتی۔ قیاس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کوئی گاؤں کا رہنے والا کسان ہوگا جیسے جنت میں بھی کھیتی ہی یاد آئے گی یا ممکن ہے کوئی ایسا شخص ہو جسے دنیا میں بھی سلطنت وراحت ہی ملی ہو اور جنت میں تو جو کچھ ہے سلطنت ہی سلطنت ہے تو اس شخص کو دنیا میں کھیتی کا موقع نہ مل سکا اس نے یہ چاہا کہ لاؤ جنت میں اس آرزو کو پورا کرلوں۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ بعض دفعہ سلاطین غایت تکلیف اور ساز وسامان و فرش وتخت سے گھبرا جاتے ہیں غربا کے گھر جاکر بوریے اور ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بیٹھے اور موٹی جھوٹی روٹی ان سے مانگ کر کھاتے تھے یہ کہتے تھے کہ عیش وآرام اور تکلف سے طبیعت گھبرا گئی اس لئے سادگی کا مزہ چکھنے کے لئے کبھی کبھی جی چاہا کرتا ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ انسان کی طبیعت ایسی چلبلی ہے کہ جس آسائش وآرام کا یہ ساری عمر طالب رہتا ہے جب وہ میسر ہوجاتا ہے تو اس سے بھی اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اسی واسطے خدا تعالےٰ نے انسان کی مرضی و نامرضی پر کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کام اپنے قبضے میں رکھا ہے۔ کیونکہ انسان کی حالت بچوں کی سی ہے۔ اب بچے اگر ایسی ویسی فرمائش کرنے لگیں تو کیا باپ ان کی ہر فرمائش کو پورا کردیا کرتا ہے ہرگز نہیں بلکہ باپ اپنی مرضی کے موافق کام کرتا ہے۔ بچوں کی مرضی پر اگر ہر کام چھوڑ دیا جائے تو اس میں ان کی ہلاکت ہے اور بعض دفعہ اسی خلاف حکمت ہونے کے سبب بچوں کی ضدیں اور فرمائشیں پورا کرنا بھی بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ایسی ضدیں کرتے ہیں کہ والدین کو تنگ کردیتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک بچہ نے رونا شروع کیا پوچھا کیوں روتا ہے

کہنے لگا مٹھائی لوں گا تیسر مٹھائی دیدی پھر رونا شروع کیا بھائی اب کیوں روتا ہے۔ بولا دودھ لوں گا دودھ بھی آگیا۔ اسی طرح بہت سی سوچ کر فرمائشیں کیں اور پوری کردی گئیں اس کو اس وقت مقصود والدین کو عاجز کرنا تھا۔ پھر اس نے رونا شروع کیا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہنے لگا کہ ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپا دو۔ اب اس ضد کو کوئی کیونکر پورا کرسکتا ہے آخر ماں باپ عاجز ہو گئے۔

اسی واسطے بیربل اور اکبر میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تھی اکبر کہنے لگا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے۔ ایک راج ہٹ، ایک تریا ہٹ، ایک **بالک** ہٹ۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا راج ہٹ اور تریا ہٹ کا دشوار ہونا تو مسلم ہوسکتا ہے کیونکہ بادشاہ اور عورت عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی فرمائش کر بیٹھیں جس کا پورا کرنا دشوار ہو لیکن بالک ہٹ کا دشوار ہونا مسلم نہیں کیونکہ بچوں کی ایسی کیا فرمائش ہوگی جو پوری نہ ہوسکے۔ بیربل نے کہا کہ سب سے زیادہ مشکل تو بالک ہٹ ہی ہے اس کو بڑا ہی عاقل پورا کرسکتا ہے ہر شخص پورا نہیں کرتا۔ اکبر نے کہا کہ اس کے لئے عقل کی کیا ضرورت ہے بچوں کی فرمائش کو ہر شخص پوری کرسکتا ہے۔ بیربل نے کہا اچھا ہم بچہ بنتے ہیں آپ میری ضد کو پورا کریں۔ اس نے کہا اچھا۔ اب بیربل بچہ بنا اور بچوں کی طرح سسکنے لگا (اکبر کا دربار ایسا ہی ہوتا تھا وہاں یہی خرافات اکثر رہا کرتی تھیں) غرض اکبر نے پوچھا کیوں روتے ہو۔ بیربل نے کہا ہم تو ہاتھی لینگے۔ اکبر نے فوراً ہاتھی خانہ سے ایک ہاتھی منگوادیا اور کہا سبحان اللہ آپنے بڑی مشکل فرمائش کی بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہا ہم تو کلھیا لیں گے۔ اکبر نے فوراً بازار سے ایک کلھیا بھی منگادی اور کہا بس یہی بڑی مشکل ضد تھی بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو اس کلھیا میں کھڑ اب تو اکبر کی عقل حیران ہوگئی کہ واقعی اس ضد کا پورا کرنا مشکل ہے آخر عاجز ہوگیا اور مان گیا کہ بچوں کی فرمائش کا پورا کرنا مشکل ہے۔ پھر اس نے بیربل سے کہا کہ یہ جو

تم نے کہا تھا کہ عاقل بچوں کی ضد بھی پوری کر سکتا ہے۔ اب میری سمجھ میں جو بات نہیں آتی اس فرمائش کو عاقل کیونکر پورا کر دیگا۔ بیربل نے کہا کہ اگر عقل ہو تو سب آسان ہے۔ اکبر نے کہا اچھا اب ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد کو پورا کرو۔ اس نے کہا بہتر ہے چنانچہ اب اکبر نے سبکنا شروع کیا۔ بیربل نے کہا کیوں روتے ہو آپ نے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے (میاں کو بس یہی سبق یاد تھا گھر کی عقل تو تھی ہی نہیں) بیربل نے ایک آدمی کو بھیجا کہ بازار سے جاکر مٹھائی یا مٹی کا ایک ہاتھی ذرا سا لے آؤ چنانچہ لایا گیا اور اکبر کو دیدیا گیا اب آپ نے پھر رونا شروع کیا پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے کلھیا بھی منگا دی۔ پھر آپ رونے لگے پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھدو اس نے اٹھا کر رکھدیا بس اکبر خاموش ہو گئے۔ بیربل نے کہا کہ یہ آپ کی عقلمندی تھی کہ بچہ کے ہاتھی مانگنے پر آپ نے اتنا بڑا ہاتھی منگا دیا۔ آپ کو چاہئے تھا کہ بچہ کی فرمائش کو اس کی حیثیت کا لحاظ کرکے پورا کرتے۔ الغرض بچے بڑی الٹی الٹی ضدیں کیا کرتے ہیں بعض دفعہ بچہ یہاں تک چاہتا ہے کہ آگ پکڑ لوں۔ سانپ کو ہاتھ میں لے لوں مگر ماں باپ اس کی اس خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح یہ بھی خدا کی رحمت عظیمہ ہے کہ حق تعالےٰ کو ہر فرمائش کے پورا کرنے پر قادر ہے۔ پھر بھی انسان کی خواہش کا اس لئے اتباع نہیں کرتا کہ اس کو حکمت ہی کی خبر نہیں۔ بلکہ انسان کی خواہش کو حق کے تابع رکھا گیا ہے ورنہ بڑا فساد عظیم برپا ہوتا۔ چنانچہ حق تعالےٰ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ۔ الآیۃ۔ (اگر حق تعالےٰ ان کی خواہشات کا اتباع کرتے تو زمین و آسمان سب فاسد ہو جاتے) پس انسان کی مصلحت اسی میں ہے کہ اس کو اسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا ورنہ یہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

(پرنٹنگ محل کراچی)

ایک شخص نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ حق تعالیٰ سے دعا کر دیجئے کہ مجھ کو اپنے متعلق آنے والی بات کی خبر ہو جایا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرما دیجئے کہ تیری مصلحت اسی میں ہے کہ تجھ کو آنے والی بات کی اطلاع نہ ہو اگرے تیری مصلحتوں کو تجھ سے زیادہ ہم جانتے ہیں آپ نے اس شخص کو اطلاع کر دی اس نے پھر اصرار کیا کہ میرا جی بہت چاہتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی جو قبول ہو گئی۔ چنانچہ اس کو آئندہ واقعات کی اطلاع پہلے ہی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کو معلوم ہوا کہ میرا گھوڑا مرنے والا ہے اس نے جلدی سے بازار میں جا کر اسے فروخت کر دیا اور نفع سے فروخت کیا اور اپنے جی میں بہت خوش ہوا کہ دیکھو اس علم سے میرا کتنا بڑا نفع ہوا کہ جانور میرے گھر میں نہیں مرا دوسرے کے یہاں جا کر مرے گا اور مجھے اس کی قیمت مع شئے زائد وصول ہو گئی۔ پھر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اب میرا غلام مرنے والا ہے اس نے غلام کو بھی جا کر فروخت کر دیا اور اپنے دل میں بہت ہی خوش ہوا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ اب میں خود مرنے والا ہوں اب تو بڑا پریشان ہوا کہ اپنے کو کہاں جا کر چھپا دوں آخر موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوڑا ہوا آیا کہ شاید وہ اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت بتلا دیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرما دیجئے کہ اس نے اپنی موت اپنے ہاتھوں خریدی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی تقدیر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس عرصہ میں اس کے گھر پر ایک مصیبت نازل ہو گی ہم نے اول اس کے جانور پر ڈالنا چاہا۔ اس نے ہوشیاری کر کے اس کو اپنے سے الگ کر دیا۔ پھر ہم نے اس کے غلام پر اس کو ٹالنا چاہا اس نے اس کو بھی بیچ کر نفع حاصل کر لیا اب خود ہی رہ گیا ہے لہٰذا اب وہ مصیبت اس کے اوپر ضرور آوے گی ٹل نہیں سکتی۔ اس سے کہہ دیجئے کہ بس اب حسنِ خاتمہ کی دعا کرے موت ضرور آوے گی۔

تو آپ نے دیکھا کہ انسان کی مرضی پر کام چھوڑنے کا کیا نتیجہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لے لی۔ پس حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ سب کام اپنے قبضہ میں رکھا اور ہم کو کچھ بھی خبر نہیں دی کہ کل کو کیا ہونے والا ہے۔ لوگ علمِ غیب کی تمنا کیا کرتے کشف کو کمال سمجھتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ وبال جان ہو جاتی ہے۔ شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں تو علم غیب کو استکثار خیر و دفع مضرت کا سبب بتلایا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ کشف بعض دفعہ وبال جان ہو جاتا ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ

(ترجمہ) اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو خیر بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی مضرت نہ پہونچتی۔ اس کے چند جوابات ہیں اول تو یہ کہ آیت میں قضیہ کلیہ نہیں ہے بلکہ جزئیہ ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ خیر ہی خیر حاصل ہوتی اور شر مس بھی نہ کرتا (دوسرے یہ کہ آیت میں غیب سے مراد جمیع الغیب ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر مجھ کو غیب کا علم محیط حاصل ہوتا الخ اور ظاہر ہے کہ غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر و رفع مضرت کا ضرور سبب ہو سکتا ہے اور اس قصہ میں جو اس شخص کو مصیبت پیش آئی اس کا سبب یہ تھا کہ اس کو علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ اخیر تک کی سب حالت معلوم ہو جاتی تو وہ جان لیتا کہ اگر میں گھوڑے اور غلام کو فروخت کروں گا تو پھر یہ بلا میرے اوپر آوے گی)

پس کشف کے بعض دفعہ وبال جان ہونے پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ کشف میں علمِ محیط نہیں ہوتا ادھورا علم ہوتا ہے اور علم محیط بشر کے لئے حاصل ہونا محال بھی ہے اور اس جگہ اس سے بحث ہی نہیں بلکہ جس قدر غیب کا علم انسان کو ہو سکتا ہے اس کے متعلق میں نے یہ کہا تھا کہ بعض دفعہ وہ وبال جان ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں۔ خوب سمجھ لو یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر انسان کے لئے پکی پکائی روٹی اور سلے سلائے کپڑے

پیدا ہوا کرتے تو وہ گھبرا جاتا کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں اچکن پیدا ہونا اور آپ کا جی قمیص کو چاہتا ہو۔ دوسرے وقت میں پاجامہ پیدا ہوا اور آپ کی طبیعت لنگی کو چاہتی ہے۔ اور انسان اس سے بھی گھبرا جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے سر پر سوار ہو جائے۔ اب خدا کا شکر ہے کہ اس کے سر پر سوار کوئی چیز نہیں وہ جیسا چاہے خود بنا سکتا ہے اور اگر کسی چیز کی ضرورت نہ ہو تو یہ بھی اختیار ہے کہ کچھ نہ بنائے یہ حکمت ہے اس میں کہ حق تعالیٰ نے تحلیل و ترکیب کا کام انسان پر چھوڑ دیا ہے سر پر سوار ہونے سے مجھے اپنا ایک قصہ یاد آیا ایک صاحب نے جو کہ میرے دوست کے بیٹے ہیں میری دعوت کی تھی وہ بندۂ خدا کھانا کھاتے ہوئے میرے سر پر سوار ہو گئے بار بار مجھے ٹوکیں کہ مولانا آپ تو بہت کم کھاتے ہیں اچھی طرح کھائیے تکلف نہ فرمایئے اب وہ تو مجھے زیادہ کھانے کو فرما رہے تھے مگر میری یہ حالت کہ جب مجھے اس کا تصور آتا کہ میزبان میرے لقموں کو دیکھ رہا ہے مجھ سے غیرت کی وجہ سے لقمہ نہ ٹوٹتا آخر کار میں بھوکا ہی رہا اور اپنے گھر آ کر میں نے دوبارہ کھانا کھایا۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے میری دعوت کی وہ ہر چیز مجھے اپنے آپ کھلاتے تھے مگر میری طبیعت اندر سے گھٹتی جاتی تھی۔

یہ آداب معاشرت کے بالکل خلاف ہے۔ میزبان کو چاہیئے کہ مہمانوں کو کھاتے ہوئے ہرگز نہ گھورے۔ بس سرسری نگاہ سے اتنا معلوم کرتا رہے کہ کہاں کس چیز کی ضرورت ہے۔ باقی نہ اس سے کہے کہ آپ کم کھا رہے ہیں نہ یہ کہے کہ آپ تکلف کر رہے ہیں کیونکہ جب مہمان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میزبان میرے لقمے دیکھ رہا ہے تو اس سے بالکل نہیں کھایا جاتا۔

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دسترخوان پر ایک بدوی بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا اور دیہاتیوں کی طرح بڑے بڑے لقمے بنا رہا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے خیر خواہی کے طور پر اتنا فرما دیا کہ اے شخص اپنی جان پر رحم کر اور لقمہ چھوٹا لے تا کہ گلے میں نہ اٹک جائے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ بدوی فوراً دسترخوان سے

اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت معاویہؓ سے خطاب کر کے کہا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارا کھانا کھاوے۔ تم مہمانوں کے لقموں کو تکتے ہو کہ کون چھوٹا لیتا ہے کون بڑا۔ تم کو اس سے کیا غرض تم کو دستر خوان پر مہمانوں کو بٹھلا کر پھر اپنے کھانے کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا چاہیئے۔ یہ کہہ کر چلتا ہوا۔ ہر چند حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا کہ کھانا اچھی طرح کھا کر جانا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا میں بیان یہ کر رہا تھا کہ انسان کی مثال معزز مہمان جیسی ہے کہ جس طرح اس کی آمد سے پہلے تمام ضروریات کا انتظام کر دیا جاتا ہے اسی طرح حق تعالےٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے تمام عالم کو اسی کی خاطر اور اسی کے واسطے پیدا کیا پھر جب انسان ہلاک ہو جائے گا تو سارا عالم بھی ہلاک ہو جائے گا۔ کیونکہ جس کے لئے یہ سازوسامان تھا جب وہی نہ رہا تو اس کے رہنے میں کیا فائدہ۔ حق تعالےٰ نے آسمان وزمین کو تو پہلے پیدا کیا ہی جنت کو بھی پہلے ہی پیدا کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت اس عالم کے بعد انسان کو ہو گی کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا اور اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میرا اصلی گھر جہاں ہر قسم کی راحت وآسائش ہے اس وقت موجود ہے تو اس کو اُدھر زیادہ رغبت ہو گی اور دنیا میں اس کا دل نہ لگے گا اور اگر اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ جنت تو ابھی بنی بھی نہیں دنیا کے فنا ہونے کے بعد بنے گی تو اکثر طبائع کو عالم آخرت کی طرف رغبت نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو کم ہوتی کیونکہ معدوم کی طرف رغبت ہونا انسان کے طبائع میں نادر ہے گو وہ معدوم کیسا ہی یقینی الوجود ہو۔ اور اب جس وقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد پر نظر پڑتی ہے أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ کہ جنت خدا سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقویٰ کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی بعد میں پیدا ہو گی اور وہ اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ابھی سے اس کا پیدا ہونا عبث ہے اور خدا تعالےٰ فعل عبث سے پاک ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (تیار کی گئی ہے خدا سے

ڈرنے والوں کے لئے۔) رد کر رہی ہے کیونکہ صیغۂ ماضی کو مستقبل کے معنے میں لینا مجاز ہے حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہو اور بلا وجہ معنی مجازی لینا جائز نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کیونکہ میں نے ابھی اس کی حکمت بتلادی ہے جس کو دوبارہ اعادہ کرتا ہوں۔ وہ حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالےٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنا رہے ہیں کہ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ (جنت متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے) اور اگر پیدا نہ ہوتی تو بجائے اس کے یہ فرماتے تُعَدُّ لِلْمُتَّقِیْنَ (یعنی جنت متقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعۃ میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شئے موجود کی طرف رغبت ہے اور اس وقت شئی معدوم کی طرف رغبت ہوتی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آگئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ الغرض سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (کام میں لگا دیا ہے تمہارے نفع کے لئے تمام چیزوں جو آسمان و زمین میں ہے) میں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے تمام عالم کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے۔ اور وہ معنے مراد نہیں جو تسخیر کے لفظ سے محاورۂ اردو میں متبادر ہوتے ہیں اور اس کے ضمن میں حق تعالےٰ نے توحید کی دلیل بیان فرمائی ہے۔ اصل مقصود آیت کا توحید ہی ہے گو تبعاً دوسرے مضامین کی طرف بھی اشارہ ہوگیا ہے۔

حاصل استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں تو معبود بھی وہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ معبود کے لئے کامل الصفات و جامع الکمالات ہونا ضروری ہے اور خلق بہت بڑی صفت کمال ہے پس جو خالق نہیں وہ معبود بھی نہیں ہوسکتا اور جو خالق ہوگا وہ یقیناً تمام صفات کمال کا جامع ہوگا کیونکہ خلق کے معنے اعطاء وجود کے ہیں اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں۔ پس جو ذات معطئ وجود ہے یقیناً اس کے قبضہ میں

خزائن وجود ہیں اور جس کے قبضہ میں وجود کے خزائن ہوں وہ تمام صفات کمال کا جامع ہوگا۔ اسی لئے حق تعالٰے نے اکثر مواقع میں توحید کی دلیل میں صفت خالقیت کو بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ صفت خالقیت تمام کمالات کو مستلزم ہے۔ حق تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں زیادہ دقیق دلائل نہیں بیان فرمائے بلکہ نہایت سہل سہل دلائل بیان فرمائے ہیں جن کو تھوڑی سی عقل والا بھی بہت جلدی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ صرف خالقیت سے توحید کو ثابت فرمایا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تدقیقات سے مخاطب ساکت تو ہوجاتا ہے مگر اس کی تسلّی نہیں ہوتی اور سہل عنوانات سے تسلی خوب ہوجاتی ہے جیساکہ اس آیت میں کتنا سہل عنوان ہے کہ کیا تم نے اس بات کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالٰے نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اُن تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہے۔ اس عنوان سے ہر شخص کا ذہن توحید کی طرف جلد منتقل ہوجاتا ہے۔ اگر منطقی استدلالی طرز ہوتا تو اس سے اس درجہ تسلی نہ ہوسکتی۔ اس جگہ شاید کوئی یہ سوال کرے کہ حق تعالٰے کا خالق ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے وجود صانع تو معلوم ہوجائے اور اس دلیل سے وجود صانع ثابت نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ عرب دہری نہ تھے وہ محض مشرک تھے وجود صانع کا وہ انکار نہ کرتے تھے اس لئے وجود صانع کو ثابت کرنے کا قرآن نے اہتمام نہیں کیا۔ ہاں علمائے اسلام نے جب دہریوں کا بھی ایک فرقہ اسلام کے مقابل دیکھا تو انہوں نے وجود صانع پر بھی دلائل قائم کئے۔ اہل عرب کا دہری نہ ہونا قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔

(اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین۔ تو وہ یہ ضرور کہیں گے اللہ نے)

اور اس قسم کا مضمون قرآن میں جا بجا مذکور ہے۔ پس جب اہلِ عرب صانع کے قائل تھے

اور شرک میں مبتلا تھے تو ان کے واسطے دلائل توحید ہی کی ضرورت تھی چنانچہ سارا قرآن دلائل توحید سے بھرا ہوا ہے لیکن وہ دلائل منطقی طرز پر صغریٰ و کبریٰ و حد اوسط وغیرہ سے مرکب نہیں ہیں۔ یہ میں نے اس واسطے کہدیا تاکہ کوئی معقولی یہ نہ کہے کہ ہم نے تو سارا قرآن دیکھ لیا ہم کو تو ایک جگہ بھی دلیل عقلی نہیں ملی سو بات یہ ہے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن کا طرز دلائل کے بارہ میں استدلال منطقی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اکثر دلائل قرآن کے اقناعی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اقناعی ہی ہیں بلکہ محض طرز کے اعتبار سے اقناعی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب دلائل عقلیہ ہیں جو طرز عقلی پر بخوبی منطبق ہو سکتے ہیں بالخصوص دو موقعوں میں تو یہ انطباق بہت ہی ظاہر ہے ایک سورۂ بقرہ کی اس آیت میں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ہیر پھیر اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لئے ہوئے سمندروں میں چلنا آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا ہواؤں کے رُخ بدلنا تابع فرمان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان اِدھر اُدھر پھرنا عقلمندوں کے لئے قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں)

اس آیت میں چونکہ لفظ یَعْقِلُوْنَ موجود ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دلیل عقل کے مطابق ہے اس لئے مفسرین کو موقع مل گیا کہ انھوں نے طرز عقلی پر اس کا انطباق خوب بیان کیا۔ دوسرا موقع اس آیت میں ہے لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ (اگر ان زمین و آسمان میں چند معبود ہوتے تو البتہ فاسد ہو جاتے)

(حاصل[عه] اس دلیل عقلی کا یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں۔ بعض تو بداھۃً بوجہ مشاہدہ کے کیونکہ بعض کی نسبت ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال میں تغیر و تبدل کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور بعض چیزیں اجزاء سے مرکب ہیں یہ بھی امکان کی علامت ہے اور بعض اشیاء بعض کی محتاج ہیں اور احتیاج بھی ممکن کا خاصہ ہے۔

غرض یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور ممکن کا وجود و عدم چونکہ برابر ہوتا ہے اس لئے وہ کسی مرجح کا محتاج ہے۔ وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا اور اس کے وجود کے لئے بھی کسی مرجح کی ضرورت ہوگی وعلی ہذا القیاس اور تسلسل محال ہے اس لئے اس کو قطع کرنے کے لئے کسی جگہ یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح واجب الوجود ہے (جس کا وجود ضروری اور معدوم ہونا محال ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی اب رہا اس کا واحد ہونا سو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ واجب الوجود متعدد مثلاً دو مانے جاویں تو آیا ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر کامل ہونا ضروری پہلی شق محال ہے کیونکہ عاجز ہو سکنے والا واجب الوجود نہیں ہو سکتا اور دوسری شق پر یہ سوال ہے کہ اگر ان میں سے ایک نے کسی کام کا ارادہ کیا۔ مثلاً زید کے موجود کرنے کا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ وجوب وجود کے منافی ہے اور اگر خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے تو اس کے ارادہ پر مراد کا مرتب ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادر مطلق کے ارادہ سے مراد کا تخلف لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آویگا۔

[عه] وعظ میں یہ دلیل اس تفصیل سے بیان نہ ہوئی تھی محض اشارہ کیا گیا تھا احقر جامع نے تفسیر بیان القرآن مصنفہ حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم سے اس کو مفصل نقل کر دیا ہے۔

مع تغییر یسیر فی العبارۃ روما للتسہیل ۱۲ جامع

کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر اس کی مراد یعنی زید کا وجود مرتب ہوگا اور دوسرے کے ارادہ پر اس کی مراد جو کہ پہلے کی ضد ہے یعنے زید کا عدم مرتب ہوگا اس صورت میں اجتماع ضدین لازم آوے گا جو کہ محال ہے پس واجب الوجود کا متعدد ہونا ہی محال ہے پس ثابت ہوگیا کہ واجب الوجود ہمیشہ واحد ہی ہوگا اور یہی مقصود ہے خوب سمجھ لو، اس جگہ ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اس طرز استدلال سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ توحید کی دلیل کے لئے مطلقاً کسی مصنوع کا بیان کر دینا کافی تھا مگر حق تعالےٰ نے ان مقامات پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں کا بیان فرمایا ہے جو علاوہ مخلوق و مصنوع ہونے کے ہمارے حق میں نعمت بھی ہیں جس سے حاصل یہ ہوا کہ عبادت جس کی فرد اعظم توحید ہے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدا کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں اور اس لئے بھی فرض ہے کہ منعم بھی حق تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں گویا اس طرح دلیل عقلی کے ساتھ ایک داعی طبعی بھی بیان فرما دیا کیونکہ منعم کے احسان کا ماننا اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا طبعی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے تو خدا تعالےٰ کے انعامات پر نظر کر کے طبعی مؤثر سے تو متاثر ہونا چاہیئے اس نکتہ کی وجہ سے تمام قرآن میں جہاں توحید کی دلیل کا ذکر ہے وہاں نعمتوں کا ذکر ضرور ہے چنانچہ اس آیت میں سَخَّرَ لَكُمْ میں لآم منفعت سے انعام کی طرف اشارہ ہے اور آگے تو بالکل تصریح ہی کر دی وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط اور کامل کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی ہیں اس میں نعمت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں نعمت ظاہرہ وہ ہے جو حواس ظاہرہ یا باطنہ سے محسوس ہو اور نعمت باطنہ وہ ہے جو عقل سے معلوم ہو یا یہ جو حواس ظاہرہ سے محسوس ہو وہ ظاہرہ ہے اور جو حواس باطنہ و عقل سے معلوم ہو وہ باطنہ ہے بہرحال اس میں نعمتوں کا اجمالاً پوری طرح احاطہ کر دیا گیا اور یہ بھی حق تعالےٰ کی رحمت ہے کہ انھوں نے نعمت کی تقسیم ظاہر فرما دیں ورنہ نِعَمَ بَاطِنَہ (باطنی نعمتوں

کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی کیونکہ اس تقسیم کے بعد بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو نعم باطنہ کو نعمت ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ نعمت سمجھتے بھی ہیں وہ نعم ظاہرہ کی برابر ان کی قدر نہیں کرتے چنانچہ نعمت باطنہ یہ بھی ہے کہ حق تعالےٰ نے آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائی جس کا فرد اعظم اسلام ہے۔ اب ذرا انصاف سے بتلایئے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی زبان سے یوں کہا ہو کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو اسلام کی دولت عطا فرمائی۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے۔ اسی طرح علم اور حب فی اللہ۔ بغض فی اللہ۔ توکل و رضا وغیرہ یہ سب نعم باطنہ ہیں ان پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور یہ حال تو اس پر ہے کہ حق تعالےٰ نے نعم باطنہ کی طرف متوجہ بھی فرمایا ہے اور اگر وہ نعمت کی تقسیم نہ فرماتے تو شاید کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰہ (مگر جس کو اللہ چاہے) اور ایک بہت بڑی فہرست نعمتوں کی ہماری نظر سے غائب ہو جاتی چنانچہ خود عقل بھی ایک نعمت ہے جو کہ ایک نور کا نام ہے جو انسان کو حق تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مدرک کلیات ہے اور یہ بھی نعم باطنہ میں داخل ہے۔ باطنہ فرمانے سے اس پر تنبیہ ہو گئی اور اس پر تنبیہ کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ بعض لوگ عقل کے منکر ہیں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کے اندر عقل نہیں ہے حالانکہ جانور اور انسان میں فرق ظاہر ہے مگر یہ خدا کے بندے پھر بھی عقل کے منکر ہیں اس کا عقلی جواب تو ہے ہی مگر لطیفہ کے طور پر ایک جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کا حال خوب جانتا ہے تو وہ جو عقل کے منکر ہیں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں سو ان میں واقعی عقل نہ ہو گی اور ہم کو اپنے گھر کا حال معلوم ہے اور ہمارے اندر عقل ہے ہم کو خود اپنا حال معلوم ہے اس لئے ہم عقل کے منکر نہیں ہیں۔ یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ ایک بزرگ نے معتزلہ کے جواب میں بطور لطیفہ کے فرمایا ہے کہ معتزلہ جو رؤیت الٰہیہ کے آخرت میں منکر ہیں وہ بھی صحیح کہتے ہیں۔ ان کی بات کو رد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بے چارے اپنا حال بیان

کر رہے ہیں کہ ہم آخرت میں رؤیت الٰہیہ سے محروم رہیں گے سو وہ اس نعمت سے محروم ہیں اس لئے وہ انکار میں معذور ہیں اور اہل سنت والجماعت جو رؤیت کے قائل ہیں وہ اپنا حال بیان کر رہے ہیں سو ان شاء اللہ ہم کو دیدار ہوگا اس لئے ہم اس کے قائل ہیں۔ الغرض عقل کے وجود میں بھی بعض لوگوں نے کلام کیا ہے اس لئے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نعمت پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال عقل کے وجود پر دلیل صحیح اور کشف موجود ہے جس سے معلوم ہو گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نور ادراک ایسا ہے جو حیوانات کے اندر نہیں ہے اور اسی سے انسان حیوانات وغیرہ سے ممتاز ہے اور یہ عقل انسان کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتی ہے جو ابتداء میں اپنا کام نہیں کرتی کیونکہ بچپن میں تمام قوی باطنہ قوی ظاہرہ کی تدبیر بدن میں مصروف ہوتے ہیں اس لئے پیدا ہونے کے ساتھ ہی عقل اپنا کام نہیں کرتی پھر جوں جوں بدن کی قوت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر عقل اپنا کام کرتی ہے حتیٰ کہ بلوغ کے وقت شرعاً وہ کامل ہو جاتی ہے اسی لئے شریعت نے بالغ کو احکام کا مکلف بنایا ہے اس پر یہ اشکال نہ ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ابتداء بلوغ میں بھی اکثر لوگوں کو پوری عقل نہیں ہوتی۔ پوری عقل تو ۳۰ یا ۴۰ سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلوغ کے وقت عقل تو کامل ہو جاتی ہے لیکن تجربہ کم ہوتا ہے۔ اور ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں تجربہ بھی کافی ہو جاتا ہے اس عمر میں کچھ عقل نہیں بڑھتی بلکہ تجربہ بڑھ جاتا ہے لیکن تجربہ کی وجہ سے اس کی باتوں میں اور اعمال میں پختگی اور استواری پیدا ہو جاتی ہے اس سبب سے لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں عقل زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمر میں عقل ہی بڑھ جاتی ہو۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آیا کہ بلوغ کے وقت عقل کامل نہیں ہوتی۔ بس یوں کہنا چاہیئے کہ بلوغ کے وقت اتنی عقل ضرور ہو جاتی ہے کہ احکام الٰہیہ کو اور اپنے نفع و نقصان کو سمجھ سکے پھر اس کے بعد دن بدن عقل کو ترقی ہوتی رہتی ہے مگر وہ ترقی تکلیف احکام کا موقوف علیہ نہیں کلفا

ہونے کے لئے وہی مقدار عقل کافی ہے جو بلوغ کے وقت عموماً ہوتی ہے اور یہاں سے منکرین معاد کی ایک غلطی معلوم ہوئی وہ یہ کہ بعض لوگ معادیات کا انکار اس لئے کرتے ہیں کہ وہ امور محسوسہ نہیں ہیں مثلاً جنت دوزخ کا انکار اس لئے کہتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ نہیں ہوا تو ان کو اس تقریر سے سمجھنا چاہیئے کہ بعض امور متفق علیہا مسلم عند الکل بھی ایسے ہیں جن کے وجود کا محض دلیل سے اعتقاد کیا گیا ہے اور ان کا مشاہدہ کسی نے آجتک نہیں کیا جیسے عقل اور روح وغیرہ کہ منکرین معاد بھی ان کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اب اگر ہر چیز کا وجود مشاہدہ کے بعد ہی تسلیم کیا جایا کرے تو پھر یہ لوگ عقل وروح کے وجود کے کیونکر قائل ہوگئے پس معلوم ہوا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا وجود یقینی ہے مگر مشاہدہ محسوس نہیں۔ اسی طرح جنت ودوزخ وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان اشیاء کا وجود بھی دلیل صحیح سے ثابت ہے لہذا اس کو تسلیم کرنا لازم ہے گو مشاہدہ کسی نے نہ کیا ہو اور جس طرح عقل نعم باطنہ میں سے ہے اسی طرح بعض علوم بھی جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے نعم باطنہ میں سے ہیں جیسے تمام علوم عقلیہ گو وہ منقول ہی ہوں ان کا ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے حواس سے نہیں ہوسکتا کیونکہ نقل میں الفاظ کا ادراک سمع سے ہوتا ہے اور نقوش کا بصر سے لیکن معانے کا ادراک تو عقل ہی سے ہوتا ہے اور علوم نام معانی ہی کا ہے اسی طرح جس قدر باطنی حالات وکیفیات واخلاق ومقامات ہیں وہ بھی سب نعم باطنہ میں داخل ہیں اور یہ سب ظاہری اور باطنی نعمتیں حق تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں ان کے سوا صانع وخالق اور منعم کوئی نہیں۔ پس معبود بھی ان کے سوا کوئی نہیں یہ حاصل ہے توحید کی دلیل کا آگے حق تعالیٰ منکران توحید کی شکایت فرماتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝

یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جدال کرتے ہیں۔ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں) سے مراد يُجَادِلُ فِيْ تَوْحِيْدِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارہ میں جدال کرتے ہیں) مضاف مقدر ہے یعنی خدا کی توحید میں

جھگڑا کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور ان دلائل بینہ میں غور نہیں کرتے۔ اس آیت میں منکران توحید کی متعدد مذمتیں مذکور ہیں چنانچہ اول تو جدال ہی فی نفسہ مذموم ہے کیونکہ ہر چند کہ بظاہر جدال کی دو قسمیں ہیں ایک جدال بحق ہے ایک جدال بالباطل جیساکہ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (ان سے احسن طریقہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ جدال بحق کرو) سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال کا اطلاق جدال بحق پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کے تتبع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جدال اور جَدَل کا اطلاق اکثر جدال بالباطل پر ہی ہوتا ہے یہ بات سارے قرآن کو دیکھ کر بھی نہ ٹوٹے گی۔ اور جہاں جدال بالحق پر جدال کا اطلاق آیا ہے وہ اطلاق صورت جدال پر مشاکلۃً ہے کیونکہ خواہ جدال بالحق ہو یا بالباطل صورت دونوں کی ایک سی ہوتی ہے۔ جیسا مشاکلۃً جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے) فرمایا گیا کیونکہ صورۃً دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ صورت کے یکساں ہونے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک مولوی صاحب کی دستار بندی ہوئی تھی مگر وہ کسی قابل نہ تھے کتابیں سمجھ کر نہ پڑھی تھیں۔ دستار بندی کے وقت استاد سے کہنے لگے کہ اس وقت تو لوگ مجھے فاضل سمجھیں گے مگر میں حقیقت میں مد فاضل ہوں اگر لوگ مجھ سے مسائل دریافت کرنے لگے تو میں کیا کروں۔ استاد نے کہا کہ میں ایسی ترکیب بتلاتا ہوں جس سے تمہاری رسوائی نہ ہوگی بلکہ اور وقعت بڑھ جاوے گی۔ تم ہر سوال کے جواب میں یہ کہدیا کرنا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اس کے بعد کچھ نہ کہنا ورنہ قلعی کھل جائے گی۔ تو اب دیکھئے یہ جواب ایسا ہے کہ اس کو بڑا محقق وسیع النظر بھی بیان کر سکتا ہے اور ایک جاہل بھی کہہ سکتا ہے ظاہر میں دونوں کے جواب یکساں ہوں گے۔ لیکن حقیقت شناس فرق کو سمجھ لے گا اسی طرح جدال بالحق و بالباطل کی صورت یکساں ہوتی ہے اس لئے دونوں پر جدال کا اطلاق یکساں کر دیا جاتا ہے مگر حقیقت دونوں کی بالکل جدا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ میں آخر ان مولوی صاحب کی قلعی ایک دن کھل ہی گئی بات یہ ہے کہ سمجھنے والے لب و لہجہ سے سمجھ جاتے ہیں کہ اس قول کا منشا تحقیق اور وسعت نظر ہے یا جہل محقق کے

لہجہ میں جرأت اور استغنا کی شان ہوتی ہے اور ناقص اگر بڑی بات منہ سے نکالیگا تو اس کے لہجہ میں پستی اور کم ہمتی نمایاں ہوگی وہ محقق کی طرح جرأت کے ساتھ ایسی بات نہیں کہہ سکتا اس لئے کوئی پرکھنے والا سمجھ گیا کہ یہ مولوی صاحب جو ہر بات میں یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کچھ آتا واتا نہیں محض ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ اس نے امتحان کے طور پر پوچھا کہ مولانا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے بارے میں کیا تحقیق ہے تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے بس ان کو یہی ایک جواب یاد تھا۔ جیسے ایک طوطی کا قصہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کسی شخص نے اس کو یہ لفظ یاد کرا دیا تھا دریں چہ شک (اس میں کیا شک) اور بازار میں آکر دعویٰ کیا کہ یہ طوطی فارسی زبان جانتی ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ ایک شخص نے اس کو خریدنا چاہا مالک نے بہت قیمت بتلائی اس نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تو اس قیمت کے لائق ہے جو یہ شخص مانگتا ہے۔ اس نے وہی کہا دریں چہ شک۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ واقعی طوطی فارسی خوب جانتی ہے دیکھو کیسا برمحل جواب دیا ہے۔ اب تو خرید کر گھر لے گئے اور اس سے باتیں کرنے بیٹھے تو وہ ہر بات کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہتی چلی جاتی ہے موقع ہو یا نہ ہو آخر اس نے جھلا کر کہا کہ میں نہایت ہی احمق تھا جو اتنی رقم کثیر خرچ کر کے تجھ کو لایا اور دھوکہ میں آگیا۔ اس نے اس کے جواب میں بھی یہی کہہ دیا دریں چہ شک خیر یہاں تو جواب برمحل ہوگیا گو اس نے قصد نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ان مولوی صاحب کو بھی بس اتنا ہی یاد تھا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے حتیٰ کہ آپ نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو بھی اختلافی بتلایا اگرچہ فی نفسہ یہ بھی صحیح تھا کیونکہ کفار کو توحید رسالت میں بھی اختلاف ہے لیکن مسلمان کے استفتاء کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے تو اس میں تو ائمہ مذاہب کا بھی اختلاف مراد ہوتا ہے۔ بس اب تو لوگوں میں ان مولوی صاحب کی خوب ہی قلعی کھلی کہ یہ کون جاہل ہے جو کلمہ شریف کو بھی اختلافی بتلاتا ہے اسی کے مشابہ ایک اور حکایت مجھے یاد آئی۔ کانپور میں عبدالرحمن خاں صاحب

مالک مطبع نظامی کا ایک ملازم تھا وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ جب تم حج کو چلو تو مجھ کو بھی ساتھ لے چلنا میں نے اس سے کہا کہ پہلے تم کچھ عربی سیکھ لو تا کہ وہاں کی زبان سمجھ سکو۔ وہ بے چارہ عربی سیکھنے پر بھی راضی ہوگیا میں نے اس کو اول یہ لفظ سکھایا۔ هَاتِ الْحَجَرَ (ڈھیلے لا) اور یہ کہدیا کہ جب میں یہ لفظ کہا کروں تم اسی وقت استنجا کے واسطے مجھے ڈھیلا لا دیا کرو۔ وہ بیچارہ روز اس پر عمل کرتا۔ ایک دن مجھے استنجا کی ضرورت تھی اس لئے میں نے ڈھیلا نہ مانگا تو آپ خود ہی کہتے ہیں مولوی صاحب هَاتِ الْحَجَرَ میں نے کہا سبحان اللہ بندر کے ہاتھ لگی ہلدی کی گرہ اس نے کہا میں ہی پنساری ہوں۔ اب آپ نے هَاتِ الْحَجَرَ کیا سیکھا ہے کہ ہر جگہ اسی کا استعمال شروع کردیا۔ امر کا صیغہ استفہام میں برت رہے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ جہاز میں بنگالی لوگ آکر اپنی زبان میں کچھ سوالات کرتے جس کو میں نہ سمجھتا اور ان کو یہ بھی نہ سمجھا سکتا کہ میں نہیں سمجھا۔ آخر میں نے ایک اردو داں بنگالی سے کہا کہ مجھے اتنا بنگلہ سکھا دو کہ جب کوئی ایسا بنگالی مجھ سے بنگلہ میں باتیں کرے تو میں اس سے یہ کہدوں کہ میں بنگلہ نہیں سمجھتا انھوں نے کہا کہ تم یوں کہدیا کرو بنگالی بوزی نا یعنی بوجھی نا (اور سننے میں بوزینہ آتا ہے جس کے معنے فارسی کے اعتبار سے بہت برُے ہیں) تو مجھے ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ میں بنگالیوں سے یہی کہدیا کرتا بنگالی بوزینہ اور اس میں میرے نفس کی شرارت بھی مضمر ہوتی تھی مگر ایک بنگالی نے مجھے خوب ہی جواب دیا جب میں نے اس سے کہا بنگالی بوزینہ تو اس نے بیساختہ جواب دیا ہندوستانی بوزینہ یعنی میں اردو نہیں سمجھتا۔ الغرض جدال بالحق کو مشاکلۃً جدال کہدیا گیا ہے۔ مجھے مشاکلت پر ایک اور مسئلہ یاد آگیا وہ یہ کہ انبیاء و اولیاء پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہے حقیقت مصیبت نہیں کیونکہ مصیبت کے بارہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہونچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے اس پر اشکال ہوتا ہے کہ انبیاءؑ و اولیاء پر بھی تو مصیبت آئی ہے تو کیا

اُن پر بھی گناہوں کے سبب سے آئی ہے۔ اس کا ایک جواب تو تسلیمی ہے کہ ہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق خطا سے کون خالی ہے۔ لیکن یہ جواب اولیاء کے بارہ میں توصحیح ہے۔ انبیاء کے بارہ میں بے تکلف جاری نہیں ہو سکتا کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے جو کچھ خطا ہوتی ہے وہ اجتہادی خطا ہے جس پر ان کو ثواب ملتا ہے تعمد معصیت کی ان میں ہرگز گنجائش نہیں اس لئے وہاں یہ کہنا کہ مصائب کا سبب ان کی خطائیں ہیں بہت بعید ہے بلکہ ان کی مصائب کا سبب محض رفع درجات ہے تو مَا اَصَابَكُمْ کا خطاب صرف عصاۃ کو ہوگا چنانچہ مَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ اس کا قرینہ ہے۔ اس لئے دوسرا جواب سب سے لطیف یہ ہے کہ یہ بالکل سچ ہے کہ مصیبت گناہوں ہی کی وجہ سے آتی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مصیبت کہتے کس کو ہیں۔ مصیبت وہ ہے جس سے پریشانی اور انقباض لاحق ہو اور انبیاء و اولیاء بیماری وغیرہ سے پریشان اور منقبض نہیں ہوتے تو یہ بیماری اور فاقہ اور تنگدستی وغیرہ ان کے حق میں مصیبت ہی نہیں بلکہ راحت ہے جیسے کوئی معشوق پیچھے سے آکر اپنے عاشق کو بغل میں دبالے اول اول تو اس کو کلفت معلوم ہو گی۔ لیکن جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ دبانے والا محبوب ہے اس وقت ساری کلفت دور ہو جائے گی اور چاہے گا کہ تھوڑی دیر اور دبائے رہے۔

حدیث میں زاہر صحابی رضی اللہ عنہ کا قصہ وارد ہے۔ یہ دیہات کے رہنے والے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دیہات کی چیزیں لایا کرتے تھے اور آپ ان کو شہر کی چیزیں عطا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مذکور ہے زَاهِرٌ بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ (زاہر دیہاتی ہے اور ہم شہری ہیں)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ یہ بازار میں جارہے تھے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے تشریف لاکر ان کو دبا لیا۔ اول تو زاہر ڈر کے گھبرائے کہ یہ کون ہیں جب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو حدیث میں آتا ہے کہ پھر تو زاہر اپنی کمر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے خوب لگانے لگے تاکہ جسدِ اطہر

سے مس ہوکر برکت حاصل ہوجائے پھر آپ نے فرمایا کہ کوئی اس غلام کو خرید تا ہے وہ کہنے لگے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ مجھے فروخت کریں گے تو مجھے بہت کھوٹا پائیں گے میرا کوئی بھی گاہک نہ ملے گا آپ نے فرمایا لیکن تم خدا کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو تو کیا کوئی ایسا کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دبا لینے سے حضرت زاہر کو کچھ کلفت ہوئی تھی ہرگز نہیں اس میں جو کچھ ان کو لطف آیا ہوگا انہی کے دل سے پوچھنا چاہیئے (پھر غلام کے لفظ سے یاد کرنے میں جو مسرت حضرت زاہر کو حاصل ہوئی ہوگی اس کو ان کے سوا کون بتلا سکتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

بس کہا مجھکو اے میرے غلام سب سے پیارا نام ہے میرا یہی (ابن الجامع)

اسی طرح انبیاء و اولیاء پر جب کلفت آتی ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ نازل کرنے والا کون ہے یوں کہتے ہیں ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

بلکہ بعض دفعہ جو اُس کلفت کے انوار و آثار کو دیکھتا ہے تو عراقی کی طرح زبانِ حال سے کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ⁂ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت ہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

پھر اس کو بیماری اور تنگدستی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اس کو دور ہونا پسند نہیں ہوتا۔ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہا پر جب فاقہ اور مرض نہ ہوتا تو بے قرار ہوکر فرماتیں کہ شاید محبوب ناراض ہیں جو بہت دنوں سے پیام و سلام نہیں آیا۔ یعنی فاقہ اور بیماری یہ ان کے نزدیک محبوب کا پیام و سلام تھا۔ پھر ان لوگوں کی بیماری اور فاقہ مستی کو مصیبت کون کہسکتا ہے ہاں یوں کہئے کہ صورت مصیبت ہے جیسے آپ نے

دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر لوگ مٹھائی کی چیزیں بنایا کرتے ہیں کبھی مٹھائی کا درخت بناتے ہیں کبھی پھول پتے وغیرہ تو عوام کی مصیبت کو اور خواص کی مصیبت کو یوں سمجھئے جیسے ایک تو نیم کا اصلی پتہ ہو دوسرا اسی کی شکل میں مٹھائی کا بنا ہوا پتہ ہو صورت دونوں کی یکساں ہے مگر حقیقت میں آسمان زمین کا فرق ہے کہ ایک تلخ ہے ایک شیریں ہے اسی لئے حضرت رابعہ فاقہ و مرض کے نہ آنے سے بے چین ہو جایا کرتی تھیں آخر ان کو کچھ تو مزہ اس میں آتا ہوگا لیکن یہ ایک مذاق ہے اور دوسرا مذاق اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ ہر حال میں خوش ہو۔ نہ صحت سے بے چین ہو نہ مرض سے نہ فاقہ کے آنے سے گھبرائے نہ جانے سے اس سے بھی راضی ہو اس سے بھی راضی ہو بس اس کا حال اس کا مصداق ہو ؎

زندہ کنی عطائے تو در بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دیں تو زہے قسمت جب جان
آپ کی عاشق ہوگئی تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

اور یہ حالت اس لئے افضل ہے کہ اس میں اپنے اختیار و ارادہ کا فنا رکلی ہے کہ اپنے لئے کسی حالت کو تجویز نہیں کرتا اگر حق تعالیٰ تندرست رکھیں مال و دولت عطا فرمادیں اس سے بھی راضی ہے اگر بیمار رکھیں فاقہ بھیجیں اس سے بھی خوش ہے خوشی اور غم کلفت و راحت مدح و مذمت دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں اور یہی کمال عبدیت ہے لوگ اہل اللہ کی تکالیف کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ان کی طرح پریشان ہوں گے مگر جس کو یہ دولت حاصل ہو جس کا مذاق عبدیت اور فنا ہو چکا ہو بھلا وہ بھی کہیں تکلیف سے پریشان ہوا کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ روتے بھی ہوں آہ بھی کرتے ہوں بیماری میں تڑپتے بھی ہوں مگر اس تڑپنے سے ان کا دل پریشان نہیں ہوتا دل کو اس وقت ایک خاص سرور و لذت حاصل ہوتی ہے باطن میں وہ پوری راحت میں ہوتے ہیں ؎

دما دم شراب الم در کشند — وگر تلخ بینند دم در کشند

(ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

آخر آپ نے سنا ہوگا کہ بعض عشاق نے محبوبوں کے ہاتھ سے قتل ہونا بخوشی گوارا کیا ہے تو کیا قتل کے بعد ان کی لاش تڑپی بھی نہ تھی تڑپی ضرور تھی لیکن اس کو خلاف محبت وعشق کوئی نہیں سمجھتا اسی طرح اگر اہل اللہ سے ظاہر میں کلفت کی وجہ سے آہ و نالہ اور اضطراب صادر ہو تو یہ محبت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے کہ کلفت کا احساس ہو ہاں ان کا دل مسرور ہوتا ہے جس پر واقعات بکثرت شاہد ہیں۔ ایک بزرگ کے بدن پر کیڑے پڑے ہوئے تھے وہ بے چارے راستہ میں سڑک کے کنارے آپڑے تھے ان پر ایک دوسرے بزرگ کا گذر ہوا ان کو ان کی حالت دیکھ کر رحم آیا۔ دیکھا کہ زخموں پر ہزاروں مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں ان بزرگ نے ترس کھا کر ان کا سر اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور پنکھا جھلنے لگے۔ اس شخص نے معاً آنکھیں کھول دیں اور کہا جاؤ یہ کون ہے جو میرے اور محبوب کے درمیان آکر حائل ہوگیا تم میرے حال پر کیا ترس کھاتے ہو مجھے تمھارے حال پر رحم آتا ہے۔ یہ حکایت تو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ اور ایک واقعہ میرے بچپن کے زمانہ کا ہے میرے ایک عزیز جو درویش تھے۔ کمبل اوڑھے ہوئے اپنے ایک عزیز سے ملنے آئے۔ وہ دوسرے صاحب شال اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ شال اوڑھنے والے ان درویش سے کہنے لگے کہ تم نے کیا ڈھونگ بنایا ہے کہ لباس چھوڑ کر کمبل دلیا یہ کمبل تو زہر لگتا ہے۔ تو وہ درویش بے ساختہ کہنے لگے کہ مجھے تمھارا یہ شال زہر لگتا ہے میں کیا کروں الغرض آپ کو ان کی کلفت پر رحم آتا ہے اور ان کو آپ کی تندرستی و ناز و نعم پر رحم آتا ہے کہ یہ لوگ آخرت میں درجات سے اور دنیا میں محبوب کی چھیڑ چھاڑ سے محروم ہیں۔

حضرت شبلیؒ جب کسی امیر کو دنیا میں منہمک دیکھتے تو یہ دعا پڑھا کرتے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ

تَفْضِیْلًاؕ ۰ (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھ کو عافیت دی اس چیز سے جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور اپنی مخلوق سے بہتوں پر فضیلت دی) حدیث شریف میں یہ دعا بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کے لئے وارد ہوئی ہے کہ جب کسی مریض و مبتلا کو دیکھو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ تم اس مرض و بلا سے محفوظ رہو گے۔ مگر فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ یہ دعا آہستہ سے پڑھے مریض کو سنا کر نہ پڑھے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو تو حضرت شیخ رہ زیادہ دنیا کو بھی بلا سمجھتے تھے اور اس سے محفوظ رہنے پر شکر کرنے کے لئے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات فقر سے کس درجہ راضی ہوں گے۔

حضرت غوث اعظم رہ کو بادشاہ سنجر نے لکھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خانقاہ کے لئے ملک نیمروز کا کوئی حصہ وقف کر دوں تاکہ ذاکرین و شاغلین کے خرچ کو کافی ہو جایا کرے۔ آپ نے اس کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ۵

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد   در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب   من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا بخت سیاہ ہو اگر میرے دل میں سنجر کے ملک ہوس بھی ہو جب سے مجھے آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے میں نہیں خریدتا)

۵ ان عارفین کے کلام میں ظاہری شوکت و بلاغت بھی بہت ہوتی ہے اور باطنی شوکت تو ان کا حصہ ہے

لہ الحمد للہ اس کا نمونہ اس وقت بھی موجود ہے میرے مخلص دوست جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری جو بفضلہ تعالیٰ دولت جذب و معرفت سے مالا مال ہیں کبھی کبھی اشعار بھی تصنیف فرمایا کرتے ہیں باوجودیکہ آپ کسی شاعر کے شاگرد نہیں مگر طبیعت خداداد کیا جذب باطنی کے مل جانے سے آپ کے کلام میں وہ شوکت و سولت ہے کہ بعض مشاعروں میں جب آپ کی غزلیں پڑھی گئیں تو بڑے بڑے نامی شعرا کی غزلیں پھیکی پڑ گئیں بعض مرتبہ خواجہ صاحب کے کسی شعر کی داد میں لوگ بیساختہ کھڑے ہو ہو جاتے تھے بعد میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ شعراء کو آپ سے حسد ہونے لگا پس یہ بات بالکل سچ ہے کہ عارفین کے کلام میں ظاہری شوکت وصولت و بلاغت بھی زیادہ ہوتی ہے کَثَّرَ اللّٰہُ فِیْنَا اَمْثَالَھُمْ اٰمِیْنَ۔ (کثرت کرے اللہ تعالیٰ ہم میں ان جیسے لوگوں کی یا یہ دعا قبول کر)

آخر کوئی بات تو ان کو نصیب ہے جو دنیا کی لذتوں سے اس قدر سیر ہو گئے صاحبو ! ان کے دل میں ایک دولت ہے جس نے ان کو سب دولتوں سے بے نیاز کر دیا ہے وہ کیا ہے وہ یہ دولت ہے جس کو عارف شیرازی نے بیان فرمایا ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روی
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز وہائے وہوئے

(فراغ دل سے کچھ وقت محبوب کے چہرہ پر نظر کرنا تمام دن ہو وہائے کی چتر شاہی سے بہتر ہے)

واللہ ایک بار فراغت قلب کے ساتھ محبوب کی طرف نظر کرنا سلطنتِ ہفت اقلیم سے افضل ہے۔ خاقانی کہتے ہیں ؎

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

(تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک دم خدا تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے)

اس میں سلیمان علیہ السلام کی توہین کا شبہ نہ کیا جائے چنانچہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہوگا کہ یک دم با خدا ہونا ملک سلیمانی سے افضل ہے تو معلوم ہوا کہ نعوذ باللہ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت ان کے لئے مفضول حالت تھی جواب یہ ہے کہ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی کہ بکسے غیر سلیماں علیہ السلام دادہ شود (ایک دم خدا کے ساتھ مشغول ہونا اس ملک سلیمانی سے بہتر ہے جو سلیمان علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کو دیدیا جائے) باقی سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں با خدا بودن کے خلاف نہ تھا بلکہ وہ تو اس سلطنت میں بھی ہر دم با خدا تھے ان کی سلطنت بھی ذکر میں داخل تھی کیونکہ ذکر کی ایک نوع یہ بھی ہے لنگوٹہ باندھنے ہی کا نام بزرگی نہیں کاملین کو دنیا خدا تعالےٰ سے غافل نہیں کیا کرتی یہ حالت ناقصین کی ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب سلطنت کی دعا کی ہے تو ساتھ میں یہ بھی فرما دیا

رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ یعنی مجھے ایسا ملک عطا ہو جو میرے بعد والوں کے لئے ملنا مناسب نہ ہو۔

مولانا رومی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ظاہراً اس سے حرص وحسد کا شبہ ہوتا ہے مگر واقعہ میں یہ ضعفاء کے حق میں انھوں نے اس دعا میں عین رحمت فرمائی جس کی توجیہ یہ ہے کہ مِنْ بَعْدِیْ میں بَعْدِیَّت زمانیہ مراد نہیں بلکہ بعدیت رتبیہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایسا ملک مجھے عطا کیا جائے جو میرے درجہ والوں کے لئے خواہ مناسب ہو مگر مجھ سے کم درجہ والوں کے لئے غیر مناسب ہوگا یعنی ان کو عطا نہ کیا جائے کیونکہ وہ ایسی سلطنت سے کفر وتکبر میں مبتلا ہو جائیں گے اب اس تفسیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشکال نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ تو سلیمان علیہ السلام کے اعتبار سے مَنْ بَعْدِیْ نہیں بلکہ مَنْ قَبْلِیْ (مجھ سے پہلے) ہیں یعنی آپ تو ان کے ہم رتبہ نبوت ورسالت میں ہیں اور درجہ میں ان سے بھی افضل ہیں۔ ختم ہوئی تفسیر مولانا کی۔ واقعی تفسیر کوئی ان حضرات سے سیکھے الغرض سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں باخدا ہونے کے خلاف نہ تھا وہ سلطنت کے ساتھ بھی ہر دم باخدا تھے اور حضرت سلیمانؑ کو تو ملک کیا مضر ہوتا جبکہ حضرات صحابہ کو مضر نہ ہوا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ حضرات صحابہ کے پاس دنیا ایسی تھی جیسے منتر جاننے والے کے ہاتھ میں سانپ جس طرح منتر جاننے والے پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا اسی طرح حضرات صحابہ پر دنیا کا اثر نہ ہوتا تھا اس کی وجہ کیا تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کے ہاتھ میں دنیا تھی دل میں دنیا نہ تھی۔ دل میں خدا کی محبت ومعرفت اس درجہ بھری ہوئی تھی کہ وہاں دنیا ومافیہا کا گذر ہی نہ تھا مولانا نے عجیب مثال بیان فرمائی ہے ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است

(کشتی میں پانی کشتی کو ڈبونے والا ہے اور اس کے نیچے ہونا کشتی کیلئے پشتی ہے)

اور حضرات صحابہ کی بھی بڑی شان ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ ہے۔

صاحبو! اولیاء امت میں بھی ایسے بکثرت ہوئے ہیں جن کو سلطنت و ملک نے ایک ساعت کے لئے بھی باخدا ہونے سے نہیں روکا۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رح بہت بڑے بزرگ تھے اور اسی کے ساتھ آپ کے یہاں شاہانہ ٹھاٹھ بھی تھا۔ مولانا جامی رح زمانۂ طلب میں حضرت خواجہ صاحب کی بزرگی کا حال سُن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا تو وہاں پورا شاہانہ سامان تھا مولانا جامی کو خطرہ ہوا کہ یہ شخص ولی اور عارف کیا ہوگا جس کے یہاں اس قدر دنیا بھری ہوئی ہے۔ ولی کو تو فقیر ہونا چاہئے۔ اس خطرہ کو قوت ہوئی تو آپ نے برملا خواجہ صاحب کے منہ پر کہدیا۔

ع نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد
(جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مردِ خدا نہیں ہے)

اور یہ کہہ کر وہاں ٹھہرے بھی نہیں آکر مسجد میں لیٹ رہے۔ یہاں ان کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھتے ہیں کہ میدانِ حشر قائم ہے اور ایک شخص مولانا جامی کے سر ہو رہا ہے کہ میرا آپ کے ذمہ فلاں حق ہے وہ ادا کیجئے آپ کہتے ہیں کہ بھائی میرے پاس تو کچھ نہیں اس نے کہا پھر میں آپ کی نیکیاں لوں گا یہ بڑے پریشان تھے کہ اتنے میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رح کی سواری سامنے سے گذری اور انھوں نے مولانا جامی کو اس حال میں دیکھ کر اپنی سواری روک لی اور فرمایا کیا قصہ ہے۔ حق دار نے اپنا مطالبہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ یہ شخص میرا مہمان ہے اس کو تنگ نہ کرو اور جو کچھ لینا ہو ہمارے خزانہ سے جو ہمارا یہاں جمع ہے جا کر لے لو ہیبت سے آنکھ کھل گئی تو دیکھا خواجہ صاحب نماز کے لئے سواری پر آرہے ہیں مولانا جامی کے دل پر خواجہ صاحب کا رعب اور ان کی ہیبت جم گئی اور یہ سمجھے کہ واقعی یہ شخص خالی نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بڑا ہی صاحب ظرف ہے جس کو دنیا خدا سے غافل نہیں کرسکتی مولانا جامی بے ساختہ دوڑ کر قدموں میں جا گرے اور قصور کی معافی چاہنے لگے انھوں نے ہنس کر فرمایا کہ میاں خواب و خیال پر اعتماد نہیں کیا کرتے۔ اب تو ان کو اور بھی اعتقاد بڑھا کہ معلوم ہوتا ہے

یہ خواب بھی آپ ہی کا تصرف تھا اور اگر تصرف نہ تھا تو آپ کا کشف ہی بہت صحیح ہے بہرحال کھلی کرامت ظاہر ہوئی۔ مولانا جامی نے معافی چاہنے کے بعد سلسلہ میں داخل ہونے کی درخواست کی خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا ہم کو اپنا وہ مصرعہ دوبارہ سنانا جو تم نے آصلے ہی پڑھا تھا۔ مولانا جامی نے عرض کیا کہ حضور وہ تو میری جہالت تھی اب میری کیا مجال ہے جو ایسی بات زبان سے کبھی نکالوں۔ فرمایا ایک بار تم نے اپنی خواہش سے پڑھا تھا ایک بار ہماری خاطر سے پڑھ دو اور یہ بے ادبی نہیں کیونکہ اب تو ہم خود اصرار کر رہے ہیں تم اَلْاَمْرُ فُوْقَ الْاَدَبِ (ادب سے بڑھ کر ہے) کا لحاظ کرکے پڑھ دو۔ غرض انھوں نے مجبور ہو کر پڑھا۔ ع نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد (جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مردِ خدا نہیں ہے) حضرت خواجہ احرار رح نے بیساختہ دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا۔ ع اگر دارد برائے دوست دارد (اگر دوست رکھے تو محبوب حقیقی کے لئے دوست رکھے) سبحان اللہ کیا عجیب جواب ہے جس میں کاملین کے پاس دنیا ہونے کی حقیقت کھولدی کہ وہ جو کچھ رکھتے ہیں دوست یعنی محبوب حقیقی کیلئے رکھتے ہیں اپنے نفس کے لئے یہ سازوسامان نہیں رکھتے۔ یعنی مقصود بالذات نفس کی راحت نہیں ہوتی بلکہ ہرحال میں رضا کا قصد ہوتا ہے گو اس کی ساتھ راحتِ نفس بھی لازم آجائے۔ اور حقیقت میں یہ بڑا کمال ہے کہ متاعِ دنیا میں مشغول ہوکر انسان کا دل خدا سے غافل نہ ہو۔ الغرض کاملین کی نظر میں راحت و کلفت خوشی اور غم سب یکساں ہوتے ہیں کوئی حالت ان کو خدا تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی پس ان پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہوتی ہے حقیقت مصیبت نہیں ہوتی گویا اس کو مشاکلۃً مصیبت کہدیا جاتا ہے اسی طرح یہاں جدال بالحق کو مشاکلۃً جدال کہدیا گیا کہ صورت ہر جدال کی ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ بات بھی پہلے ہی زمانہ کے ساتھ خاص تھی کہ جدال بالباطل کی صورت جدال بالحق کے مشابہ تھی کہ جس طرح اہلِ حق تہذیب کے ساتھ مناظرہ کرتے تھے اہلِ باطل بھی تہذیب کی رعایت کرتے تھے۔ باقی آجکل تو جدال بالباطل کا پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں۔ کیونکہ آجکل مناظرہ میں خصم پر پھبتیاں اڑانا خلاف تہذیب

باتیں استعمال کرنا خوامخواہ اپنی بات کی پچ کرنا ہر شخص کو معلوم ہو جاتی ہے جس سے سب سمجھ جاتے ہیں کہ اظہار حق مقصود نہیں محض ہار اور جیت مقصود ہے آجکل تو دنیا میں شاید ہی کہیں جدال بالحق ہوتا ہو ورنہ عموماً جدال بالباطل ہی ہوتا ہے ۔ اور گو یہ حالت بہت زمانہ سے ہے مگر اس زمانہ میں پہلے سے زیادہ ترقی ہے ۔

امام ابو حنیفہ رہ نے اپنے صاحبزادے حماد کو نصیحت فرمائی تھی کہ علم کلام و مناظرہ میں مشغول نہ ہونا انھوں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو خود مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ فرمایا ہاں ہم نے مناظرہ کیا ہے لیکن ہماری یہ حالت تھی کہ ہم تمنا کرتے تھے کہ حق بات خصم کے منہ سے نکلے اور ہم اس کو قبول کریں اور تم کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ خصم کے منہ سے سوائے باطل کے کچھ نہ نکلے تاکہ تم غالب رہو ہم کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ہمارا مسلمان بھائی اپنی زبان سے غلط بات کہے پھر اس کی پچ کرے یا ہم حق بات کہیں اور اس کو ہار کر ہماری بات ماننا پڑے جس سے ہمارا غلبہ اور اس کا عجز ظاہر ہو یا ضد میں آکر وہ ہماری حق بات کو رد کرنے لگے تو اس کے ایمان کا ضرر ہو اس لئے ہم یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے تو ہم اس کو جلدی سے قبول کرلیں جس سے اس کی عزت بھی ہو اور حق بھی واضح ہو جائے ۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کے بعد کا زمانہ بھی غنیمت تھا کیونکہ اس زمانہ کے لوگ جو یہ تمنا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے باطل کے سوا کچھ نہ نکلے اور حق بات ہمارے ہی منہ سے نکلے تو اس تمنا کا منشا یہ تھا کہ وہ لوگ اس بات کا قصد کرتے تھے کہ اگر کبھی خصم کے منہ سے حق بات نکل گئی تو ہم ضرور مان لیں گے ورنہ اگر ان کی نیت یہ نہ ہوتی تو اس تمنا کی ان کو کیا ضرورت تھی کہ خصم کے منہ سے باطل ہی نکلے معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ غلط بات ہی کا رد کرنا چاہتے تھے حق بات کے رد کرنے کا وہ قصد نہیں کرتے تھے مگر آجکل تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے نہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ باطل نکلے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے یہ بات دل میں ٹھان لیتے ہیں کہ خصم کے منہ سے جو کچھ نکلے گا اس کو رد ہی کرینگے خواہ حق ہو یا باطل ہو افسوس ۔ تو یہ ایک تیسرا درجہ ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھا یہ آج کل پیدا

ہوا ہے کہ مناظرہ میں ہر شخص یہ ٹھان لیتا ہے کہ دوسرے کے منہ سے جو کچھ نکلے اس کو رد ہی کرنا چاہیئے اگرچہ وہ حق بات ہی ہو۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)

کانپور میں ایک مرتبہ میں نے ایک مسئلہ بیان کیا ایک طالبعلم بولے کہ نہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے یہ اس طرح کہاں دیکھا کہنے لگے ہدایہ میں لکھا ہے۔ میں نے ہدایہ ان کے سامنے رکھدیا کہ لو اس میں نکالو اس میں ہرچند تلاش کیا مگر وہ مسئلہ نہ تھا تو اب بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کریں کہتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ہدایہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ پھر اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں اور میرا یہ سوال پھر بھی موقع کا تھا کیونکہ آدمیت اس صورت کا نام نہیں بلکہ آدمیت نفس ناطقہ اور روح انسانی پر موقوف ہے جو ایک مخفی امر ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انسان بدے
احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بدے

(اگر صورت کی وجہ سے آدمی انسان ہوتا تو احمدؐ اور ابوجہل برابر ہوتے)

بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ ان کی صورت آدمی کی ہے لیکن روح سباع اور بہائم کی ہے۔ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد ہے اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں)

مولانا فرماتے ہیں ؎

اینکہ می بینی خلاف آدم اند   نیستند آدم غلاف آدم اند
(یہ جو آدمیوں کا اختلاف دیکھتے ہو یہ آدم نہیں یہ آدم کے غلاف میں ہیں)
اے بسا ابلیس آدم روئے ہست   پس بہر دستے نباید داد دست
(بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان ہیں اس لئے ہر کس و ناکس کا اندھا ہو کر مرید نہ ہونا چاہیئے)

غلافِ آدم پر مجھے یاد آیا کہ حیدر آباد میں محرم کے زمانہ میں بعض لوگ شیر اور ریچھ بنتے ہیں یعنی شیر اور ریچھ کی کھال پہنکر لوگوں کو ڈراتے ہیں تو کیا اس سے وہ سچ مچ شیر ہو گئے ہرگز نہیں بلکہ ان کو غلاف شیر کہا جائے گا۔ اسی طرح آدمی کی کھال بدن پر لگ جانے سے کسی کو آدمی نہیں کہا جا سکتا آدمیت کچھ اور ہی چیز ہے۔ دیکھئے اصلی شیر میں اور غلاف شیر میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ یہ نقلی شیر تو کتے سے بھی سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور حقیقی شیر کی یہ شان ہوتی ہے ؎

گر جہاں پُر برف گردد سر بسر
تاب خور بگدازدش از یک نظر

(اگر تمام عالم بھی برف سے پُر ہو جائے آفتاب کی تابش اس کو ایک نظر سے پگھلا دیتی ہے)

واقعی اگر جنگل میں ایک شیر آکر دھاڑ دے تو سارا جنگل کانپ جائے اور یہ نقلی شیر اُس کی آواز ہی سنکر ہگ دے۔ یہی فرق ہے حقیقی انسان اور نقلی انسان میں۔ دیکھئے ابوجہل بھی کعبہ میں جاتا تھا جبکہ وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ تو جا کر سب بتوں کو سجدہ کرتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بار کعبہ میں داخل ہوئے تھے تو سارے بت سرنگوں ہو کر آپ کے قدموں میں آگرے۔ ایک وہ انسان تھا ایک آپ انسان تھے۔ پس حقیقت میں ابوجہل آدمی نہ تھا بلکہ غلافِ آدم تھا۔ اسی لئے میرا ان طالب علم سے یہ سوال ایک حد تک صحیح تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں ممکن ہے کہ آپ غلافِ آدم ہوں۔ باقی ان کا سوال محض ہٹ دھرمی تھا کیونکہ ہدایہ کا ہدایہ ہونا تطابق عبارت سے معلوم ہو سکتا تھا وہ اپنی ہدایہ لاکر اس ہدایہ کا مقابلہ کر سکتے تھے مگر صاحب ملا آن باشد کہ چُپ نشود (ملّا وہ ہے کہ چپ نہ ہو) ممکن ہے کہ تطابق عبارت کی صورت میں بھی وہ یہی کہتے کہ یہ ہدایہ نہیں کیونکہ وہ دونوں کی عبارت میں بھی اعتبار سے فرق نکال سکتے تھے کہ یہ نقوش اس حیثیت سے کہ میری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش ہیں اور اس حیثیت سے کہ دوسری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش نہیں ہیں کچھ اور ہوں گے جیسا کہ

ایک طالب علم نے اپنے بھائی کو گالی دی تھی ماں کی۔ کسی نے کہا ظالم وہ تیری بھی تو ماں ہے۔ تو آپ نے کہا کہ صاحب اعتبار کا فرق ہے اس حیثیت سے کہ وہ میری ماں ہے مخدومہ مکرمہ ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کی ماں ہے ایسی ویسی ہے۔ تو بھائی یہ اعتبار کا فرق بڑے غضب کا ہے جس کی بابت مشہور ہے لَوْ لَا الْاِعْتِبَارَاتُ لَبَطَلَتِ الْحِکْمَۃِ (اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حکمت باطل ہوجاتی) لیکن اگر وہ اعتبارات ایسے ہی اعتبارات ہیں تو یوں کہنا چاہیئے لَوْ لَا الْاِعْتِبَارَاتُ لَبَطَلَتِ الْحِمَاقَۃ (اگر اعتبارات ہوتے تو حماقت باطل ہوجاتی) غرض ان طالب علم کے اس جواب سے سب کو معلوم ہوگیا کہ ان کو محض ضد اور اپنی بات کی پچ منظور ہے آجکل عموماً یہ حالت ہے کہ محض ایک دوسرے کی ضد میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہدیتے ہیں مثلاً دو عالموں میں مخالفت ہے تو اب وہ مخالفت دنیوی معاملات سے گذر کر مسائل شرعیہ تک پہونچتی ہے کہ جس مسئلہ میں ایک کا فتوٰے جواز کا ہوگا دوسرا اس کی ضد میں عدم جواز کا فتوٰے دے گا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس ضد کا ؎

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر
میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

یہیں دہلی کا قصہ ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں علماء کی دو جماعتیں تھیں ایک جماعت شیخ سدّو کے بکرے کو حلال کہتی تھی اور ایک جماعت حرام بتلاتی تھی ایک مرتبہ دونوں جماعت کے لوگوں کو ایک شخص نے دعوت میں جمع کرلیا جب سب کے سامنے کھانا رکھدیا گیا اور وہ کھانے کو تیار ہوئے تو اس نے کہا کہ ذرا تھوڑی دیر سب حضرات توقف فرمائیں مجھے کچھ کہنا ہے۔ سب نے ہاتھ روک لیا تو اس نے کہا کہ یہ جو گوشت آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے یہ شیخ سدّو کے بکرے کا ہے اب جس کا جی چاہے کھائے جس کا جی چاہے نہ کھائے بس جو لوگ اس کو حرام سمجھتے تھے انہوں نے تو ہاتھ کھینچ لیا تماشا یہ کہ جو لوگ اُس کو

حلال کہتے تھے انھوں نے بھی ہاتھ روک لیا۔ داعی نے ان سے کہا کہ صاحب یہ حضرات اگر ہاتھ روکیں تو ان کو حق ہے کیونکہ یہ اس کو حرام سمجھتے ہیں مگر آپنے کیوں ہاتھ روکا آپ کے نزدیک تو یہ حلال ہے۔ اس وقت وہ کہنے لگے کہ بھلا حق بات تو یہی ہے کہ یہ حرام ہے مگر ہم تو محض ان کی ضد میں اس کو حلال کہتے ہیں سو دیکھئے یہ ضد ایسی بری بلا ہے کہ اس میں انسان کیا کچھ کر گذرتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ وہ لوگ آجکل کے اختلاف کرنے والوں سے پھر بہت غنیمت تھے کہ انھوں نے حرام کو صرف زبان ہی سے حلال کیا پیٹ کے اندر اس کو داخل نہیں کیا گویا انھوں نے زبان سے نکالا اندر داخل نہیں کیا۔ نیز موقع پر اپنی غلطی کا اقرار بھی کر لیا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے محض ضد میں کہتے تھے اور آجکل اگر کوئی مولوی کسی کی ضد میں حرام کو حلال کہتا ہو اور اس کو ایسا موقعہ پیش آجائے جیسا اُن صاحبوں کو پیش آیا تھا تو آجکل کے ضدی مولوی کبھی اس کا اقرار نہ کریں گے کہ ہم محض ضد میں اس کو حلال کہتے تھے اور واقع میں حق یہی ہے کہ حرام ہے۔ اور یقیناً سب کے سامنے اپنی بات کی لاج رکھنے کو طوعاً و کرہاً اس کو کھا بھی جائیں گے گو دل نہ مانتا ہو اندر سے جی متلاتا ہو، طبیعت اس کو پھینکنا چاہتی ہو مگر یہ اپنی بات کے پکے بری بھلی طرح اس کو ضرور نگل ہی جائیں گے۔ الغرض امام صاحبؒ کے صاحبزادے کو صورت یکساں ہونے کی وجہ سے شبہ ہو گیا کیونکہ جدال بالحق وجدال بالباطل دونوں کی صورت یکساں ہی تھی اور جس طرح جدال کا اطلاق جدال بالحق پر کبھی ہو جاتا ہے اسی طرح مرار کا اطلاق بھی مرار بالحق پر کبھی ہو جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔ وَلَا تُمَارِ فِيهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا (سو آپ ان کے بارہ میں سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے) اس میں مرار بالحق ہی مراد ہے کیونکہ مرار بالباطل کی اجازت کسی درجہ میں نہیں ہو سکتی اور اس آیت میں مرار ظاہر کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگئی ہے تو اس کو صورۃً مرار کہدیا گیا بوجہ مشاکلۃ کے ورنہ حقیقی مرار حرام ہے۔ حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے چنانچہ ارشاد ہے

مَنْ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ لِيُمَارِيْ بِهِ السُّفَهَاءَ اِلٰی اٰخرہ مجھے حدیث کے الفاظ بعینہ کم یاد رہتے ہیں اسی طرح حوالہ بھی یاد نہیں رہا کرتا کہ یہ کس کتاب کی حدیث ہے۔ اہلِ[لہ] علم اس کی تحقیق کرلیں۔ مجھے حدیث کا مضمون یاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علم کو اس لئے حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے علماء کا مقابلہ کرے اور جاہلوں سے جھگڑا کرے اور لوگوں کا رخ اپنی طرف پھیرے خدا تعالےٰ اس کو جہنم میں داخل کریں گے تو دیکھئے مرا، پر کس قدر شدید وعید ہے مگر افسوس کہ آجکل تحصیل علم سے زیادہ غرض وہی ہوتی ہے جس سے حدیث میں ممانعت وارد ہورہی ہے بلکہ آجکل تو عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کی تحصیل علم سے کوئی بھی غرض نہیں ہوتی نہ حسن نہ مذموم۔ اب تک تو ہم یہ سنا کرتے تھے کہ افعال اختیاریہ بدون تصور غایت و غرض کے موجود نہیں ہوسکتے۔ مگر آجکل کے طلبہ کی حالت دیکھ کر اس مسئلہ میں ہم کو شبہ ہوگیا اور جن کی کچھ غرض ہوتی بھی ہے تو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی غرض محض رضاء الٰہی ہو بلکہ اکثر کو تو جاہ مطلوب ہوتی ہے کیونکہ بہت لوگ علمِ دین پڑھتے ہیں مگر اپنی اصلاح نہیں کرتے اگر رضاء الٰہی ان کو مطلوب ہوتی تو عمل کا اہتمام

[لہ] قلت وفی ترغیب الترھیب للمنذری ص۲۹، ۳۰ ما نصہ وروی عن کعب بن مالک قال سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول من طلب العلم لیجاری بہ العلماء او لیماری بہ السفہاء ویصرف بہ وجوہ الناس الیہ ادخلہ اللہ النار۔ رواہ الترمذی واللفظ لہ و ابن ابی الدنیا فی کتاب الصمت وغیرہ والحاکم شاھدا والبیہقی وقال الترمذی حدیث غریب ۱۲ وعن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تعلموا العلم لتباھوا بہ العلماء ولا تماروا بہ السفہاء ولا تخیروا بہ المجالس فمن فعل ذلک فالنار والنار رواہ ابن ماجہ وابن حبان فی صحیحہ والبیہقی کلھم من روایۃ یحییٰ بن ایوب الغافقی عن ابن جریج عن ابی الزبیر عنہ و یحییٰ ھذا ثقۃ احتج بہ الشیخان و غیرھما ولا یلتفت الی من شذ فیہ الخ واللہ اعلم ۱۲ جامع

ضرور ہوتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگوں کا مشغلہ تحصیل علم کے بعد جھگڑنا ہی رہ جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرار بدال ہی کے واسطے علم حاصل کرتے تھے بس آجکل اسی میں فخر و ناموری سمجھتے ہیں کہ اس سے مقابلہ بحث کرلی اس سے جھگڑ لئے کچھ جاہل ان کی طرف ہوگئے پھر علاوہ ناموری کے اس صورت میں آمدنی بھی زیادہ ہوتی ہے اور جب ان دونوں جھگڑنے والوں میں فیصلہ نہیں ہوتا تو علماء محققین کے پاس سوالات جاتے ہیں اور خواہ مخواہ ان کو بھی اس جھگڑے میں پھانسا جاتا ہے اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے احتیاط کرے اور جھگڑے سے بچنا چاہے تو اس کے پاس سے ٹلتے نہیں اس کے سر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ میں مفتی سعد اللہ صاحب و مولوی سراج الدین صاحب میں لفظ اِختیر کی بابت اختلاف ہوا کہ فصیح اِختیر (بکسر الہمزہ) ہے یا اُختیر (بضم الہمزہ) ایک کسرہ فصیح کہتے تھے ایک ضمہ کو مگر فیصلہ نہ ہوتا تھا بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس اختلاف میں پڑنے سے تم کو کتنی رکعتوں کا ثواب ملا ایک فضول بحث میں وقت ضائع کیا اور فریقین نے دوسرے علماء سے استفتے کئے مولوی سراج الدین صاحب نے جو کہ بہت ہی ذکی ہیں مفتی محمد یوسف صاحب کی خدمت میں بھی سوال بھیجا انھوں نے یہ کہکر واپس کردیا کہ یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں جس کا جواب دیا جائے فضول بحث ہے تو مولوی سراج احمد صاحب بولے کہ اس کو دین بنانا کیا مشکل ہے آپ نے فوراً ایک صورت اپنے ذہن سے گھڑی اور اس طرح استفتاء لکھا کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی بی بی سے کہا کہ اگر آج صبح سے شام تک تو نے کوئی لفظ غیر فصیح بولا تو تجھ پر تین طلاق۔ اس عورت نے لفظ اختیر بولا تو اس پر طلاق ہوئی یا نہیں۔ پھر یہ استفتا مفتی صاحب کے پاس بھیجا گیا وہ بے چارے یہ سوال دیکھ کر مجبور ہوگئے اور ان کو اپنی تحقیق لکھنی پڑی یہ بھی اس لئے کہ شاید مفتی صاحب اس سوال سے پریشان ہوگئے ورنہ آزاد محقق اُس کا بھی جواب دے سکتا تھا وہ یہ کہتا کہ میں صاحب واقعہ کو جواب دوں گا تم کو جواب نہ دونگا یا یہ کہتا کہ جواب دینا فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں جاؤ میں تم کو جواب نہ دونگا۔

کسی اور سے پوچھو مگر ایسے جواب کے لئے کسی قدر ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے جواب دینے والے کو لوگ جاہل اور بد مزاج کج اخلاق مشہور کریں گے تو جس میں اتنی ہمت ہو کہ اگر کوئی اسکو جاہل وغیرہ کہدے تو بُرا نہ مانے وہ شخص ایسا جواب دے سکتا ہے مگر ایسی ہمت والے کم ہیں خصوص آجکل تو یہ حالت ہے کہ علماء سوال کرنے والوں سے ڈرتے ہیں ان کو بیہودہ سوال سے روک نہیں سکتے کہ اگر روکیں گے تو یہ ہم کو بدنام کریں گے یا مدرسہ کا چندہ بند کردیں گے اس لئے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں حالانکہ بعض لوگ محض تعنت کی راہ سے سوال کرتے ہیں۔ ان کا مقصود حق بات کا معلوم کرنا نہیں ہوتا بلکہ مجیب کو پریشان کرنا ہوتا ہے ایسے شخص کو تو جواب دینا شاید جائز بھی نہ ہو کیونکہ ایسا سوال گناہ ہے اور مجیب اس کی اعانت فی السوال کر رہا ہے کیونکہ اس کے جواب دینے سے سائل کو آئندہ کے لئے سوال کی جرأت بڑھتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بھیک مانگنے والے جنکو بھیک مانگنا حرام ہو ان کو دینا بھی حرام ہے کیونکہ ان کو سوال کرنا ہی حرام ہے اور دینے سے سوال کی اعانت ہوتی ہے اور اعانتِ معصیت بھی داخل معصیت ہے پس ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دینا چاہیئے اگر وہ یہ کہے کہ تم کو جواب معلوم ہی نہیں تو کہدو اچھا ہم تو جاہل ہیں پھر تم ہم سے کیوں سوال کرتے ہو اور اگر کوئی یہ کہے کہ تم کو تو جواب معلوم ہے پھر کیوں نہیں بیان کر دیتے اس سے کہدو کہ ہاں معلوم ہے مگر تجھ کو نہ بتلاویں گے ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار عشق و مستی کو بیان نہ کرو اس کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو)

غضب تو یہ ہے کہ آجکل ہر سوال کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے گو جواب معلوم بھی نہ ہو تو گھڑ مڑھ کر جواب لکھتے ہیں محض اس لئے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں شخص کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمِ۔

حالانکہ کسی بات کا جواب معلوم نہ ہوتا کوئی عیب نہیں کیونکہ علم محیط تو حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ بڑے بڑے عالم بلکہ امام اور مجتہد کو بھی کہیں نہ کہیں لَا اَدْرِیْ کہنا پڑتا ہے۔
(مجھے معلوم نہیں)

(۱ تنگ محل)

کسی امام کی (یعنی مالک رحمہ اللہ) کی حکایت ہے کہ ان سے ایک مجلس میں چالیس سوالات کئے گئے تو انھوں نے صرف چار کا جواب دیا باقی سب کی نسبت یہی فرماتے رہے لَاۤ اَدْرِیْ لَا اَدْرِیْ یعنی مجھے معلوم نہیں۔ پس نہ معلوم ہونے کی صورت میں خواہ مخواہ درپے جواب کے ہوتا تو مذموم ہے ہی میرے نزدیک تو اگر جواب معلوم بھی ہو تو متعنت کے سامنے بیان نہ کرے اس سے تو انکار ہی کر دے۔ اور یوں کہدے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز کو ظاہر کیا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ نہ معلوم ہو)

الغرض جواب دینے والے کو سائل کا تابع نہ ہونا چاہیئے بلکہ سائل کو اپنا تابع بنانا چاہیئے اور اگر وہ تابع نہ رہے تو اس کو جواب ہی نہ دے پس اگر یہ معلوم ہو کہ سائل منصف ہے اور طالب حق ہے اس کو ضرور جواب دے بلکہ اپنے کاموں کا حرج کر کے بھی اس کو جواب دینا چاہیئے اور اگر متعنت ہے اس کو ہرگز جواب نہ دے۔ ایسے شخص کو جواب دینے کو طبیعت بھی نہیں چاہتی اور منصف کو جواب دینے کے لئے طبیعت میں خود بخود تقاضا ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے حقیقت واضح کر دی جائے۔ مولانا عبدالقیوم صاحبؒ کی عادت تھی کہ فضول سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ اور محققین نے ہمیشہ اس کا لحاظ کیا ہے کہ وقت کو فضول ضائع نہ کیا جائے اول تو ان کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کوئی مسئلہ ان سے پوچھتا تو اپنی طرف سے فتوے کبھی نہ دیتے تھے بلکہ کتاب کا نام لیکر فرمایا کرتے کہ درمختار یا ہدایہ وغیرہ میں یوں لکھا ہے۔ یہ تو آپ کی غایت احتیاط کا نمونہ ہے اور اگر کوئی شخص فقہی مسئلہ معلوم کرنے کے بعد یہ سوال کرتا کہ یہ مسئلہ کسی حدیث میں بھی ہے یا نہیں تو آپ فرما دیتے کہ میں نومسلم نہیں ہوں خدا کا شکر ہے کہ میرے آباؤ اجداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مسلمان چلے آرہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

ضروری اطلاع:- خط وکتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

جو کچھ کیا اس کو اُن حضرات نے یاد رکھا جو اس زمانہ میں موجود تھے پھر جو کچھ ان کو کرتے ہوئے دیکھا اس پر ان کی اولاد نے عمل کیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ دین مجھ تک پہونچا ہے اس لئے مجھے حدیث کی ضرورت نہیں حدیث کی احتیاج صرف نومسلم لوگوں کو ہے جن کے آباد اجداد نے اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ان کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل اپنے باپ دادوں کے ذریعہ سے معلوم نہیں ہوا اس لئے احادیث کے ذریعہ سے معلوم کرنے کی ان کو ضرورت ہے مولانا عبدالقیوم صاحب کے اس جواب کا منشا صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ سائل کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ تیرا یہ سوال فضول ہے کیونکہ اگر ہم نے تجھے یہ بتلا بھی دیا کہ فلاں حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہے تو تجھ کو وجہ دلالت کیونکر معلوم ہو گی اب اگر ہم وجہ دلالت بھی بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے مقدمات اور مبادی تم کو اسی وقت پڑھا دیں اور اگر وجہ دلالت میں تم ہماری تقلید کرو گے کہ چونکہ مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہے اس لئے مانتا ہوں تو پھر تم پہلے ہی سے ہماری تقلید کیوں نہیں کرتے کہ یہ مسئلہ شریعت میں اسی طرح ہے جس طرح مولوی صاحب نے بتلایا ہاں جو شخص وجہ دلالت کو سمجھ سکتا ہو یعنی طالب علم ہو جو مقدمات اور علوم مبادی سے واقف ہو چکا ہو اس کو اس سوال کا حق ہے اس کے سامنے دلائل حدیثیہ بیان کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ باقی جاہلوں کے سامنے یہ علوم بیان کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔

حضرت حاجی صاحبؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم کو تنگ کرے اور کسی مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کرنی چاہے تو سب رطب ویابس شبہات و جواب اس کے سامنے رکھدو اور کہدو کہ ان میں سے تم خود انتخاب کرلو۔ مجھے انتخاب اور ترجیح کی فرصت نہیں مجھے اور بھی کام کرنا ہے جس کے واسطے میں پیدا ہوا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کی ایک مثال بھی ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے جس کے کچھ بال سفید کچھ سیاہ تھے حجام سے کہا کہ میری داڑھی میں سے سفید سفید بال چھانٹ دے اس نے

استرہ لے کر سارے بال مونڈا اور سب کو سامنے رکھ کر کہا کہ اس میں سے سفید چھانٹ لیجئے مجھے فرصت نہیں۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کے ارشاد پر عمل کرنا اسی شخص کو آسان ہے جو ننگ و ناموس کو آگ لگا چکا ہو کیونکہ ایسے جواب سے مجیب کی وقعت نہیں ہوتی لوگ اس کو جاہل یا بد مزاج مشہور کر دیتے ہیں۔ اسی لئے آجکل ایسے جواب بہت کم لوگ دیتے ہیں اکثر تو جھک جھک میں مشغول ہی ہو جاتے ہیں سلف کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ فضول وقت ضائع نکیا جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے ایک معقولی صاحب آکر لپٹ گئے کہ میں آپ سے مناظرہ کروں گا مولانا نے فرمایا کہ مناظرہ سے دو مقصود ہوتے ہیں ایک اظہار حق یہ تو آجکل مفقود ہے دوسرے بڑا بننا اور اپنی شان علم جتلانا آجکل زیادہ تر یہی مقصود ہوتا ہے تو اس کے لئے آپ کو مناظرہ کی ضرورت نہیں فضول کیوں مشقت میں پڑتے ہیں با آواز بلند کہے دیتا ہوں کہ صاحبو! آپ مجھ سے زیادہ عالم ہیں میں جاہل ہوں مجھے کچھ نہیں آتا بس آپ کا مقصود حاصل ہو گیا۔ چنانچہ مولانا نے با آواز بلند یہ مضمون فرما دیا اور وہ معقولی اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ سبحان اللہ! یہ حضرات کیسے بے نفس تھے اپنے آپ کو بالکل مٹائے ہوئے تھے۔ حضرت استاذ علیہ الرحمہ (مولانا محمد یعقوب صاحب کی عادت تھی کہ درس میں اگر کسی طالب علم نے آپ کی تقریر پر اعتراض کیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ مجھ سے تقریر میں غلطی ہوئی ہے تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے تھے پھر ایک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑی دیر کے بعد بار بار فرماتے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی یہاں تک کہ اعتراض کرنے والا شرما شرما جاتا تھا اور بعض دفعہ جب کسی مضمون میں پڑھاتے ہوئے شرح صدر نہ ہوتا تو صاف فرما دیتے کہ مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا پھر اسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ عین درس میں طلبہ کے سامنے کتاب اٹھا کر اپنے ماتحت مدرسین میں سے کسی کے پاس پہونچ جاتے اور بے تکلف فرما دیتے کہ مولانا مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرما دیجئے انھوں نے تقریر کر دی تو پھر اپنے حلقۂ درس

میں انہی صاحب کا نام لے کر فرماتے کہ مولانا نے اس مقام کی بے نفسی برتی۔ حقیقت میں ایسا بے نفس ہونا بڑا مشکل ہے آجکل لوگ اس کو ذلت سمجھتے ہیں مگر واللہ عزت تواضع ہی میں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ (جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت عطا فرماتے ہیں) آخر ان حضرات نے جو ایسی بے نفسی اختیار کر رکھی تھی کیا اس سے ان کی جاہ و عزت میں کچھ کمی آگئی۔ بخدا پہلے سے زیادہ عزت ہوگئی کہ آج ان کی یہ باتیں کمالات اور کرامات میں شمار ہو رہی ہیں لیکن طلبہ کے ساتھ یہ برتاؤ اسی وقت تک ہونا چاہیئے جبکہ سوال صحیح ہو اور اگر بیڈھنگا سوال ہو جسکے طرز سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد محض اعتراض اور پریشان کرنا ہے تو اول اس کو حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی طرح الزامی جواب سے خاموش کر دو۔ مولانا کو الزامی جواب میں بہت ملکہ تھا مگر وہ ایسوں ہی کے واسطے ہوتا تھا جن کا مقصود محض اعتراض کرنا اور جو لوگ تحقیق کے طالب معلوم ہوتے ان کے سامنے تحقیقی جوابات بھی خوب بیان فرماتے تھے۔ مولانا میں ظرافت بھی بہت تھی جب طالب علم الزامی جواب سے ساکت ہو جاتا تو فرمادیا کرتے تھے کہ تالاب پاس ہے (یعنی اس میں جاکر ڈوب مرو) اور اگر کوئی شخص اس سے بھی باز نہ آوے تو اس کو جواب ہی نہ دو ؎

آنکس کہ بقرآن و خبر زو نرہی
آنست جوابش کہ جوابش ندہی

(جو شخص قرآن اور حدیث کے جواب کو تسلیم نہ کرے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو جواب نہ دو)

اور اگر اس پر بھی متنبہ نہ ہو اور جواب کا تقاضا ہی کرتا رہے تو اس کو حلقۂ درس سے نکال دو کیونکہ جس شخص کو اپنی بات کی پچ کرنے کا مرض ہو وہ ہرگز پڑھانے کے قابل نہیں اگر اس کے اس مرض کا علاج نہ کیا گیا اور اسی طرح سر آنکھوں پر بٹھا لیا گیا تو اس میں ہمیشہ کے لئے یہ عادت پختہ ہو جائے گی کہ جو بات اس کے منہ سے

نکلے گی اس کی پیچ کیا کرے گا حق و ناحق کا ذرا پروا نہ کرے گا۔ اور اس کا دین پر جو بُرا اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے۔ ۱

بد گہر را علم و فن آموختن   دادن تیغ است دست راہزن

(نااہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

کلکتہ میں ایک عالم نے مسئلہ رضاع غلط لکھا اور علماء کے پاس اس کو دستخط کے واسطے بھیجا علماء نے بالاتفاق اس پر دستخط سے انکار کیا کہ یہ تو بالکل غلط مسئلہ ہے۔ کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا آخر میں ان کو اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا تھا۔ مگر بات کی پیچ بری بلا ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ لکھ مارا اور اس میں واہی تباہی دلائل سے اپنے مطلب کو ثابت کرنا چاہا پھر وہ اپنے استاد کے پاس اُس فتوے کو لے گئے۔ اور ان سے جا کر کہا کہ اس مسئلہ میں سب لوگ مجھ سے علیحدہ ہیں کوئی میرے ساتھ نہیں آپ ہی میرا ساتھ دیدیجئے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی یہ تو غلط مسئلہ ہے۔ اس میں ساتھ کیونکر دوں۔ کہنے لگے کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ غلط ہے مگر اب تو زبان و قلم سے نکل گیا اب تو جس طرح ہو میری تائید کر دیجئے مگر استاد نے ساتھ نہیں دیا۔ افسوس دین کو کھیل بنا رکھا ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ایک بات زبان سے نکل گئی ہے اُس کی لکیر پیٹے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کا غلط ہونا معلوم ہے نہ معلوم ان لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کہاں جاتا رہا۔ اب سُنا ہے کہ اُن عالم مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا خدا معاف کرے۔ اگرچہ جرم بہت سنگین ہے میں تمام مدرسین و مہتممین مدارس سے بالتجا عرض کرتا ہوں کہ للہ اس بات کا کچھ انتظام کیجئے کہ سب طلبہ کو ایک لاٹھی نہ ہانکا جائے اور سب کی تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ جس شخص کے اخلاق خراب ہوں اول اس کے اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کیا جائے۔ بات بات پر اس کو ٹوکا جائے، اگر اصلاح کی امید نہ ہو تو مدرسہ سے علیحدہ کیا جائے۔ اسی طرح جس طالب علم کی طبیعت میں کجی معلوم ہو سلامتی سے محروم ہو اس کو بھی ہرگز پورا نصاب نہ پڑھایا جائے کیونکہ تکمیل نصاب کے بعد وہ خود بھی

اور دوسرے لوگ بھی اس کو عالم و مقتدا سمجھیں گے اور ایسا شخص مقتدا ہو کر جو کچھ ستم ڈھائے گا ظاہر ہے پھر ان سب کا وبال ان مدرسین، و مہتممین کے اوپر ہوگا کہ انہوں نے ایسے نااہلوں کو کیوں علم پڑھایا میری رائے میں ایسے لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب اردو میں یا فارسی میں یا کسی قدر عربی میں مقرر کرلیا جائے جو ضروری مسائل و احکام کے جاننے کے لئے کافی ہو وہ نصاب پڑھا کر ان سے کہدیا جائے کہ جاؤ دنیا کا کوئی کام سیکھو اور کماؤ کھاؤ مجھے حیرت ہے کہ بعض مدارس میں ایک ہزار بعض میں پانچسو بعض میں سو دوسو طلبہ تعلیم پاتے ہیں کیا یہ لوگ سب کے سب مقتدا بننے کے اہل ہیں یقیناً نہیں اور ہرگز نہیں پھر اہل مدارس سب کو مقتدا کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ بخدا مسلمانوں پر زیادہ تباہی ان نااہل مولویوں کی وجہ سے بھی آئی ہے کہ ان لوگوں نے دین کو کھیل بنالیا ہے جیسا موقع دیکھا ویسا فتویٰ دیدیتے ہیں حتیٰ کہ عوام کہنے لگے کہ بس جی دین تو مولویوں کے ہاتھ میں ہے جس چیز کو چاہیں حلال کردیں اور جس کو چاہیں حرام اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انھوں نے علماء سے دریافت کرنا ہی چھوڑدیا جس کے جو جی میں آیا کرلیا خواہ حلال ہو یا حرام پھر اس صورت میں قہر خداوندی نازل ہونا ہی تھا۔ اس لئے میں مکرر کہتا ہوں کہ اہل مدارس کو طلبہ کا انتخاب کرنا چاہیئے اور ان میں جو اہل نظر آئیں انہی کو پوری تعلیم اور انہی کو سند فراغ دینی چاہیئے مگر اب تو بلا یہ ہے کہ لوگوں کو انتساب کا شوق ہے کہ ہمارے یہاں سے اس سال اتنے آدمی فارغ ہوئے۔ اے صاحبو! طلبہ کا فارغ کرنا بہت عمدہ ہے مگر وہ پہلے اہل تو ہوں واللہ کس قدر افسوس ہوتا ہے جب بعض فارغین کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے اعراب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے حالانکہ اس پر اعراب لگے ہوئے ہیں وہ ان کو دیکھ کر بھی غلطی کرتے ہیں اور کتابوں کے اعراب تو وہ کیا خاک صحیح پڑھیں گے بھلا ایسے نااہلوں کے فارغ کرنے سے کیا خوشی ہوسکتی ہے بجز اس کے کہ اپنے ذمہ خیانت کا وبال رہے اور کچھ نفع نہیں صاحبو! مجھ کو سخت اندیشہ ہے کہ علماء سے خصوصاً اہل مدارس سے کہیں اس کی بازپرس خداتعالیٰ کے یہاں نہ ہو

اس کی اصلاح کی جلد فکر کیجیے۔ یہ مضمون بہت طویل ہوگیا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ طلبہ کے فضول سوالات کا جواب نہ دینا چاہیئے کیونکہ بعض طلبہ محض تنگ ہی کرنا چاہتے ہیں حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے یہاں ایک شخص پڑھتے تھے ان کی عادت تھی اعتراض کرنے کی بہت تھی مگر ہمیشہ ایک دعوےٰ کر دیا کرتے کہ یہ بات تو یوں نہیں یوں ہے اور جب مولانا دلیل پوچھتے تو آپ کہتے کہ کیا سارا کام میں ہی کروں دعویٰ میں نے کر دیا دلیل آپ بیان کر دیجیے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت دعویٰ تھا جس کی دلیل مدعی اپنے ذمہ نہیں سمجھتے تھے غرض آجکل جدال بالباطل کا بہت چرچہ ہے۔ علماء وطلبہ میں سے کوئی بھی اس مرض سے خالی نہیں إِلَّا مَنْ عَصَمَ اللّٰهُ (مگر جس کو اللہ تعالےٰ بچائے) یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے قابل سبق لینے کے ہے اس میں حق تعالےٰ نے جدال بالباطل کی مذمت عجیب طرز سے بیان فرمائی ہے جس سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو مجادلہ کرتے ہیں اللہ کے بارے میں یعنی خدا کی ذات وصفات واحکام میں جن میں توحید اعلیٰ فرد ہے اور بقیہ احکام اس کے بعد ہیں سب میں جدال کرنا جدال فی اللہ ہے گو درجات متفاوت ہیں اور جدال تو خود ہی مذموم ہے پھر جدال فی اللہ تو سب سے زیادہ مذموم ہے آگے فرماتے ہیں بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ یعنی مجادلہ کرتے ہیں ذات وصفات واحکام الٰہی میں بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے اب یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ قیود احترازیہ نہیں ہیں کیونکہ جدال فی اللہ کی جو کہ مذموم ہی ہوگا دو قسمیں نہیں ہو سکتیں کہ ایک وہ جو علم وہدایت اور کتاب کے ساتھ ہو دوسرے وہ جو ان کے بغیر ہو بلکہ جدال بالباطل جب ہوگا ان تینوں کے بغیر ہی ہوگا معلوم ہوا کہ یہ قیود واقعیہ ہیں مطلب یہ ہوا کہ جدال فی اللہ یعنی جدال بالباطل کا سبب ان ہدایت وکتاب منیر کا حاصل نہ ہونا ہے پھر اسی کی ساتھ ایک بات اس جگہ یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ علم سے مراد جس میں ہدایت وکتاب منیر بھی داخل ہے مطلق علم نہیں کیونکہ جدال بالباطل کے ساتھ

مطلق علم کا اجتماع تو ممکن اور مشاہد ہے بلکہ یہاں وہ علم مراد ہونا چاہیئے جو کہ جدال بالباطل کے ساتھ جمع نہ ہوسکے پس یہاں علم سے خاص علم یعنی علم صحیح و نافع مراد ہے۔ اب یہاں سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ علم صحیح و نافع کیسی قدر کی چیز ہے کہ جدال بالباطل اس کی ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور جو شخص علم صحیح ونافع سے محروم ہے وہ جدال بالباطل جدال فی اللہ میں جو کہ جدال بالباطل کا اعلیٰ فرد ہے پھنس جاتا ہے اور جدال بالباطل کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے تو جس چیز پر اس سے بچنا موقوف ہے اس کی ضرورت کا انکار نہیں ہوسکتا لہذا یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ علم نافع وعلم صحیح کی سخت ضرورت ہے اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہوگئی کہ جب جدال بالباطل علم صحیح کیساتھ جمع نہیں ہوسکتا تو جو لوگ باوجود علم صحیح و ہدایت و کتاب منیر کے حاصل کرنے کے پھر جدال بالباطل میں مبتلا رہتے ہیں یا تو انھوں نے ان تینوں کو سمجھ کر حاصل نہیں کیا یا اگر سمجھ کر حاصل کیا ہے تو جدال کے وقت جان بوجھ کر ان سے اعراض کرلیا ہے ورنہ اگر وہ ہر وقت ان تینوں پر نظر رکھتے اور پوری طرح عمل کرتے اور کسی وقت کسی مسئلہ میں ان سے اعراض نکرتے تو وہ ہرگز جدال بالباطل میں مبتلا نہ ہوتے خوب سمجھ لو جب علم کی ضرورت معلوم ہوگئی تو اب میرا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنا چاہیئے اور اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز روزہ کی طرف تو توجہ ہے مگر علم نافع کی طرف توجہ نہیں اگر کوئی نماز نہ پڑھے روزہ نہ رکھے زکوٰۃ نہ دے حج نہ کرے تو سب لوگ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص علم دین بالکل حاصل نہ کرے تو اس کو بُرا کوئی نہیں کہتا، حالانکہ بقدر ضرورت علم حاصل کرنا ہر شخص کے ذمہ ویسا ہی فرض عین ہے جیسا کہ نماز روزہ وغیرہ میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ مولوی بن جاویں اور میرا یہ مطلب ہو کیونکر سکتا ہے۔ میں تو ابھی اہل مدارس کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ سب طلبہ کو مولوی نہ بنایا کریں تو جب میں سب طلبہ کا مولوی ہونا پسند نہیں کرتا تو عوام کا مولوی ہونا میں کیوں چاہوں گا۔ پس آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ آپ کو مولوی بننا پڑے گا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ مسائل و احکام شرعیہ کا علم بقدر ضرورت

اردو زبان ہی میں حاصل کرلیا جائے اور بچوں کو اہتمام کے ساتھ مکتب میں قرآن اور دینی رسائل پڑھنے کے لئے بھیجا جائے جب وہ بقدر ضرورت مسائل سے واقف ہوجائیں پھر تمہیں اختیار ہے جس کام میں چاہو لگاؤ اور جو رؤسا کے بچے ہیں جن کو خدا نے مالی وسعت عطا فرمائی ہے ان کو چاہئے کہ علم دین کی پوری تعلیم دی جائے کیونکہ ان کو معاش کی فکر سے خدا نے بچایا ہے تو اس کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہئے کہ یہ لوگ دین کی خدمت کریں اور اگر پوری تعلیم نہ دی جائے تو کم از کم قرآن اور اردو کے ضروری دینی رسائل تو ان کو ضرور پڑھا دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے مذہب سے تو کسی قدر واقف ہوجائیں اور جو لوگ اردو بھی نہ پڑھ سکیں جیسے گاؤں کے کاشتکار وغیرہ ان کو چاہئے کہ علماء سے ملتے رہیں اور مسئلے پوچھتے رہیں اگر وہ روزانہ ایک مسئلہ بھی یاد کرلیا کریں تو سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے یاد ہوسکتے ہیں۔ رہ گئی عورتیں ان کو مرد تعلیم دیا کریں اور جو مرد پڑھے لکھے نہ ہوں وہ عورتوں سے کہہ دیا کریں کہ تم کو جو مسئلہ پوچھنا ہو ہم سے کہہ دیا کرو ہم علماء سے پوچھ کر تم کو بتلا دیں گے۔ لیجئے اس ترکیب سے ساری امت بقدر ضرورت علم سے فیضیاب ہوسکتی ہے۔ اور جو لوگ اردو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کو بھی علماء سے ملنے ملانے اور سوال کرنے کا عادی رہنا چاہئے کیونکہ بعض بات کتاب سے حل نہیں ہوتی علماء سے زبانی دریافت کرکے اس کی حقیقت حل ہوجاتی ہے اور دین کے ساتھ تعلق و مناسبت تو بدون صحبت کے حاصل ہوتا ہی نہیں۔

صاحبو! آجکل علم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اول تو مخالفین اسلام جاہل مسلمانوں کو طرح طرح سے بہکاتے پھرتے ہیں پھر خود مسلمانوں میں بعضے فرقے ایسے موجود ہیں جو ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر واقع میں وہ اسلام سے دور ہیں اور بعضے گو مسلمان ہیں مگر گمراہ ہیں تو بعضے جاہل مسلمان ان گمراہ لوگوں کی باتوں کو اسلام کی باتیں سمجھنے لگتے ہیں اور دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جو جماعت اہل حق کی کہلاتی ہے ان میں بھی بعضے ایسے ہیں جنھوں نے دنیوی اغراض کو قبلہ وکعبہ

بنا رکھا ہے کہ جس کام کے ساتھ ان کی دنیوی غرض متعلق ہوئی اس کو انھوں نے دین کا لباس پہنا کر عوام کے سامنے ظاہر کر دیا اور جس چیز کی ممانعت سے ان کی اغراض میں خلل پڑتا ہو اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے اسی لئے وہ بہت سی باتوں کو جن کو پہلے جائز کہتے تھے آج حرام کہنے لگے اور جن باتوں کو ہمیشہ سے حرام و ناجائز کہتے تھے آج اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے۔ صاحبو! یہ غرض وہ چیز ہے جس میں انسان دین سے اندھا بن جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد — صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد
چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار — کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(جب غرض آجاتی تو ہنر پوشیدہ ہوجاتا ہے اور دل کی جانب سے سیکڑوں پردے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں۔ جب قاضی دل میں رشوت لینے کی دل میں ٹھان لیتا ہے تو ظالم اور مظلوم میں امتیاز نہیں کرسکتا)

یعنی جب قاضی کے دل میں رشوت کی طمع ہوگی اس سے صحیح فیصلہ کی امید بیکار بلکہ دوراز کار ہے شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ پھر ایسے لوگوں کو تم اہل حق کیوں کہہ رہے ہو سو سن لیجئے کہ میں نے ان کو اہل حق عقائد کے لحاظ سے کہا ہے کہ ابھی تک شکر ہے ان کے عقائد صحیح ہیں اگرچہ اس غرض پرستی کے ساتھ عقائد کا بھی سخت اندیشہ ہے چنانچہ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ اہل حق کی جماعت کے بعض افراد ان اہل بدعت اور ملحدین کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو رہے ہیں جو ان کو کافر کہتے تھے اور یہ ان کو فاسق و فاجر کہتے ہیں پس حب فی اللہ و بغض فی اللہ کا اثر تو ابھی سے مرٹ چلا ہے آگے خدا حافظ ہے غرض اہل حق میں سے بعض ہم جیسے بھی ہیں جنھوں نے دین کو اغراض کے تابع کر رکھا ہے وہ صاف کہتے ہیں کہ آخر مصلحت وقت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں بعض علماء سے آجکل کہا گیا کہ عوام بعض امور میں شریعت کی حد سے بہت دور نکل گئے ہیں اس کی روک تھام ہونی چاہئے تو وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جوش و خروش میں ایسا بھی ہوجاتا ہے کچھ پروا نہیں اس وقت تو کام ہونے دو پھر بعد میں

مسائل کو بھی دیکھ لیا جائے گا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اے صاحبو! آسمان نہیں پھٹ جاتا زمین شق نہیں ہو جاتی جب ایک عالم کی زبان سے یہ بیہودہ کلمات نکلتے ہیں افسوس مسلمان کی مصالح پر ایسی نظر بالخصوص ایک عالم کی نہایت شرم کی جگہ ہے مسلمان کو تو مصالح کے بارے میں یہ کہنا چاہیئے ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

(یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی محبوب حقیقی کے ہو رہو) بس ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو راضی کر لو سب کام بن جائیں گے ذرا اس تدبیر کو اختیار کر کے تو دیکھو اسی میں وعدہ ہے مال و جاہ و عزت و شوکت وغیرہ حاصل ہونے کا حق تعالٰے فرماتے ہیں وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّہُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَہُمْ دِیْنَہُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَہُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّہُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِہِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ؕ

(وعدہ کیا اللہ تعالٰی نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور کئے انہوں نے اچھے کام کہ ضرور ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسے خلیفہ بنایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور ضرور تمکین دے گا ان کے لئے ان کے دین کو وہ دین جو اللہ تعالٰے نے ان کے لئے پسند کیا اور ضرور ضرور بدلے میں دیگا ان کو بعد ان کے ڈرنے کے امن عبادت کریں گے وہ میری اور نہ شریک کریں گے وہ میرے ساتھ کسی چیز کو)

اس آیت میں استخلاف فی الارض کا وعدہ ایمان و اعمال صالحہ پر مرتب فرمایا ہے اور اس استخلاف کی غایت بھی تمکین دین و عبادت مع التوحید بیان فرمائی ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات ایمان و اعمال صالحہ و اتباع احکام ہے اس کے استحکام و حفاظت کے لئے سلطنت عطا فرمانے کا بھی وعدہ ہے پس یہ کس قدر افسوس کی بات ہے

کہ آجکل مقصود بالذات کو تابع اور تابع کو متبوع بنایا جا رہا ہے۔ ایک دوسری جگہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (اور بتحقیق ہم زبور میں نصیحت کے بعد کہہ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے) اس آیت میں عباد صالحین کے لئے وراثت ارض کا وعدہ ہے تو مسلمان کو ان آیات پر نظر کر کے احکام کا اتباع کرنا چاہیئے اور تمام مصالح کو تابع احکام بنانا چاہیئے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا گو کسی وقت ظہور وعدہ میں دیر ہو جائے تو اس سے گھبرانا نہ چاہیئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تباہی کے لئے بددعا فرمائی تھی رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝

(ترجمہ) اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب (ہم کو یہ بات کشف اور وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گئی کہ) آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں دیئے اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہو چکی تو اب ان کے اموال و نفوس کو کیوں باقی رکھا جائے پس) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دیجئے اور (ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کر دیجئے اس طرح کہ) ان کے دلوں کو (زیادہ) سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہو جاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہو کر اس) کو دیکھ لیں اس دعا کے بعد حق تعالےٰ کا فوراً یہ ارشاد ہوا قَالَ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَانِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی (موسیٰ و ہارون علیہما السلام مراد ہیں کیونکہ حضرت ہارون اس

دعا پر آمین کہہ رہے تھے اور آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہوتا ہے) دعا قبول کرلی گئی سو تم (اپنے منصبی کام پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں پس باوجودیکہ دعا قبول ہو چکی تھی اور اس کی قبولیت کی اطلاع بھی فوراً دیدی گئی تھی مگر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ظہور اس دعا کا چالیس سال کے بعد ہوا مفسرین نے وَلَا تَتَّبِعٰنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کی تفسیر میں لکھا ہے یعنی استعجال نہ کرنا یعنی جیسا کہ جاہل لوگ دعا کے اگلے ہی دن وحی کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ دیکھئے اگر آپ کسی طبیب کے پاس جائیں کہ مجھ کو مسہل کی ضرورت ہے مسہل دیدو تو یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ آج تم نے درخواست کی اور کل ہی دست آنے لگیں ہرگز نہیں بلکہ وہ اول منضج کا نسخہ لکھے گا مہینہ بھر اس کو پینا پڑے گا اس کے بعد وقت اور موسم کو دیکھ کر مسہل دیا جائے گا اور ہر مسہل کے بعد تبرید ہوگی پھر اگر مسہل میں کچھ کسر رہ گئی تو کوئی ملین شربت مہینہ بھر پینا پڑے گا۔ غرض چار مہینہ کے بعد کہیں مسہل پورا ہوگا لوگ یوں چاہتے ہیں کہ صبح کو نسخہ پی کر شام ہی کو دست آجاویں سو بعضے طبیب ایسے بھی ہیں لیکن وہ آپ کو ایسا مسہل دیں گے کہ مادہ کے ساتھ روح کا بھی اخراج کر دے گا ایک جاہل طبیب نے ایک شخص کو مسہل دیا تھا نہ معلوم جمالگوٹہ دیدیا تھا یا کیا اس کو بیحد دست آنے شروع ہوئے لوگوں نے طبیب صاحب سے آکر کہا کہ دست بہت آگئے اب بند کر دینے چاہئیں کہا نہیں ابھی اور آنے دو مادہ نکل رہا ہے کچھ دیر کے بعد لوگ پھر آئے کہ حکیم جی ضعف بہت ہوگیا دست بند ہی نہیں ہوتے کہا کچھ حرج نہیں مادہ فاسدہ نکل رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع دی کہ وہ تو مرنے کو ہو رہا ہے کہا نہیں جب مادہ نکل جائیگا خود اچھا ہو جائے گا، یہاں تک کہ وہ اسی میں مر گیا لوگوں نے حکیم صاحب سے کہا کہ وہ تو مر بھی گیا۔ تو آپ فرماتے ہیں اللہ رے مادے نکلتے ہیں تو یہ حال کیا کہ مار ڈالا اگر رہتا تو کیا حال ہوتا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ موت سے آگے کیا ہوتا۔ تو آجکل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو ایسا ہی مسہل دیا جائے۔ لیکن

محقق طبیب ایسا کبھی نہیں کر سکتا وہ ہر کام کو موقع اور وقت دیکھ کر کرے گا اگر تم اس سے یہ جا کر کہو کہ ہم نے کل نسخہ پیا تھا آج دست نہیں ہوئے تو وہ نسخہ لیکر پھاڑ ڈالے گا میری غرض اس مثال سے یہ ہے کہ بعض دفعہ تاخیر ظہور میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں اور حقیقت میں وہ تاخیر تمہارے ہی واسطے مصلحت ہوتی ہے مگر چونکہ ہم کو اپنی مصلحت کا بھی علم نہیں ہوتا اس لئے وہ تاخیر ناگوار ہوتی ہے پس جن مصالح کی وجہ سے تم احکام الٰہیہ کو پامال کر رہے وہ مصالح خود اتباع احکام پر موقوف ہیں۔ یاد رکھو مسلمانوں کو تو ہرگز اس طرح فلاح حاصل نہیں ہوسکتی کہ وہ احکام الٰہیہ کو مصالح کے تابع بنا دیں اور دنیوی اغراض کو قبلہ و کعبہ بنا لیں۔ باقی کفار کی حالت دیکھ کر تم کو دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ وہ خدا کو ناراض کر کے بھی ترقی کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ کفار خدا کے نزدیک حقیر ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے پیر کا جوتہ۔ اگر جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکا نہیں جاتا اور مسلمان خدا کے نزدیک محبوب ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹوپی کہ اس میں اگر ذرا سی بھی ناپاک چھینٹ پڑ جاتی ہے تو اس کو فوراً سر سے اتار پھینکتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ آپ کو بھی نعوذ باللہ جوتہ کی طرح بنا دیں کہ آپ برابر گندگی میں ملوث رہیں اور آپ کو اتار کر نہ پھینکا جائے۔ صاحبو! حق تعالےٰ آپ کو ٹوپی کی طرح معزز بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کی عزت یہی ہے کہ جہاں ذرا اس میں ناپاکی لگ جائے فوراً سر سے اتار دی جائے پس خوب سمجھ لو کہ ترک احکام کے ساتھ یا احکام کو اغراض و مصالح کا تابع بنا کر مسلمان کو کبھی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی اور اگر بالفرض حاصل بھی ہو جائے تو رضائے الٰہی تو ہرگز حاصل نہ ہوگی کہ خود فلاح سے بھی وہی مقصود ہے کیونکہ فلاح دنیوی بھی وہی محمود ہے جو معین ہو جاوے رضائے حق میں چنانچہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (یہ وہ لوگ ہیں اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دیں تو قائم کریں گے نماز کو اور زکوٰۃ دیں گے) خود اس پر شاہد بین ہے پس مسلمان کی اصل کامیابی رضائے حق ہے اور اس کی اصل

کوشش اس کی طلب ہے جس کا طریق اتباعِ احکام ہے خواہ دنیا میں کسی حال میں رہے اور اس حالت میں جو حظ اور راحت مومن کو ہوتی ہے وہ سب کامیابیوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی بنا پر حق تعالےٰ نے ایمان و اعمال کے ثمرات میں راہِ حق پر ہونے کو بیان فرمایا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں)

یہاں حق تعالےٰ نے مسلمانوں کی جزاء میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں ایک جزاءِ دنیوی یعنی واقع فی الدنیا ہے عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں) دوسری جزاءِ اُخروی یعنی واقع فی الآخرۃ ہے وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمان کے لئے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ پس ہدایت پر ہونا یہی بڑی رحمت اور راحت کی چیز ہے جس کا مشاہدہ مجھ کو ایک سفر میں اس طرح ہوا کہ ایک بار میں سہارنپور سے لکھنؤ جا رہا تھا اس لئے رُڑکی جانے والی گاڑی میں سوار ہوا تو وہاں میرے ایک دوست بھی۔ بیٹھے ہوئے ملے جو پورے جنٹلمین تھے جب گاڑی چھوٹ گئی تو آپس میں باتیں ہونے لگیں میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں۔ بولے کہ میرٹھ جا رہا ہوں اس وقت میں نے انہی کے محاورہ میں کہا کہ ممکن ہے آپ میرٹھ جا رہے ہوں لیکن افسوس ہے یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے۔ وہ غلطی سے بجائے میرٹھ کی گاڑی کے اس میں بیٹھ گئے تھے۔ بس یہ سُن کر ان کی یہ حالت ہوئی کہ چہرہ سے پریشانی ٹپکتی تھی، بات نہیں کر سکتے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بالکل بیک بینی و دو گوش تھے۔ کیونکہ جنٹلمینوں میں یہ بھی مرض ہے کہ وہ سفر میں

نہ کپڑے ساتھ لیتے ہیں نہ پانی پینے کا برتن ساتھ لیتے ہیں ۔ ایک مولوی صاحب جو کہ ریاست بہاولپور میں کسی اسکول میں پروفیسر ہیں وہ فرماتے تھے کہ ایک بار میں بہاولپور سے وطن کو آرہا تھا میری ساتھ ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی تھی ۔ اس گاڑی میں ایک جنٹلمین سوار تھے وہ میرے برتنوں کو دیکھ کر ہنسنے لگے کہ یہ بھنگیوں کے سے برتن آپ کہاں سے ساتھ لائے ۔ میں اس پر خاموش ہو رہا تھوڑی دیر میں ان صاحب کو پیاس لگی تو اسٹیشن پر گلاس لے کر اُترے وہاں پانی نہ ملا اور کئی اسٹیشن تک نہ ملا تو اب ان کا مارے پیاس کے بُرا حال تھا بار بار کن انکھیوں سے میری صراحی کو تکتے تھے آخر مجھے رحم آیا اور میں تختہ پر آنکھیں بند کر کے سوتا بن کر لیٹ رہا تھوڑی دیر میں وہ صاحب آہستہ آہستہ صراحی کے پاس آئے اور اس سے مُنہ لگا کر پانی پینا شروع کیا مگر حالت یہ کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور ایک آنکھ پانی کی طرف بڑی گھبراہٹ میں غریب نے پانی پیا میرے جی میں آیا کہ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لوں مگر میں نے خیال کیا کہ بے چارہ پیاسا ہے ۔ جب پانی پی چکے گا پھر سمجھوں گا چنانچہ جب وہ خوب پانی پی چکے اور وہاں سے اٹھنے لگے تب میں نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن سے کیوں پانی پیا ۔ بس اب تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور معافی چاہنے لگے ۔ میں نے پھر تو ان کی بدتہذیبی خوب ظاہر کی کہ تم تہذیب کا دعویٰ محض جھوٹا کرتے ہو تم میں خاک تہذیب نہیں ۔ میں کہتا رہا اور خاموش سنتے رہے ۔

غرض کچھ سردی کا بھی خیال تھا مگر زیادہ پریشانی یہ تھی کہ بے راہ جا رہے تھے کہیں لاحول پڑھتے ہیں کہیں انا للہ پڑھتے ہیں میں نے اُن سے کہا کہ میاں اب تو جو ہونا تھا ہو گیا ۔ یہ گاڑی ظاہراً رڑکی سے پہلے تو ٹھہر نہیں سکتی خواہ تم کتنے ہی پریشان ہو اس لئے پریشانی بے فائدہ اطمینان سے

باتیں کرو میں تو اُن کو باتوں میں لگانا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے جھنجلاتے تھے کہ واہ میاں تم کو ہنسی سوجھی ہے اور مجھے اپنی الجھن لگی ہوئی ہے اس حکایت سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں نے اس وقت اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ کیا تھا تو یہ ظاہر ہے کہ روڑکی پہونچنے سے پہلے نہ میں لکھنؤ پہونچا تھا نہ ان کو میرٹھ جانا کچھ زیادہ دشوار ہو گیا تھا لیکن پھر میں اپنے آپ کو ایسا مطمئن پاتا تھا گویا کہ بادشاہ تھا کیونکہ مجھ کو اس خیال سے راحت تھی کہ میں راہ پر ہوں اور وہ ایسے پریشان تھے جیسے کوئی مجرم پنجرہ میں قید کر دیا جائے۔ ان کو اس خیال سے الجھن تھی کہ میں راہ پر نہیں ہوں۔ اسی طرح جو لوگ پیادہ سفر کرتے ہیں جب وہ راستہ بھول لیتے ہیں اس وقت کوئی ان کی پریشانی دیکھے کہ ایک ایک قدم من بھر کا ہو جاتا ہے۔ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے کہ واقعی ہدایت پر ہونا بڑی رحمت ہے۔

خدا کی قسم جو شخص شریعت کے موافق چل رہا ہو وہ بادشاہ ہے گو ظاہر میں سلطنت نہ ہو اور جو شخص شریعت سے ہٹا ہوا ہو وہ پنجرہ میں مقید ہے گو ظاہر میں بادشاہ ہو مسلمان متبع شریعت کو چونکہ یقین ہے کہ میں سیدھے راستہ پر ہوں اس لئے اس کو ساری مصیبتیں سہل معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ چند دن کی مصیبتیں ہیں پھر ختم ہو جائیں گی۔ کفار کو یہ دولت نصیب نہیں کیونکہ ان کو اپنی نجات کا کسی صحیح دلیل سے یقین ہی نہیں۔ اور باطل کا خاصہ یہی ہے کہ اس سے اطمینان و سکون کبھی حاصل ہوتا ہی نہیں ہاں کوئی جہل مرکب میں مبتلا ہو تو اور بات ہے مگر اس کو بھی اہل حق کی برابر ہرگز اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مصائب کے وقت جس قدر استقلال اہل حق میں ہوتا ہے کسی جماعت میں نہیں ہوتا۔

صاحبو! راستہ تو یہ ہے کہ خدا کو راضی کرو احکام کا اتباع کرو۔ شریعت میں گڑبڑ نہ کرو ان شاء اللہ تعالیٰ پھر کسی کی مجال نہیں کہ مسلمانوں کو نگاہ بھر کر بھی دیکھ سکے۔ باقی جو راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے اس کی تو یہ حالت ہے ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستانست

(اے اعرابی مجھ کو اندیشہ ہے کہ تو کعبہ نہ پہونچے گا اس لئے کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے ترکستان کا ہے)

خدا کی قسم اگر ہم کو پاخانہ اٹھانا پڑے اور خدا ہم سے راضی ہو تو وہی ہمارے لئے سلطنت ہے اور اگر خدا راضی نہ ہوا تو لعنت ہے ایسی سلطنت پر جو خدا کو ناراض کر کے حاصل کی جاوے۔ یاد رکھو سلطنت کوئی تقرب الی اللہ کا سبب نہیں۔

بعض انبیاء علیہم السلام ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو ساری عمر سلطنت نصیب نہیں ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ صرف ایک ہی آدمی ہوگا اور بعض کی ساتھ ایک بھی نہ ہوگا تو کیا سلطنت نہ ہونے سے ان انبیاء کے درجہ میں کوئی کمی آگئی اگر محض سلطنت کوئی قرب کی چیز ہوتی تو فرعون بڑا مقرب ہونا چاہئے جس نے چار سو برس تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی تھی۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ واللہ اس نبی کے مرتبہ کے سامنے جن کی ساتھ صرف ایک آدمی ہوگا یا ایک بھی نہ ہوگا سلطنت فرعون کی کچھ بھی حقیقت نہیں اتباع احکام کی دولت کے سامنے سلطنت بھی کوئی چیز ہے کہ اس کی مصلحت سے دین میں تصرف کیا جاوے اور احکام کو مصالح ملکی کا تابع بنایا جاوے ہرگز نہیں۔

الغرض ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو بعضوں کو علم نہیں وہ تو جہالت کی وجہ سے گناہوں میں زیادہ مبتلا ہیں اور بعضوں کو علم حاصل ہے تو علم صحیح حاصل نہیں انھوں نے غلط باتوں کو دین سمجھ رکھا ہے اور جن کو علم صحیح بھی حاصل ہے انھوں نے اس کو اغراض و مصالح کے تابع بنا رکھا ہے۔

میں نے اسی سفر میں ایک پردیسی مولوی صاحب کو دیکھا ہے کہ پہلے ان کے لڑکے انگریزی پڑھتے تھے اول تو یہی ان کو زیبا نہ تھا کہ مولانا ہو کر اپنی اولاد کو انگریزی پڑھاویں لیکن خیر اگر انھوں نے یہ سمجھ کر کہ دنیوی ضرورتوں کے لئے اس کا پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ درستی دین کا اہتمام کر لیا جاوے اور اس کا اہتمام انھوں نے کر لیا ہوگا کیونکہ خود عالم تھے۔ تو اب سنئے قوم نے ان پر دباؤ ڈالا کہ انگریزی اسکولوں میں لڑکوں کو پڑھانا موالات میں داخل ہے اپنے لڑکوں کو اٹھاؤ آخر انھوں نے مجبور ہو کر لڑکوں کو وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے وطن بچوں کو بھیجدیا اور وہاں بھی ان کو انگریزی ہی پڑھائی۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر تم نے لڑکوں کو اسکول سے اس لئے اٹھایا تھا کہ انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام ہے تو پھر تین سو کوس پر ان کو بھیج کر انگریزی ہی کیوں پڑھائی اور اگر تمہارے نزدیک انگریزی پڑھانا جائز تھا تو پھر محض قوم کے کہنے سے ایک جائز کام کو ترک کرنا الّو لوگوں کی خوشامد کے لئے ان سے دبنا یہ کب مناسب تھا۔ بھلا خدا کا طالب ہو کر مخلوق کی رضاجوئی کرے اور خوشامد کرکے ان سے دبے طالب کی یہ شان نہیں ہوا کرتی واللہ اہل علم کا تو یہ حال ہونا چاہیئے ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(ترجمہ) اے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب وعشق الٰہی سے تو مست رہے بغیر سونے چاندی کے خزانوں کے تو دولت مند بن جائے گا)

ان کو اپنی فقیری میں مست رہنا چاہیئے اور کسی مالدار یا رئیس سے دین کے معاملہ میں طمع یا ملامت کی وجہ سے نہ دبنا چاہیئے اور اگر کوئی بُرا بھلا کہے تو کہنے دو اس کی ہرگز پرواہ نہ کرو خدا کے طالب ہو کر کسی کی ملامت وطعنہ کی پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔ ہاں اگر کسی جگہ خوف کی صورت ہو تو شریعت سے استفتاء کرو اگر وہ موقع خوف میں درجۂ اکراہ سمجھ کر تم کو معذور سمجھے تو دبنے کا بھی مضائقہ نہیں لیکن طمع اور حرص اور خوف زوال منفعت کی وجہ سے دبنا ہرگز نہ چاہیئے اس میں علاوہ ذلت عنداللہ کے لوگوں میں بھی عزت نہیں ہوتی۔ خدا کی قسم جن عوام کی یہ پرواہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہماری ساتھ لگے لپٹے رہیں ہم کو چھوڑ کر الگ نہ ہو جاویں اول یہ لوگ انہی کی نظروں سے گرتے ہیں کیونکہ حرص وطمع چھپی نہیں رہتی اور حریص کی عزت لوگوں کی نظروں سے گر جاتی ہے ؎

بِئْسَ الطَّعَامُ حِيْنَ الذُّلِّ تَكْسِبُهَا
اَلْقِدْرُ مُنْتَصِبٌ وَالْقَدْرُ مَخْفُوْضٌ

وہ کھانا بہت بُرا جس کو ذلت سے کمایا جاوے انجام کار یہ ہوگا کہ ہانڈی تو چڑھی ہوئی ہوگی اور عزت گری ہوئی قدر کی مناسبت سے۔

ایک لطیفہ یاد آیا۔ لکھنؤ میں ایک کھانا پکتا ہے جس کو شب دیگ کہتے ہیں۔ ایک طالب علم نے اس کا ترجمہ لَيْلَةُ الْقِدْرِ (بکسر القاف) (رات کی دیگ) کیا تھا۔ شب کا ترجمہ لیلہ اور دیگ کا ترجمہ قِدر بس لیلۃ القدر بن گیا۔ خوب سوجھی۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ (شب قدر) تو سنا کرتے تھے۔ اس نے لَيْلَةُ الْقِدْرِ بھی ایجاد کر دی۔ خیر یہ تو ایک

لطیفہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر حال میں احکام شرعیہ کو اپنا رہنما بنانا چاہیئے خواہ مال ملے یا نہ ملے، جاہ حاصل ہو یا نہ ہو طعنے سننے پڑیں یا تعریف۔ کسی بات کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ کسی کے بُرا کہنے سے انسان بُرا نہیں ہوجاتا اور کسی کے بھلا کہنے سے اچھا نہیں ہوجاتا یاد رکھو اگر تم خدا کے نزدیک اچھے ہو تو چاہے ساری مخلوق تم کو کافر و فاسق و زندیق کہے کچھ اندیشہ کی بات نہیں اور اگر خدا کے نزدیک مردود ہو تو چاہے ساری دنیا تم کو غوث و قطب کہے اس سے کچھ بھی نفع نہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اہلِ حق کو اگر آج بُرا کہا جائے گا تو ان شاء اللہ تعالےٰ کسی دِن پھر ان کو اچھا کہا جائے گا اور اہل باطل کی اگر آج مدح ہوگی تو کسی دن اُن کی قلعی ضرور کھلے گی اور ان کے معتقدین ہی ان کو بُرا بھلا کہیں گے۔

شیخ ابن عربی کو ان کے زمانہ میں بہت لوگھل نے کافر و زندیق کہا حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی قبر پر سالہا سال پاخانہ پڑتا رہا تو کیا جہلار کے ان افعال سے نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) شیخ کا درجہ گھٹ گیا ہرگز نہیں تو اگر آج تم کو بھی لوگ بُرا بھلا کہنے لگیں تو کیوں ڈرتے ہو پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ شیخ ابن عربیؒ امام اور شیخ اور صدیق کہلانے لگے اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔ حضرت شیخ نے اس کی نسبت پیشین گوئی بھی فرمائی تھی اِذَادَخَلَ السِّیْنُ فِی الشِّیْنِ ظَھَرَالْمِیْمُ سین سے مراد سلطان سلیم ہیں اور شین سے مراد ملک شام ہے اور میم سے مراد خود حضرت شیخ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب سلطان سلیم ملک شام میں داخل ہوں گے اس وقت محی الدین بن عربی کا ظہور ہوگا چنانچہ جب سلطان سلیم کا شام پر تسلط ہوا ہے اور شیخ کی قبر کا حال معلوم ہوا تو اس کو گندگیوں سے صاف کرایا۔ اور اس پر قبہ تعمیر کیا

اس دن سے شیخ کی قبر زیارت گاہ خاص و عام بن گئی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کچھ معاملہ ہوا سب کو معلوم ہے۔ لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ ان کی کتاب احیاء العلوم کو جلایا گیا تو کیا اس سے ان کی وقعت کچھ کم ہو گئی ہر گز نہیں اس کے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ احیاء العلوم کو سونے کے پانی سے لکھوایا گیا اور آج امام غزالی کے نام کی جو وقعت ہے مخفی نہیں ہر شخص ان کو حجۃ الاسلام اور امام کے لقب سے یاد کرتا ہے اور وہ لوگ جو امام غزالی اور شیخ ابن عربی کو کافر و زندیق کہتے تھے جن کی وقعت اس زمانہ میں بہت کچھ تھی۔ خدا تعالیٰ نے آج ان کے ناموں کو ایسا مٹایا ہے کہ کوئی بھی ان کا نام نہیں لیتا۔

پھر اگر اتباع احکام کی وجہ سے لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ دیں اور تم کو سب کے سب برا بھلا کہنے لگیں تو اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے۔ بہت سے بہت جاہ زائل ہو جائے گی بدنام ہو جاؤ گے سو یہ کوئی نقصان نہیں بلکہ عین منفعت ہے۔ کیونکہ شہرت اور جاہ یہ وہ بلا ہے جو کہ دین و دنیا دونوں کو مضر ہے۔ دینی ضرر تو یہ ہے

؎ اشتہار خلق بند محکم است   بند ایں از بند آہن کے کم است
خویش را رنجور ساز و زار زار   تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اینت گوید نے منم انباز تو   آنت گوید نے منم ہمراز تو
او چو بیند خلق را سر مست خویش   از تکبر میرود از دست خویش

ترجمہ: مخلوق کی شہرت اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کب کم ہے اپنے آپ کو رنجور اور گم نام رکھو تاکہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ ایک کہہ رہا ہے میں آپ کا ہم راز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا

شریک حال ہوں وہ شخص بیچارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سرپرست اور عاشق دیکھتا ہے پس تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔)

جب آدمی دیکھتا ہے کہ ساری دنیا مجھ پر فدا ہے تو اس میں عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے اپنے اوپر نظر کرنے لگتا ہے آخرکار اسی عجب و کبر کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے افسوس بہت لوگ اس ورطہ میں آکر ہلاک ہو گئے یہ تو دین کا ضرر ہوا۔ دنیا کا ضرر یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

خشمہا و چشمہا و رشکہا
برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

یعنی مشہور آدمی کے حاسد بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس صاحب جاہ کو نہ دین کی راحت ہے نہ دنیا کی۔ اس کا دین کبھی خطرہ میں رہتا ہے اور دنیاوی خطروں کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ ہاں جب حق تعالےٰ کی طرف سے بدون تمہاری طلب کے جاہ عطا ہو وہ نعمت ہے اس میں دین کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ ادھر سے تمہاری حفاظت کی جاتی ہے ہاں بعض دفعہ امتحان کے طور پر دنیوی خطرات ایسے شخص کو بھی پیش آجاتے ہیں۔ لیکن جس کو خدا تعالےٰ سے تعلق ہے وہ خطرات سے گھبراتا نہیں کرتا وہ سب کو خوشی کے ساتھ برداشت کرلیتا ہے۔

الغرض جاہ کا طالب ہونا بہت برا ہے اور طلب کے بعد جو جاہ حاصل ہوتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے پھر یہ ساری عزت و جاہ محض خیالی چیز ہے اس سے تم میں کیا کمال پیدا

ہو گیا۔ مر گئے تو کچھ بھی نہیں اب تم مخلوق کی نظر میں اچھے ہوئے تو کیا بُرے ہوئے تو کیا پس آج کل عموماً ایسا ہی علم لفظی و اسمی دیکھا جاتا ہے جو جاہ طلبی میں برباد کیا جاتا ہے حالانکہ واللہ اعلم وہ جوہر ہے کہ اس میں خود ایسی لذت ہے جس کے سامنے سلطنت اور مال و دولت اور جاہ و عزت سب ہیچ ہے مگر ایسا علم محض کتاب خوانی سے میسّر نہیں ہوتا۔ ع

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا

(محض کنز و ہدایہ پڑھتے خدا تعالیٰ کو نہیں پا سکتے)

یہ علم تو اس طرح حاصل ہوگا ؎

قال را بگذار و مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑو حال پیدا کرو اس حال کو پیدا کرنے کے لئے کسی کامل مرد کی جوتیوں میں جا کر پامال ہو)

اگر یہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی کی جوتیوں میں جا کر پامال ہو جاؤ اگر وہ سر پر جوتے بھی مارے تو خوش رہو پھر چند روز کے بعد دیکھنا کہ تمہارے دل میں کیسا استغنا پیدا ہوتا ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ لیکن آج کل یہی بات تو نہیں رہی۔ مولوی اول تو اہل اللہ کے سامنے جاتے نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم عالم ہو گئے اب ہم کو کسی کی کیا ضرورت ہے اور اگر کبھی پیر کی تلاش کا خیال ہوگا اور کسی کے یہاں جاویں گے تو ایسی جگہ تلاش کریں گے جہاں ان کی قدر ہو اور مشائخ بھی علم کا ادب کر کے علماء کی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ اب یہ حضرت اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ پیر صاحب مجھے خلافت عطا فرما دیں پھر غضب یہ ہے کہ بعضے پیر بھی آج کل ایسے ہیں جو یہ سمجھ کر کہ یہ عالِم ہم سے وابستہ رہیں گے

تو ان کی وجہ ہمارا سلسلہ بڑھے گا ایسوں کو خلافت بھی دیدیتے ہیں خوب یاد رکھو کہ ایسے طالب بھی خائن ہیں اور ایسے پیر بھی خائن ہیں بھلا اگر کسی مریض کو اپریشن کی ضرورت ہو اور ڈاکٹر اس خیال سے کہ یہ مریض مجھ سے خوش رہے گا تو زیادہ انعام دے گا بجائے اپریشن کے اس کے زخم پر مرہم لگا دے تو کیا وہ ڈاکٹر خائن نہیں۔ یقیناً اس نے خیانت کی اور بڑا ظلم کیا۔ پس اے وہ شیخ جو کہ مریدوں کے مکدر ہو جانے کے خوف سے ان کے امراض پر ان کو متنبہ نہیں کرتا خدا کے واسطے تو اُن کے حال پر رحم کر اور اے وہ ڈاکٹر جو اپریشن کی جگہ مرہم لگا رہا ہے خدا کے لئے ایسا ظلم نہ کر ورنہ یاد رکھ کہ آج اگر یہ مریض تجھ سے خوش بھی ہو گیا تو کل کو جب یہ زخم ناسور بن جائے گا اس وقت یہ تیرے اوپر لعنت کریگا اسی طرح میں طالب سے کہتا ہوں کہ تجھ کو طبیب کے نشتروں پر صبر کرنا چاہئے۔ جب ہی یہ ناسور اچھے ہو سکتے ہیں ؎

نرم گوید گرم گوید خوش بگیر
تا رہائی یابی از نار سعیر

(اس کی نرمی و گرمی کو خوشی سے برداشت کرو تاکہ تم دوزخ کی آگ سے رہائی پا سکو)

اور اگر یہ نہیں بلکہ تم ہر ڈانٹ پر غصے ہونے لگے تو اس طرح تمہاری صحت دشوار ہے۔ بھلا اگر کسی کے ناسور ہو اور وہ نشتر کے چبھانے پر طبیب سے خفا ہونے لگے تو اس شخص کی تندرستی کی کیا امید ہو سکتی ہے ؎

ور بہر زخمے تو پر کینہ شوی
پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

ترجمہ

(اگر ہر زخم پر کینہ ہوتے ہو یعنی مرشد کی ہر تنبیہ پر ناک بھوں
چڑھاتے ہو تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے)

مولانا نے اس مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے ؎

حکایت :۔ ہے کہ ایک شخص ایک گودنے والے کے پاس گیا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنا دے۔ اس نے اپنا کام شروع کیا اور ایک جگہ سوئی کو لگایا اس نے آہ کی اور اس نے پوچھا کیا بنا رہے ہو کہا مُنہ بنا رہا ہوں کہنے لگا کہ یہ شیر کھادے پیویگا تھوڑا ہی جو اس کو منہ کی ضرورت ہو بس منہ کو رہنے دو۔ اس نے دوسری جگہ سوئی کو کچ سے چبھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو کہا دُم بنا رہا ہوں۔ کہنے لگا بعضے دُم کٹے شیر بھی ہوتے ہیں دُم کی ضرورت نہیں کچھ اور بناؤ اس کو رہنے دو۔ اس نے تیسری جگہ سوئی کو چبھایا اس نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو آنکھیں بولا اس کو آنکھوں کی کیا ضرورت ہے کوئی دیکھنا تھوڑا ہی رہ گیا ہے اس کو بھی چھوڑو۔ اس نے چوتھی جگہ سوئی کو چبھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو کہا شکم کہنے لگا اونہہ اسے شکم کی کیا ضرورت ہے کچھ کھانا پیتا تھوڑا ہی ہے تو مصوّر نے جھلا کر سوئی پھینکدی اور کہنے لگا ؎

شیر بے گوش وسر واشکم کہ دید
ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

(شیر بے دم وسر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر
تو خدا نے بھی نہیں پیدا کیا)

بندۂ خدا! ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا جس کے نہ شکم ہو نہ مُنہ ہو نہ دم ہو نہ آنکھیں۔ جب تجھ کو سوئی کی تکلیف پر صبر نہیں تو شیر کی تصویر ہی کیوں بنواتا ہے جا اپنا کام کر ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن
بس تو از شیر ژیاں کم دم بزن

(یعنی جب تم میں سوئی چبھنے کی طاقت نہیں ہے تو تم شیر ہونے کا دعوٰے مت کرو۔

صاحبو! اگر علم حقیقی اور علم نافع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا تو یہی راستہ ہے یہی طریقہ ہے نشتر اور زخم کھانے پڑیں گے یعنی اپنی طرف سے اس کے لئے بھی آمادہ ہونا پڑے گا۔ باقی اس کا میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جب تم اپنی طرف سے ہر طرح کی ذلت اور رسوائی کے لئے آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر مشائخ کاملین تم سے سختی کا برتاؤ نہ کریں گے یہ حضرات بہت رحمدل اور شفیق ہوتے ہیں۔ البتہ اگر تمھارے اندر عجب و کبر کا مادہ رہا تو پھر یہ ناسور تو اپریشن ہی سے اچھا ہوگا اس کا تو یہی راستہ ہے۔ اگر یہ راستہ پسند نہیں تو پھر تمھارا اس منزل میں آنا ایسا ہوگا جس کی بابت ارشاد ہے۔

وَ لَیْسَ البرّ بان تاتوالبیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقیٰ و اتواالبیوت من ابوابھا۔

(اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازہ سے آیا کرو)

ہر کام اصول سے اور انتظام ہی سے اچھا ہوتا ہے خلاف اصول جو کام ہوگا خراب ہوگا۔

صاحبو! میں اس علم نافع کی ضرورت آپ کو بتلا رہا ہوں یہ وہ علم ہے جو خلوص سے حاصل ہوتا ہے اس کی کوشش کیجئے اور یاد رکھئے کہ احادیث و قرآن میں جہاں علم کی فضیلتیں مذکور ہیں وہاں یہی علم مراد ہے۔ جو خلوص کے ساتھ حاصل ہو اور جو علم طلب جاہ وغیرہ کے لئے ہو یا جو اغراض و مصالح کا تابع ہو وہ علم مراد نہیں۔ چنانچہ اس حدیث نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے جس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلے تین شخصوں کو بلایا جائیگا اوّل شہید، پھر عالم، پھر سخی۔

شہید سے سوال ہوگا کہ تو نے ہمارے واسطے کیا کیا، وہ کہے گا الٰہی میں نے اپنی جان آپ کے واسطے فدا کر دی تھی۔ ارشاد ہوگا جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے جان اس واسطے دی تھی تاکہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا بہادر ہے۔ لِیُقَالَ اِنَّكَ جَرِیٌٔ (تاکہ کہا جائے تو بڑا بہادر ہے) یعنی کیسی جان دی، عدالت میں کیسا اظہار دیا، بڑی جرات سے جواب دیا۔ فَقَدْ قِیْلَ (تو بہادر کہا گیا) یعنی لوگوں میں بہت تعریف ہوچکی اور تمہارا مقصد پورا ہوچکا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو جہنّم میں گھسیٹ کر ڈال دو۔

پھر عالم صاحب بلائے جائیں گے، اُن سے بھی یہی سوال ہوگا کہ تم نے ہمارے واسطے کیا کیا، وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو پڑھایا، فتوے دیئے، مسئلے بتلائے۔ ارشاد ہوگا جھوٹ بولتے ہو بلکہ تم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا تاکہ تم کو عالم کہا جائے فَقَدْ قِیْلَ (سو تم کو عالم کہا گیا) بہت لوگ آپ کو مولوی و مولانا کہہ چکے خوب تعریفیں ہوچکیں اور تمہارا مدعا حاصل ہوچکا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو بھی گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو۔

اسی طرح سخی کے بارے میں وارد ہے۔

صاحبو! ریا اور حبِ جاہ سے بچو یہ بہت بُری بلا ہے۔

اب میں علم کی اس تقسیم کی بابت جو اس آیت میں وارد ہوئی ہے کچھ عرض کر کے بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو کچھ خدا تعالیٰ نے میرے قلب میں ڈالا ہے میں وہ بیان کر دوں گا گو اس سے بھی اچھی توجیہ ممکن ہو جس کے پاس اس سے اچھی توجیہ ہو وہ اس کو پیش کر دے۔

میرے نزدیک اس آیت سے تمام علوم درسیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے اس طرح کہ کتاب منیر سے تو مراد علم نقلی ہے کیونکہ کتاب میں اصلی نقلی ہی ہوتا ہے مگر مراد مطلق علم نقلی نہیں ہے بلکہ علم استدلالی مراد ہے۔ چنانچہ علم کے مقابلہ سے اس کی تعیین معلوم ہوتی ہے اور ھُدًی سے مراد علم عقلی ہے کیونکہ نقلی کا مقابلہ اسی کو مقتضی ہے۔ لیکن یہاں بھی علم استدلالی عقلی مراد ہے۔ مطلق عقلی مراد نہیں کیونکہ ھُدًی میں معنے دلالت کے ماخوذ ہیں اور استدلالی کی یہی شان ہوتی ہے اور اس سے پہلے فرمایا ہے بغیر علم (علم کے بغیر) اس سے علم ضروری مراد ہے کیونکہ اگر اس سے علم عقلی یا نقلی کسی مراد لیا جاوے تو تکرار لازم آئے گا اور اگر مطلق علم مراد لیا جاوے تو قسیم کا مقسم بننا لازم آئے گا۔ شق اول غیر مناسب اور شق دوم ناجائز ہے اس لئے میرے نزدیک اس سے علم ضروری مراد ہے۔

پس یہاں علم کی یہ اقسام مذکور ہیں۔ علم ضروری و علم کسبی۔ اور کسبی کی دو قسمیں استدلالی عقلی و استدلالی نقلی ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اس کی ساتھ یہ ملایا جاوے کہ مقاصد کے

مقدمات بھی مقاصد کے حکم میں ہوتے ہیں اِنَّ مُقَدَّمَۃَ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ (واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے)

اب تمام علوم درسیہ اس آیت میں داخل ہو گئے کیونکہ علوم درسیہ میں بعض علوم ضروریہ ہیں اور بعض استدلالی عقلی کی قسم سے ہیں اور بعض استدلالی نقلی میں داخل ہیں اور بعض علوم ان کے لئے مقدمات ہیں جیسے نحو و صرف و بلاغت وغیرہ۔ اسی لئے میں اس وعظ کا نام

تعظیم العلم مع تقسیم العلم

رکھتا ہوں

اگرچہ یہ نام طویل ہے مگر اس عنوان سے معنوں پر دلالت واضح ہے۔

خلاصہ بیان یہ ہے کہ علوم شرعیہ کی سخت ضرورت ہے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے اگر تمام علوم درسیہ کی تحصیل دشوار ہو تو بقدر ضرورت ہی حاصل کر لیجئے لیکن علم حاصل کرنے کے بعد بے فکر نہ ہو جانا کیونکہ مقصود محض علم ہی سے حاصل نہیں ہوتا ہاں یہ ضرور ہے کہ علم اس مقصود کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

اصل چیز کچھ اور ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ
بے عنایاتِ خدا ہیچیم و ہیچ

(یعنی گو ہم نے بہت سی وعظ و نصیحت کی ہے لیکن کسی کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالیٰ کی عنایت نہ ہو ہم محض ہیچ ہیں)

اصل مقصود جب حاصل ہو گا جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کی

کشش اور آپ پر عنایت ہوگی۔ چونکہ مولانا شیخ اور مربی ہیں اس لئے آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم ان عنایات الٰہیہ کے مورد کیونکر ہو سکتے ہو ؎

بے عنایات حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(یعنی بغیر خدا تعالے اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرضاً فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق اعمال محض سیاہ ہوگا)

یعنی خدا تعالیٰ سے بلا واسطہ تعلق حاصل نہیں ہوسکتا یہ عادۃ اللہ کے خلاف ہے. بلکہ خاصان حق کے ذریعہ سے تعلق ہوسکتا ہے پھر تم بھی ان کی طرح مورد عنایات ہو جاؤ گے اور نصرۃ الٰہی تمھارے ساتھ ہو جائے گی خاصانِ خدا سے جدا رہ کر توفیق الٰہی تمھارے ساتھ نہیں ہوسکتی خوب سمجھ لو. خلاصہ یہ کہ خاصان حق سے طریقہ اور تدبیر سیکھو اور خدا تعالےٰ سے دعا کرو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کامیابی میں دیر نہ ہوگی اب دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ ہم کو فہم سلیم و عمل مستقیم کی توفیق عطا فرماوے آمین۔

وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ
وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اس کے بعد حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے تھوڑی دیر تک حسب عادت ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔ پھر اہل مدرسہ کے اصرار پر طلبہ کو انعام اور سند وغیرہ اپنے ہاتھ سے عطا فرمائی اس سے فراغت پاکر جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِکَ (جامع عفا اللہ عنہ)

تمت بالخیر

البنیان المشید ترجمہ اردو البرہان المؤید

از عارف کامل ولی بے مثل مالک گنجینہ عوارف لدنی شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ یہ وہی شیخ احمد کبیر قدس سرہٗ ہیں جنکی پیدائش سے چالیس سال قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپکے ماموں کو بشارت دی تھی کہ تمہاری بہن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام احمد رکھنا وہ اولیاء کرام میں وہ ایسا ہی سردار ہوگا جس طرح کہ میں انبیاء کا سردار ہوں چنانچہ آپ کو وہ مرتبہ عطا ہوا تھا جو کسی دوسرے ولی اللہ کو میسر نہ ہوا ہوگا مثلاً جب آپ ۵۵۵ھ میں زیارت بیت اللہ کو تشریف لے گئے تو سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی زیارت کیلئے بھی حاضر ہوئے۔ گنبد خضرا صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچکر آپنے باآواز بلند کہا السلام علیک یا جدی فوراً روضہ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے ندا آئی وعلیکم السلام یا ولدی اس ندا مبارک کو سنکر آپ پر وجد طاری ہوگیا آپکے علاوہ جتنے آدمی وہاں موجود تھے سب نے آواز کو سنا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپنے دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ تھا کہ جدائی دوری کی حالت میں تو اپنی روح کو روضہ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجتا تھا کہ میری طرف سے آپکے آستانہ بوسی کا شرف حاصل کرلے اور جبکہ دولت دیدار مجھے اصالتاً حاصل ہے تو آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر سعادت حاصل کروں۔ اسی وقت روضہ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا۔ اور آپنے اسے بوسہ دیا، اس وقت روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً نوے ہزار عاشقان جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشتاقان روضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مجمع تھا جنھوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور سرور کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ان میں شیخ عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت شیخ عدی اور حضرت شیخ عبدالرزاق حسینی واسطی جیسے جلیل القدر بزرگ بھی تھے، اس واقعہ کو اس کثرت سے علماء نے بیان کیا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال نہیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جب اس ترجمہ کا معائنہ فرما رہے تھے تو ایک روز اپنی مجالس خاص میں فرمایا کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی کتاب کے ترجمہ سے مجھے ایسی خوشی ہوئی ہو جیسی اس کتاب کے ترجمہ سے ہوئی۔ ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ سالکین روزانہ بطور ورد کے اس کا مطالعہ کیا کریں، یہ کتاب نایاب ہوچکی تھی اب دوبارہ طبع کی ہے۔

اسکے ساتھ روح تصوف وعظ تصوف بھی شامل ہیں جس میں حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے موافق البرہان المؤید کے خاص قیمتی مضامین کو خلاصہ کرکے الگ کر دیا گیا ہے، مناسب معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ حضرت حکیم الامۃ کے رسالہ مبادی التصوف بھی شامل کر دیا جائے جس کا مطالعہ مبتدیان سلوک کے لئے بہت مفید اور نافع ہے اس طرح یہ مجموعہ سب ہی کے لئے کافی شافی ہوگا معرفت وحقیقت کا نایاب خزانہ ہے امید ہے کہ برادران اسلام عموماً اور برادران سلسلہ امدادیہ اشرفیہ تھانوی خصوصاً اس کی قدر فرمائیں گے۔ قیمت مجلد ۲۵/ روپیے علاوہ ڈاک خرچ۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ تھانوی متصل مسافرخانہ بندر روڈ کراچی ۱
ایم۔ اے جناح روڈ

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً"

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

اَلْکَمَال فِی الدِّیْن

(للرّجَال)

حکیمُ الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمّد اشرفؒ علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمّد عبدُ المنّان غُفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی — دفتر الابقاء

مسافرخانہ بندر روڈ کراچی
ایم اے جناح روڈ

ضروری اطلاع: خط وکتابت کرتے وقت یا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کیا کریں۔

الکمال فی الدین

(للرّجال)

این	کہاں ہوا	دہلی مسجد پنجابیان۔ محلہ بلیماران
متے	کب ہوا	۲۵ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ بروز یکشنبہ بوقت صبح شروع ۷ بجکر ۵ منٹ پر ہوا۔
کم	کتنی دیر ہوا	۳ گھنٹے ۲۰ منٹ (۱۱ بجے ختم ہوا)
کیف	کیونکر ہوا	کھڑے ہوکر۔
لم	کس لئے ہوا	حافظ محمد اسمٰعیل صاحب سوداگر کلکتہ کی دعوت پر تشریف لیگئے اور چند مخلصین کی درخواست پر وعظ فرمایا۔
ماذا	کیا مضمون تھا	تکمیل دین کی ضرورت اور اسکا سہل طریقہ اور ناکامی کا سبب اور اس کا ازالہ۔
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	عموماً ہر طبقہ کو بالخصوص ان لوگوں کو جو جاہل درویشوں کے ہاتھوں میں پھنسکر مقصود کے رہجاتے ہیں زیادہ مفید تھا۔
من ضبط	کس نے ضبط کیا	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ وغفر الوالدہ ومشائخہ واخوانہ اجمعین۔
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	تقریباً تین ہزار سے زیادہ مجمع تھا۔
الاشتات	متفرقات	اس وعظ کا سامعین پر بہت گہرا اثر ہوا چنانچہ اس کے بہت جلد صاف کرنے اور شائع کرنیکی درخواست کی گئی بلکہ بعض مخلصین نے عموماً تمام مواعظ کی اشاعت کا سلسلہ قائم کرنیکی خواہش ظاہر کی بارک اللہ فیہم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ط

یہ ایک مختصر آیت ہے جس میں حق تعالے نے ایک مقصود کا بیان فرمایا ہے اور اس کے

ساتھ ہی اس کے طریق کی تعیین فرمائی ہے اور آگے چل کر میں اس کو واضح کردوں گا کہ وہ طریق نہایت ہی سہل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر انسان کا ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک اس کی تحصیل کا طریق ہوتا ہے۔ پھر طریق کبھی سہل ہوتا ہے کبھی دشوار۔ اگر مقصود متعین ہو اور اس کا طریق معلوم ہو اور وہ طریق سہل بھی ہو تو بہت جلد کامیابی ہوجاتی ہے ناکامی کا راز صرف یہی ہے کہ یا تو مقصود متعین نہ ہو یا طریق صحیح معلوم نہ ہو۔ یا وہ طریق دشوار ہو جس کے حاصل کرنے کی ہمت نہیں۔

مثلاً ایک شخص بیمار رہے اس کی ناکامی کا سبب کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس کو صحت کا مقصود ہونا معلوم نہ ہو اس لئے وہ صحت کے لئے کوشش اور تدبیر ہی نہیں کرتا یا صحت کا مقصود ہونا تو معلوم ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ صحت حاصل کرنے کا طریقہ معالجہ ہے یا یہ بھی معلوم ہے لیکن طریق معالجہ میں غلطی کررہا ہے صحیح طریق پر نہیں چلتا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مقصود بھی معلوم، طریق بھی معلوم اور اس کا صحیح ہونا بھی معلوم مگر ہمت نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ معلوم ہے کہ مقصود صحت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا طریق معالجہ ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ طبیب ماہر فن ہے جو صحیح طریق سے معالجہ کرتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ حکیم صاحب نے سو روپیہ کا نسخہ لکھ کر دیا ہے اور یہ شخص غریب ہے جو سو روپیہ کا نسخہ استعمال کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح تمام دنیوی امور میں ناکامی کا سبب یہی ہوتا ہے کہ کبھی مقصود معلوم نہیں ہوتا کبھی طریق معلوم نہیں ہوتا کبھی طریق میں غلطی ہوتی ہے کبھی طریق دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو کسب کا مقصود ہونا ہی معلوم نہیں اس لئے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے یا کسب کا مقصود ہونا معلوم ہے مگر اس کا طریق معلوم نہیں یہ دونوں شخص بھوکوں مریں گے۔ یا کسب کا طریق معلوم ہے لیکن سب نے معاش حاصل کرنے کا طریق تجارت کو بتلایا کیونکہ وہ لوگ تجارت کرنے والے تھے اور ان کو تجارت میں بہت کچھ نفع ہوچکا تھا اس لئے وہ ہر شخص کو یہی بتلاتے ہیں کہ معاش

کا طریق تجارت مگر اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس شخص نے کبھی روپیہ کی صورت نہیں دیکھی۔ یہ شخص بھی بھوکا مرے گا کیونکہ گو اس کو مقصود بھی معلوم ہے طریق بھی جانتا ہے لیکن لوگوں نے اس کو ایسا طریقہ بتلایا ہے جو اس کے قبضہ سے باہر ہے۔ کسی شفیق نے اس کو مزدوری کا طریقہ نہیں بتلایا جس میں صرف ہاتھ پیر چلانے کی ضرورت ہے۔ روپیہ کی کچھ ضرورت نہیں۔ غرض اسی طرح تمام کاموں میں غور کر لیجئے تو ناکامی کا راز بھی معلوم گا۔

عدم تعیین مقصود۔ و عدم تعیین کا طریق یا عدم سہولت۔ اور ان دونوں کی تعیین و تسہیل کے بعد جو ناکام رہے گا وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام رہے گا یہ شخص حصول مقصود کا طریق محض تمنا کو سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے محض تمنا واسطہ ہونے کے قابل نہیں۔ مثلاً ایک شخص گھر میں غلہ جمع کرنا چاہے لیکن نہ کھیتی کرے نہ بیج ڈالے نہ کچھ کرے تو اس کا گھر غلہ سے ہرگز نہ بھرے گا۔ گو وہ کتنی ہی تمنا کرتا ہے کیونکہ عادۃ اللہ اس طرح جاری نہیں ہے کہ محض تمنا سے گھر بھر جایا کرے یوں قدرت ظاہر کرنے کے لئے کبھی حق تعالے ایسا کر دیں تو وہ شاذ و نادر ہے والنادر کالمعدوم۔ خدا تعالے کی قدرت میں یہ ضرور ہے کہ بدون کسب وغیرہ کے بھی گھر بھر دیں اور بعض دفعہ اس کا وقوع بھی ہوا ہے کہ بعض لوگوں کو بے گمان کسی جگہ سے خزانہ مل گیا اور وہ امیر کبیر ہو گئے مگر اس کا وعدہ نہیں ہے۔ پس جب نہ عادۃ اللہ اس طرح جاری ہے نہ کوئی وعدہ کیا گیا ہے پھر کس بھروسے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا جاوے۔ مثلاً حق تعالے نے اپنی قدرت دکھلانے کے لئے حضرت مریم علیہا السلام کو ایک بیٹا بدون باپ کے دیا تھا مگر عادۃ اللہ یہی ہے کہ بدون باپ کے لڑکا نہیں ہوتا۔ اب اگر کوئی عورت اولاد کی تمنا کرے اور یوں چاہے کہ مریم علیہا السلام کی طرح میرے بھی بدون نکاح کے لڑکا ہو جائے تو اس کو سب پاگل کہیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس کو اولاد مقصود نہیں ہے اگر اولاد مقصود ہوتی تو یہ نکاح ضرور کرتی۔ اسی طرح حق تعالے نے آدم علیہ السلام کو بدون ماں باپ کے پیدا کیا

تھا اب اگر کوئی مرد یہ تمنا کرنے لگے کہ میرے بھی کوئی لڑکا آدم علیہ السلام کی طرح ہو جائے کہ نہ مجھے نکاح کرنا پڑے نہ عورت کے پاس جانا پڑے۔ پس مٹی سے بنا بنایا پتلا پیدا ہو جائے تو سب لوگ اس کو احمق سمجھیں گے اور یہی کہیں گے کہ اس کو اولاد مقصود نہیں ورنہ یہ نکاح ضرور کرتا۔ غرض دنیا کے کاموں میں تمام عقلاء اسباب کے اختیار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور محض تمنا کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ تمنا مجرد عن الاسباب کو حماقت پر محمول کرتے ہیں حالانکہ بعض اسباب پر مسبتیاب کا ترتب یقینی بھی نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ تجارت کرتے ہیں اور ان کو نقصان ہوتا ہے۔ بعض ملازمت کرتے ہیں اور تنخواہ نہیں ملتی۔ بعضے محنت مزدری کرتے ہیں مگر مزدوری نہیں ملتی۔ بعضے صنعت و حرفت جانتے ہیں اور ان کو کوئی کام پر نہیں لگاتا۔ لیکن محض توقع کی بنا پر سب عقلائ نے ان اسباب کی ضرورت پر اتفاق کر لیا ہے مگر حیرت در حیرت ہے کہ دین میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا حالانکہ وہ مقصودیت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ مسلمان کا عقیدہ ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے پھر اس کے طرق بھی معین و معلوم ہیں اور ان طرق کی صحت بھی معلوم ہے کیونکہ خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا صادق ہونا مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہے۔ پھر وہ طرق و اسباب دشوار بھی نہیں یہ مطلب نہیں کہ ان کے لئے ارادہ کی بھی ضرورت نہیں میں ارادہ کی نفی نہیں کرتا بلکہ مشقت کی نفی کرتا ہوں کہ اسباب دینیہ میں دشواری اور مشقت کچھ نہیں ارادہ کی بیشک ضرورت ہے۔ اور اس کی سب سے بڑھ کر دلیل حق تعالے کا ارشاد ہے ما جعل علیکم فی الدین من حرج اور یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (ترجمہ) خدا نے تمھارے لئے دین میں کچھ تنگی نہیں کی۔ حرج نکرہ تحت نفی ہے جو عموم کو مفید ہے مطلب یہ ہوا کہ خدا نے دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی۔ اس میں مطلق کچھ دشواری نہیں۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے کہ خدا تعالے تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں تم کو دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ قرآن پر مسلمانوں کا

ایمان ہے اس لئے اس دعوے کے ثابت کرنے کے لئے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ حق تعالےٰ فرمارہے ہیں کہ دین میں کچھ تنگی نہیں لیکن میں اسی اکتفا نہیں کرتا بلکہ ترقی کرکے کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ عقلاً بھی ثابت ہے کیونکہ جس وقت قرآن نازل ہوا ہے تمام کفار اس کی مخالفت پر آمادہ اور اس میں عیب نکالنے کے درپے تھے وہ قرآن کی تکذیب کے لئے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ ادھر قرآن میں تمام عالم کو دعوت دی گئی کہ وہ قرآن کا مثل بنالادیں جس سے ان کو اور بھی زیادہ اشتعال ہوگیا تھا پھر اس وقت سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں ملاحدہ اور مخالفین نے قرآن پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے اور قرآن میں یہ دعوے بڑے شد و مد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ دین میں کچھ تنگی نہیں اگر یہ دعوے کمزور ہوتا اور اس میں کچھ بھی خلاف واقع ہونے کی بو ہوتی تو ملاحدہ اور کفار و مشرکین ہرگز اعتراض سے نہ چوکتے وہ ضرور اس کی تکذیب کرتے اور قرآن کی مخالفت کے لئے اچھا خاصہ بہانہ اُن کے ہاتھ آجاتا کہ دیکھئے قرآن کا یہ دعوے کتنا خلاف واقع ہے کہ جو دین اس قدر دشوار ہے اس کو آسان بتلایا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ تنگی نہیں ہے۔ لیکن کسی ملحد یا مخالف نے آج تک قرآن کے اس دعوے کی تکذیب نہیں کی ورنہ اور اعتراضوں کی طرح یہ اعتراض بھی ضرور منقول ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مخالفین کو اس دعویٰ میں چون و چرا کی کچھ بھی گنجائش نہیں ملی۔ مگر افسوس ہے اس زمانہ میں قرآن پر اعتقاد رکھنے والے یعنی بعضے مسلمان اس دعوے پر اعتراض کرتے ہیں جس پر مخالفین کو بھی حرف گیری کا موقع نہ ملا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو اس پر اعتقاد نہیں۔ اعتقاد تو ہے مگر حالت یہ ہے کہ اگر وہ قرآن کے اس دعوے کی تکذیب نہیں کرتے تو دل کھول کر تصدیق بھی نہیں کرتے اس کی تصدیق کرتے ہوئے ان کے دل رُکتے ہیں۔ مگر جس مسئلہ کو مخالف بھی تسلیم کرچکا ہو اس پر مسلمانوں کا اعتراض کرنا بڑی شرم ناک بات ہے۔

صاحبو! میں بقسم کہتا ہوں کہ قرآن کا یہ دعویٰ بالکل سچا اور صحیح ہے اگر اسمیں

پ کچھ بھی کمزوری ہوتی تو ملاحدہ ہرگز نہ چوکتے خصوصًا جبکہ وہ ان کمزور مسلمانوں کے وہ دلائل بھی سُن لیتے جو آج کل اس کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں کہ صاحب دین پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ اگر تجارت کرو تو بات بات پر شریعت کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں ربوا لازم آگیا۔ اس صورت میں ثمن مجہول ہے اس لئے بیع فاسد ہے۔ اس صورت میں یہ شرط فاسد ہے کسی صورت میں جہالت بیع کی وجہ سے بیع فاسد ہے اور ہم کو تجارتی معاملات اہلِ یورپ سے اس طریق پر کرنے پڑتے ہیں جو ان کے یہاں رائج ہے اور اہلِ یورپ بالکل آزاد ہیں ان کے معاملات کی اکثر صورتیں خلافِ شریعت ہیں۔ اب اگر تجارت کریں تو دین پر کس طرح قائم رہیں اور دین پر قائم رہیں تو تجارت کس طرح چلے۔ قرض بلاسود کہیں سے نہیں ملتا اور تجارتی کاروبار بدون قرض کے نہیں چل سکتا اب کریں تو کیا کریں۔ ملازمت کا حال یہ ہے کہ اس میں بھی بعض کام خلاف شرع کرنے پڑتے ہیں۔ زراعت میں بھی قدم قدم پر شرعی احکام رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ میں ان سب اعتراضوں کا بھی جواب دوں گا بلکہ اور بھی کوئی اعتراض کسی کے ذہن میں ہو تو ان شاء اللہ وہ بھی اس جواب سے حل ہو جائے گا۔ مگر جواب سے پہلے میں ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اگرچہ حکایت گندی ہے مگر اس حالت کے بالکل ہی مطابق ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ مثال سے مضمون جلدی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

ہمارے قصبے میں ایک عورت مغرب کے وقت اپنے بچہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی چاند رات کا موقع تھا بچے اور عورتیں عید کا چاند دیکھ رہی تھیں یہ عورت بھی بچہ کو پونچھ پانچھ کر چاند دیکھنے کھڑی ہوئی، جلدی میں کچھ پاخانہ انگلی کو لگا رہ گیا جلدی میں اُسے خبر نہ رہی کہ میری انگلی میں کیا لگا ہوا ہے۔ اس نے عورتوں کی عادت کے موافق ناک پر انگلی رکھ کر چاند دیکھا تو اس میں سے پاخانہ کی بدبو آئی۔ تو آپ فرماتی ہیں کہ اے ہے ایکے عید کا چاند سڑا ہوا کیوں نِکلا۔ تو جس طرح اس عورت کو اپنی انگلی کا پاخانہ چاند میں محسوس ہوتا تھا اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ چاند سڑا ہوا نکلا ہے۔

اب صاجو! خدا کی قسم اسی طرح تم کو جو دین میں تنگی نظر آرہی ہے یہ دین کی تنگی نہیں بلکہ حقیقت میں یہ تنگی تمہارے اندر ہے۔ تمھارے تمدن اور معیشت میں تنگی ہے جس کو میں آگے وضاحت کے ساتھ بتلادوں گا مگر آپ کی یہ حالت ہے کہ اپنی انگلی کو تو آپ دیکھتے نہیں کہ اس میں نجاست لگی ہوئی ہے خواہ مخواہ ماہتاب شریعت کو بدبودار بتاتے ہیں حالانکہ وہ اتنی بلندی پر ہے کہ یہ گندگیاں اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتیں۔

جیسے ایک حبشی کا قصہ ہے کہ اس کو راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا تو آپ نے اس کو اٹھا لیا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھنا شروع کیا تو ایک ڈراونی صورت بھدّی شکل اس میں نمودار ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ یہ صورت اس آئینہ میں پہلے ہی سے بنی ہوئی ہے اپنی نسبت یہ بدگمانی نہ ہوئی کہ شاید یہ میری ہی صورت دلفریب ہو کیونکہ آدمی کو اپنی صورت تو نظر نہیں آتی اس لئے اپنی صورت کا بُرا بھلا ہونا خود کو کم معلوم ہوتا ہے تو اس حبشی نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اُسے پھینکدیا اور کہا ایسی بُری صورت کا تھا جبھی تو تجھے کوئی یہاں پھینک گیا۔

صاجو! اسی طرح آپ کو اپنی مہیب صورت دین کے آئینہ میں نظر آتی ہے جس کو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا بھدّا پن نعوذ باللہ دین کے اندر ہے۔ حالانکہ اس میں تو اس قدر صفائی اور نور ہے کہ ظلمت اور سیاہی کا وہاں نام بھی نہیں لیکن شفاف ہونے کی وجہ سے آپ کو اپنی صورت اس میں نظر آرہی ہے جس کو آپ مزین کی صورت سمجھے ہوئے ہیں اس کی نظیر میں مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(حملہ خود تو اپنے اوپر کرتا ہے اے سادہ مرد مثل اس شیر کے جس نے اپنے اوپر خود حملہ کیا تھا)

اس کا قصہ مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ۔ ایک مرتبہ نخچیروں نے باہم مشورہ کیا کہ شیر روزانہ ہم کو پریشان کرتا ہے اور ایک دو کو شکار کر لیتا ہے جس سے ہر ایک کو روزانہ اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے اور اس خطرہ سے زندگی تلخ رہتی ہے آؤ ہم سب چل کر شیر سے یہ کہیں کہ وہ اس طرح ہم کو پریشان نہ کیا کرے ہم روزانہ اپنے میں سے ایک کو اس غذا کے لئے بھیجدیا کریں گے جس سے دوسروں کو تو اطمینان ہو جائے گا چنانچہ سب نے جاکر شیر سے یہ بات کہی اس نے منظور کر لیا کیونکہ اس میں اس کو بھی راحت تھی کہ روزانہ بے محنت و مشقت گھر بیٹھے غذا مل جایا کرے گی۔ اب نخچیروں نے قرعہ ڈال کر روزانہ ایک شکار کو شیر کے پاس بھیجنا شروع کیا جس کا نام قرعہ میں نکل آتا سب اس کو مجبور کر کے شیر کے پاس بھیجدیتے۔

ایک دن خرگوش کی باری آئی سب نے اس سے کہا کہ جاؤ آج شیر کی غذا تم ہی ہو کہنے لگا کہ میں تو نہیں جاتا یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنے ہاتھوں موت کے منھ میں چلا جاؤں۔ یہ تو خودکشی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بھائی یہ بات مناسب نہیں شیر سے وعدہ خلافی ہو گی کہنے لگا کہ یہ وعدہ خود ہی ناجائز ہے کیونکہ یہ خودکشی کو مستلزم ہے اور ناجائز وعدہ کا ایفا واجب ہی نہیں اب تو نخچیروں میں کھلبلی پڑ گئی سارے اکھٹے ہو گئے اور خرگوش کو سمجھانے لگے کہ اگر تو نہ گیا تو شیر کو غصہ آجائے گا۔ اس نے کہا کہ بلا سے اگر اُسے غصہ آویگا تو سبھی پر آوے گا پھر جس کی موت آگئی ہو گی اسے کھا لے گا۔ ممکن ہے کہ اس صورت میں میں بچ جاؤں اور جو صورت تم تجویز کر رہے ہو اس میں تو میری موت یقینی ہے اور موت محتمل پر موت یقینی کو کون گوارا کر سکتا ہے یہ تو بالکل عقل کے خلاف ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اس وعدہ خلافی سے فتنہ برپا ہو جائیگا اس نے کہا میرے لئے تو آج ہی فتنہ آگیا مجھے فتنہ کی کیا پرواہ ہے۔ میرے لئے موت سے بڑھ کر کیا فتنہ ہے۔ بیش بریں نیست کہ وہ غصہ میں

آ کر مجھے کھالے گا تو یہی تجویز تم میرے واسطے کر رہے ہو اتنا فرق ہے کہ اس وقت میں خود موت کے منہ میں جا رہا ہوں اور رفتہ کے وقت میں اپنے بچنے کی پوری کوشش کروں گا پھر بھی اگر مر گیا تو تقدیر ہے لیکن وہ صورت اس سے اہون ہے کیونکہ اس میں خودکشی تو نہ ہوگی۔ جب نخچیروں نے دیکھا کہ دلائل سے یہ قائل نہیں ہوتا تو اب برادری کے زور سے کام لیا اور سب نے اس پر دباؤ ڈالا کہ نہیں تم کو ضرور جانا ہوگا اگر تم نہ جاؤگے تو ہم جبراً تم کو شیر کے سپرد کر دیں گے۔ بالآخر برادری کے دباؤ سے خرگوش مجبور ہو کر چلا۔ مگر راستہ میں سوچنے لگا کہ کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیئے کہ جس سے جان بھی بچ جائے اور برادری بھی ناخوش نہ ہو۔ راستے میں اسے کنواں نظر پڑا جس میں پانی بھرا ہوا تھا، خرگوش بہت خوش ہوا کہ بس شیر کو اسی کنویں میں ڈبو دینا چاہیئے۔ اس کے بعد وہ شیر کے پاس پہنچا۔ شیر کے راتب میں چونکہ آج بہت دیر ہوگئی تھی اس لئے وہ پیچ وتاب کھا رہا تھا اور یہ خیال کر رہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے ان نخچیروں نے اپنے وعدہ کو بدل دیا ہے پس میں آج جا کر ان کو کافی سزا دوں گا خرگوش کو دیکھ کر شیر بہت غرایا اور اس کو برا بھلا کہنے لگا کہ آج معمول سے زیادہ دیر کیوں ہوئی معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے دلوں میں وعدہ خلافی کا خیال پیدا ہوا ہے۔ خرگوش نے کہا کہ حضور آپ پہلے ہمارا واقعہ تو سن لیں اس کے بعد ہی غصہ کیجیئے گا۔ آج مجھ کو آنے میں دیر اس لئے ہوئی کہ آپ کی دارالسلطنت میں ایک قوی دشمن گھس آیا ہے جس نے راستہ روک رکھا ہے اور یوں کہتا ہے کہ تم بجائے فلاں شیر کے مجھ کو راتب دیا کرو اس کو مت دیا کرو۔ اور آج آپ کے راتب کے لئے ایک بڑا موٹا خرگوش تجویز ہوا تھا وہ میرے ہمراہ راستہ میں آ رہا تھا کہ اس کو دوسرے شیر نے پکڑ لیا میں بھاگ کر بچ گیا اور اطلاع کرنے کے لئے آپ کے پاس پہونچ گیا۔ پس اگر آپ کو اپنے راتب کی خیر منظور ہے تو اس

دشمن کو اپنی دارالسلطنت سے نکال دیجئے ورنہ کل سے آپ کا راتب بالکل بند ہے وہ کسی کو آپ تک پہنچنے نہ دے گا۔ شیر کو اپنے رقیب کا حال معلوم کرکے بڑا غصہ آیا اور کہا کہ میرے ساتھ چلو میں ابھی اس کو سزا دیتا ہوں وہ ایسا شیر کونسا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ زبردست ہے چنانچہ خرگوش اس کو ساتھ لیکر کنویں پر پہنچا اور کہا کہ حضور دیکھئے وہ اس کنویں میں رہتا ہے اور دیکھئے اس کے قبضے میں مجھ سے بھی زیادہ موٹا تازہ خرگوش ہے شیر نے جو کنویں میں جھانکا تو اس کو اپنی صورت نظر آئی اور اپنے ساتھ ہی خرگوش کی بھی صورت نظر آئی اور یہ قاعدہ ہے کہ پانی کی تہ میں ہر چیز بڑی نظر آیا کرتی ہے تو خرگوش کی صورت بھی بڑی معلوم ہوئی۔ شیر نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر غصہ میں اس پر حملہ کیا اور دھڑام سے کنویں کے اندر جا پہنچا۔ وہاں پانی کے سوا کیا تھا۔ اب خرگوش اوپر سے کہتا ہے کہ بس یہ تمھارا قید خانہ ہے تم اسی میں ڈوب کر جان دیدو اور میں جاتا ہوں میرا اسلام لو۔ اس کے بعد خرگوش خوش ہوتا ہوا اپنی برادری میں پہنچا انھوں نے کہا کہ کیا تو شیر کے پاس نہیں گیا اس نے جواب دیا کہ تم نے مجھے اس کا شکار بنانا چاہا تھا میں نے اسی کو شکار کر دیا۔ اس پر مولانا فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(حملہ تو خود اپنے اوپر کرتا ہے اے سادہ مرد مثل اس شیر کے جس نے پانی کے اندر اپنی تصویر دیکھ کر اپنا رقیب اس کو سمجھ کر اس پر حملہ کر دیا)

صاحبو! یہی حال معترضین کا ہے کہ جو اعتراض وہ شریعت پر کرتے ہیں حقیقت میں وہ اپنے اوپر اعتراض کر رہے ہیں۔ مگر ان کو خبر نہیں۔ شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو ایک دعوٰے ہوا۔ اس کی دلیل کیا ہے۔ اور شریعت میں تنگی کا ہونا تو ہم کو مشاہدہ سے معلوم ہے کیونکہ خود دیکھ رہے ہیں کہ معاملات وغیرہ میں ہم کو شریعت پر عمل کرتے ہوئے سخت تنگی پیش آتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میں اس کی تردید و تکذیب نہیں کرتا کہ آپ کو معاملات وغیرہ میں تنگی پیش نہیں آتی میں اس کو تسلیم کرتا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تنگی کا سبب شریعت مقدسہ ہے یا آپ کی معیشت اور تمدن کا خراب ہونا یاد رکھو کسی قانون کو تنگ اس وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ سب آدمی اس پر عمل کرنا چاہیں اور پھر بھی اس پر عمل کرنا دشوار ہو۔ اور اگر کسی قانون پر عمل کرنا اس لئے دشوار ہو جاوے کہ ہزار آدمیوں میں سے دس آدمی تو اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام جماعت اس ارادہ کی مخالفت کرتی ہے اس صورت میں قانون کو ہرگز تنگ نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہی کہا جائے گا کہ تمہاری قوم کا تمدن تنگ ہے ان کی معیشت میں تنگی ہے، اس قاعدہ کو سمجھ کر سوچئے کہ آپ کو شریعت پر عمل کرنے میں تنگی کیوں پیش آتی ہے محض اسی وجہ سے تا کہ آپ تنہا اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور باقی تمام تجار اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔ آپ سود کی ڈگری نہیں دینا چاہتے مگر مدعی سود لینا چاہتا ہے۔ اگر آپ ڈگری نہ دیں گے تو وہ اپیل کر کے سود وصول کر لے گا۔ ایک محکمہ میں ہزار آدمی ملازم ہیں ان میں دو چار آدمی نماز کے وقت کام کرنا نہیں چاہتے باقی تمام ملازم نماز کے ضائع کرنے پر راضی ہیں اس لئے ان دو چار آدمیوں کو تنگی پیش آتی ہے اگر سب اس کا ارادہ کر لیں کہ ہم نماز کو کبھی ضائع نہ کریں گے تو حاکم محکمہ ضرور اس کے لئے قانون بنانے پر مجبور ہو گا علیٰ ہذا تمام صورتوں میں غور کر لیجئے کہ شریعت پر عمل میں تنگی محض اسی وجہ سے پیش آئے گی کہ ایک کام کا تعلق پوری جماعت سے ہے جن میں صرف دو چار آدمی شریعت پر عمل کا قصد کرتے ہیں اور زیادہ حصہ عمل کرنا نہیں چاہتا اب آپ ہی بتلایئے کہ یہ تنگی احکام شرعیہ میں ہے یا آپ کے تمدن و معیشت میں۔ صاحبو! اس طرح تو آسان سے آسان کام بھی دشوار ہو جائے گا۔ دیکھئے کھانا کھانا کتنا آسان ہے لیکن اگر آپ کسی ایسے گاؤں میں پہنچ جائیں جہاں نہ آٹا بکتا ہو نہ لکڑی داموں سے ملتی ہو۔ نہ دال اور

اور گھی ملتا ہے تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھانا بہت دشوار چیز ہے ہرگز نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ اس گاؤں کا تمدن تنگ ہے یا آپ کھانا چاہتے ہوں لیکن آپ کے سر پر دس ڈاکو آ کر کھڑے ہو جائیں کہ جب لقمہ اٹھاؤ وہ چھین کر کھا جاتے ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھانا مشکل کام ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ آپ کی معاشرت تنگ ہے ڈاکوؤں کی جگہ سے علیحدہ ہو کر رہو پھر دیکھو کھانا کتنا آسان کام ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ آپ کسی ایسی جگہ جا کر رہیں جہاں عموماً سب لوگوں کو شریعت پر عمل کرنے کا اہتمام ہو پھر بتلایئے کہ شریعت میں کیا تنگی ہے۔ دیکھو اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جائے اور وہ اس کو ایسا نسخہ لکھ کر دے جس کی قیمت دو پیسے ہے سستی دوائیں لکھے اور معمولی دوائیں بتلائے جو عموماً ہر جگہ مل جاتی ہیں۔ لیکن مریض ایسے کوردہ کا رہنے والا ہے جہاں قسمت سے معمولی دوائیں بھی نہیں ملتیں نیز حکیم صاحب نے معمولی پرہیز بتلایا تھا اور دس پندرہ چیزوں کی اجازت دیدی تھی کہ پالک کا ساگ۔ ترئی۔ کدو۔ مونگ کی دال۔ بکری کا گوشت۔ شلجم کی بھجیا وغیرہ کھا سکتے ہو لیکن اس کوردہ میں کوئی چیز بھی مریض کے کھانے کے قابل نہیں ملتی ہاں بیگن۔ کریلے اور مسور کی دال بہت ملتی ہے جس سے طبیب نے پرہیز بتلایا ہے اب یہ مریض اگر یوں کہنے لگے کہ اس طبیب کے مطلب میں بہت تنگی ہے یا یوں کہنے لگے کہ علم طب ہی بہت تنگ ہے جس پر عمل کرنا دشوار ہے تو کیا کوئی عاقل اس کی بات کو تسلیم کر سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ سب یہی کہیں گے کہ ظالم علم طب میں تو بہت وسعت ہے کہ سنگین سے سنگین مرض کا علاج ہزار روپیوں میں بھی ہو سکتا ہے اور چار پیسے کی دوائیں بھی۔ لیکن تیرا گاؤں ہی بہت تنگ ہے جس میں معمولی چیزیں بھی ملنا دشوار ہے۔ صاحبو! بعینہ یہی مثال ان اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات کی ہے کہ وہ اپنے تمدن اور معاشرت کی تنگی کو تو دیکھتے نہیں خواہ مخواہ شریعت پر الزام لگاتے ہیں کہ اس میں تنگی

اور دشواری ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ قانون شریعت سے زیادہ کوئی قانون ہو ہی نہیں سکتا جس میں مصالح دنیا و آخرت کی پوری پوری رعایت کی گئی ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جس جگہ زیادہ حصہ مسلمانوں کا شریعت پر عمل نہ کرنا چاہے بلکہ عمل کرنے والوں کو بھی اس سے روکنا چاہے تو ان ڈاکوؤں کی وجہ سے تنگی پیش آجائے گی ورنہ احکام شرعیہ فی نفسہا بہت سہل ہیں جن پر اگر سب مل کر عمل کرنا چاہیں تو نہایت راحت و اطمینان سے زندگی بسر ہو حق تعالے کا ارشاد ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا پھر یہ کیونکر تسلیم کرلیا جاوے کہ شریعت کے احکام وسعت انسانیہ سے باہر ہیں یا ان میں کچھ بھی دشواری ہے خدا تعالے کا کلام کبھی ٹوٹ نہیں سکتا نہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے اس مضمون کو میں نہایت تفصیل کیساتھ بیان کر سکتا ہوں لیکن میں اس مضمون پر پہلے عرصہ ہوا کہ ایک مفصل تقریر کرچکا ہوں۔ جس کا نام نفی الحرج ہے اور وہ اب قریب الطبع ہے۔ اہل مطبع کہتے تھے کہ ہم اس کو بہت جلد شائع کریں گے۔ اس میں ہر پہلو سے اس دعوے کو خوب اچھی طرح ثابت کردیا گیا کہ دین میں ہرگز تنگی نہیں اور اس وعظ میں نو تعلیم یافتہ طبقہ کے بھی بہت حضرات موجود تھے سب نے اُس کو سُنکر گردنیں جھادیں اور اس کا اقرار کیا کہ واقعی یہ دعویٰ اچھی طرح ثابت ہوگیا اور ہمارا عرصہ کا اشکال رفع ہوا۔ اس وعظ کی ایک کاپی ہر مسلمان کے گھر میں رہنی چاہیئے خصوصاً نو تعلیم یافتہ حضرات تو ایک کاپی ضرور رکھیں کیونکہ اُن کو اس قسم کے اشکالات زیادہ پیش آتے ہیں اور دین میں شک و شبہ کا رہنا بڑا سنگین مرض ہے اس کا علاج بہت اہم ہے۔ ان شاء اللہ اس وعظ سے بہت سے اشکالات رفع ہوجائیں گے۔ حاصل یہ کہ دین مقصودیت میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہے اور اس کا طریق بھی متعین ہے اور طریق میں تنگی بھی نہیں بلکہ سہل اور بہت سہل ہے اور پھر اُس طریق پر مقصود کا ترتب بھی یقینی چنانچہ اوپر بھی مذکور ہوا ہے اور یہاں اس کا راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے دین کے کاموں میں ثمرہ کا وعدہ

فرمایا ہے اور اسباب دنیویہ میں اس کا وعدہ نہیں فرمایا۔ چنانچہ دنیا کے متعلق ارشاد ہے من کان یرید العاجلة عجلنا له فیها ما نشاء لمن نرید یعنی جو کوئی دنیا کا قصد کرے گا ہم اس کو دنیا میں جس قدر ہم چاہیں گے اور جس کے لئے چاہیں گے سردست دیدیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیوی مراد کا حصول مشیت پر موقوف ہے یہ وعدہ نہیں کہ جو تم چاہو وہی مل جائے اور یہ بھی وعدہ نہیں کہ ہر ایک کا مقصود پورا ہو جائے بلکہ بعض کا مقصود حسب مشیت الٰہی حاصل ہو جاتا ہے اور بعض کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوتا اور اعمال آخرت کے متعلق ارشاد ہے ومن اراد الاٰخرة وسعی لها سعیها وهو مؤمن فاولئك کان سعیهم مشکورا ۵ اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرے اور مؤمن بن کر اس کے لئے وہ کوشش کرے جو اس کے مناسب ہے تو ان لوگوں کی کوشش مشکور ہے یعنی حق تعالیٰ اس کی قدر فرمائیں گے اس آیت میں وسعی لها سعیها۔ ارادہ کا بیان ہے یعنی ارادہ سے مراد محض تمنا نہیں کیونکہ خالی تمنا کافی نہیں بلکہ ارادہ سے مراد قصد جازم ہے جس کے لئے سعی لازم ہے آگے اس کی جزا مذکور ہے اولئك کان سعیهم مشکورا کہ ان کی سعی کی قدر کی جائے گی اور ظاہر ہے کہ شاہی محاورہ میں یہ جملہ بہت امید افزا ہے جب کوئی بادشاہ اپنے کسی خادم سے یہ کہدے کہ ہم تمہاری خدمات کے قدردان ہیں تو اس کو انعامات جلیلہ کی پختہ امید ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھ کو میری خدمات سے بدرجہا زائد صلہ ملے گا۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ حاکم کے کلام میں ایسے جملہ سے بہت کچھ امیدیں پختہ ہو جاتی ہیں تو احکم الحاکمین کے کلام میں اس جملہ سے کیا کچھ امیدیں پیدا ہونی چاہئیں اس کا فیصلہ اہل ذوق خود کر سکتے ہیں دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں من کان یرید حرث الاٰخرة نزد له فی حرثه ومن کان یرید حرث الدنیا نؤته منها۔ دنیا کے متعلق نؤته منها فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا قصد کرتا رہے اس کو ہم کچھ دیدیتے ہیں یہ وعدہ نہیں کہ جو وہ چاہے وہی دیدیں اور آیت سابقہ کے قید لمن یشاء یہاں بھی ہے اور آخرت کے

متعلق ترقی کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی اطلاق کے ساتھ ہے جس میں مشیت وغیرہ کی قید مذکور نہیں نہ من تبعیضیہ لایا گیا ہے جس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ارادۂ آخرت کے بعد تو مراد ضرور حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عطا ہوتا ہے سبحان اللہ دنیا کے متعلق تو یہ بھی وعدہ نہیں کہ جو مانگے وہی مل جائے اور یہاں زیادت کا بھی وعدہ ہے اور یہ ترقی محض آخرت ہی میں نہیں بلکہ دین اختیار کرنے والوں کو دنیا میں بھی ان کے اعمال سے زیادہ جزا مل جاتی ہے۔ دینداروں کو دنیا میں بھی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ان کو پہلے سے خبر بھی نہیں تھی آخرت کے متعلق تو مسلمانوں کو اس کا علم عام طور پر ہے سب جانتے ہیں کہ آخرت میں عمل سے زیادہ صلہ ملے گا کیونکہ وہ یہ حدیث سنے ہوئے ہیں اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر کے دل پر ان کا خطرہ گذرا۔ لیکن دنیا میں زیادت اور ترقی کا علم بہت لوگوں کو نہیں ہے اکثر مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ دین کا ثمرہ عمل سے زیادہ آخرت ہی میں ملیگا۔ اور دنیا میں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ نہیں ملتا یا کم ملتا ہے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے حق تعالیٰ اعمال دینیہ کا ثمرہ دنیا میں بھی امید اور خیال سے زیادہ عطا فرماتے ہیں اور اس ثمرہ کی بھی وہی شان ہوتی ہے ولا خطر علی قلب بشر کہ انسان کے دل میں پہلے سے اس کا خطرہ بھی نہیں گذرتا شاید آپ یہ سوال کریں کہ وہ ثمرات کیا ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ دین کو اختیار کر کے خود ہی تم کو وہ ثمرات حاصل ہو جائیں گے میں ان کو بیان نہیں کر سکتا اور وہ بیان میں آ بھی نہیں سکتے کیونکہ ان کی تو شان یہ ہے ولا خطر علی قلب بشر اور بیان کرنے سے قابل خطور ہونا لازم آجائیگا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں بھی اہل دین کو وہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں جن کے بیان کیلئے الفاظ بھی نہیں ملتے ہاں کچھ کچھ پتہ ان بزرگوں کے کلام سے معلوم ہوتا ہے جن کا صادق ہونا امارات یقینیہ سے معلوم ہے ایک کتاب میں ایک بزرگ کا قول ہے۔ لکھا ہے لو علمت الملوک بما عندنا من النعمہ لجادلونا بالسیوف کہ اگر سلاطین کو ان نعمتوں کا علم ہو جائے جو ہمارے پاس میں

تو وہ تلواریں لے کر ہم پر چڑھائی کر دیں اور ان کو چھیننا چاہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے پاس وہ نعمتیں ہیں جن کی لذت کے سامنے سلطنت ہفت اقلیم کی بھی کچھ حقیقت نہیں کیونکہ سلاطین تو اسی چیز کے طالب ہو سکتے ہیں جو ان کی دولت موجودہ سے بڑھ کر ہو اگر وہ نعمت سلطنت سے کم ہوئی تو بادشاہوں کو ادھر توجہ کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے جبکہ وہ اس سے زیادہ نعمت لئے بیٹھے ہیں۔ پس یقیناً وہ نعمت ایسی ہے جس کی سلاطین کو ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر یہی نہیں کہ بزرگوں کی یہ باتیں ہی باتیں ہیں بلکہ جس کو وہ نعمت حاصل ہوئی ہے اس نے سلطنت پر لات مار کر بھی دکھلا دیا ہے۔ ابراہیم ادہمؒ کا قصہ مشہور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے ان کو اپنی خاص نعمت سے نوازا ہے تو تخت سلطنت چھوڑ کر فقر و فاقہ کو اختیار کر لیا۔ پس وہ ایسی نعمت ہے کہ جس کے سامنے وہ سلطنت کو بالکل ہیچ سمجھتے ہیں مگر ظاہر میں یہ حالت ہے کہ نہ کپڑے درست ہیں نہ صورت ٹھیک ہے اور باطن میں بھی وہ ایسے غنی ہیں کہ سلاطین کو بھی منہ نہیں لگاتے بلکہ خود سلاطین ان کی غلامی کو اپنے لئے فخر سمجھتے ہیں اس نعمت کو عارف شیرازی اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کین قوم
شہاں بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

(حق تعالیٰ کے عاشقوں کو حقیر مت سمجھو کہ یہ بے تخت و تاج ہی باطنی سلطنت کے بادشاہ ہیں)

نیز عارف شیرازی اس نعمت کا کسی قدر پتہ بھی بتلاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہروے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاے و ہوے

(فراغ دل سے ایک لمحہ کو بھی اس محبوب کی یاد میں لگنا اس سے بہتر ہے کہ شاہی چھتری سر پر ہو اور سلطنت کا شور و غل ہو۔)

معلوم ہوا کہ وہ نعمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف کامل توجہ اور اس سے کامل معلق ہو جاوے۔ اس نعمت کی یہ خاصیت ہے کہ پھر یہ شخص دنیا سے مستغنی ہو جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جس دل میں خدا ہو گا اس میں کوئی دوسری چیز کب رہ سکتی ہے

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق وہ آگ ہے جب دل میں روشن ہوتی ہے معشوق کے علاوہ سب غیر کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔)

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت
مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(صرف حق تعالیٰ ہی کی ذات دل میں باقی رہتی ہے مبارک ہو اے عشق تجھ کو کہ تو نے غیر اللہ کو جلا کر دل کو غیر حق کی شرکت سے پاک کر دیا)

لیکن یہ بھی اس نعمت کا اجمالی ہی پتہ ہے کیونکہ اس سے بھی یہ نہ معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ سے کامل تعلق کیونکر ہوا کرتا ہے اسی لئے اس میں غلطی بھی ہوتی ہے چنانچہ بعض لوگ محض ملکۂ یادداشت کو کامل تعلق کا مصداق سمجھتے ہیں اور نسبت کی حقیقت اسی کو سمجھتے ہیں۔ اور ایک زمانہ تک میں بھی یہی سمجھتا رہا مگر الحمد للہ کہ اب حق تعالیٰ نے حقیقت منکشف فرمادی حق تعالیٰ سے تعلق و نسبت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں طرف سے تعلق ہو بندہ کو خدا سے تعلق ہو اور حق تعالیٰ کو بندہ سے تعلق ہو اگر صرف بندہ کو تعلق ہوا اور ادھر سے تعلق نہ ہوا بلکہ حجاب رہا تو یہ نسبت مطلوبہ نہیں بعض لوگ محض یادداشت کو نسبت مطلوبہ سمجھتے ہیں حالانکہ یادداشت تو مشق سے حاصل ہو سکتی ہے نسبت مقصودہ یہ ہے کہ تم خدا سے راضی رہو وہ تم سے راضی رہیں اور یہ بات محض مشق ذکر سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے کثرت ذکر کے ساتھ اجتناب معاصی و ادائے طاعات بھی شرط ہے اگر ذکر کے ساتھ معاصی سے اجتناب کا اہتمام نہیں اور طاعات کے بجا لانے کی فکر نہیں تو نسبت مطلو

حاصل نہیں ۔ بہت لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ جہاں ان کو ذکر کی مشق ہوگئی اور ہر وقت خدا کا دھیان رہنے لگا بس وہ اپنے کو صاحب نسبت سمجھنے لگے ۔ پھر چونکہ معصیت سے اس مشق میں فتور نہیں آتا اس لئے یہ شخص یوں سمجھنے لگتا ہے کہ مجھ کو معاصی مضر نہیں حالانکہ صوفیہ کا قول ہے کہ معصیت سے نسبت باطنیہ کمزور ہو جاتی ہے اور معاصی پر اصرار کرنے سے وہ رفتہ رفتہ زائل ہو جاتی ہے بلکہ بعض لوگ یہاں تک دھوکہ میں پڑ گئے کہ بعد حصول نسبت کے ایک مقام ایسا آتا ہے جس میں اس شخص سے تکالیف شرعیہ ساقط ہو جاتی ہیں اور کوئی حرام اس کے لئے حرام نہیں رہتا ۔ یاد رکھو یہ صریح زندقہ ہے "تکالیف شرعیہ جبتک ہوش و حواس درست رہیں کسی سے بھی کسی وقت ساقط نہیں ہوتیں ۔ پس نسبت ایک ایسا تعلق ہے جو طرفین سے ہوتا ہے اگر صرف ایک طرف سے ہوا ور دوسری طرف سے نہ ہو تو وہ نسبت ایسی ہے جیسے ایک طالب علم سے کسی نے پوچھا تھا کہ آج کل کس فکر میں ہو کہنے لگا کہ شاہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہوں اُس نے پوچھا کہ پھر اس کے لئے کیا سامان کیا کہنے لگا کہ آدھا سامان تو ہو گیا آدھا باقی ہے اس نے پوچھا کیونکر کہنے لگا میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں ہے تو جیسا کہ یہ شخص اپنی رضامندی سے آدھا سامان مکمل کئے ہوئے تھا اسی طرح ان لوگوں کی نسبت ہے اور ظاہر ہے کہ نکاح میں ایک طرف کی رضا بدون رضا دوسرے کی کچھ بھی وقعت نہیں رکھتی ۔ اسی طرح ان لوگوں کی نسبت جو کہ محض ایک طرف سے ہے محض بالکل کالعدم ہے اس صحیح نسبت ہی میں وہ لذت حاصل ہوتی ہے جس کے سامنے سلطنت کی کچھ حقیقت نہیں ۔

حضرت غوث اعظمؒ کی خدمت میں ایک مرتبہ ملک سنجر نے یہ لکھا کہ میں حضرت کی خانقاہ کے مصارف کے لئے ملک نیمروز کے ایک حصہ کو نامزد کرنا چاہتا ہوں حضرت اس کو قبول فرمائیں تو آپ نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی سہ

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوسِ ملک سنجرم

(مثل شاہ سنجر کے اس سیاہ چھتری کے جو اس کے سر پر لگائی جاتی تھی ہمارا نصیبہ سیاہ ہو جاوے اگر ہمارے دل میں ملک سنجر کی ہوس ذرا بھی ہو)

اس زمانہ میں ان سلاطین کا پرچم سیاہ رنگ کا ہوا کرتا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو ملک سنجر کی ہوس ہو تو چتر سنجری کی طرح میرا بخت سیاہ ہو جائے ؎

زانکہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

(جس وقت سے ہم کو آدھی رات (نماز تہجد) کی دولت کی خبر لگ گئی ہے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوں)

ملک نیم شب اور نیمروز میں صنعت تقابل کس قدر عجیب ہے۔ ان حضرات کے کلام میں علاوہ باطنی صولت و شوکت کے ظاہری خوبیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ان حضرات کے دل کو سلطنت سے اس درجہ بے نیاز کر دیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو دنیا میں بھی وہ نعمتیں ملتی ہیں جن کا اہل دنیا کو خطرہ بھی نہیں گذرا اسی طرح ایک اور بزرگ کا قصہ ہے۔ جو اہل دلال میں سے تھے مگر اہل ضلال میں سے نہ تھے یہ ایک حال ہوتا ہے۔ جو متوسطانِ سلوک پر وارد ہوتا ہے کاملین اہل دلال نہیں ہوتے ان میں عجز و نیاز غالب ہوتا ہے ہاں وسط سلوک میں بعض لوگوں پر غلبۂ بسط سے دلال کا حال وارد ہو جاتا ہے وہ اس وقت ناز میں آکر بعضی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو دوسرا اگر کہے تو مردود ہو جاوے۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

۱؎ ناز را روے بباید ہمچو ورد … چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
۲؎ زشت باشد روئے نازیبا و ناز … عیب باشد چشم نابینا و باز
۳؎ پیش یوسف نازش و خوبی مکن … جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(ترجمہ) ۱۔ ناز کے لئے چہرہ مثل گلاب کے پھول کے چاہیئے جب تو ایسا چہرہ نہیں رکھتا ہے تو بدخوئی کے قریب بھی نہ جائیو۔

۲۔ بری صورت کے لئے ناز کرنا برا معلوم ہوتا ہے جس طرح کہ نابینا کا اپنی آنکھوں کا کھلا رکھنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ یوسف کے سامنے ناز اور خوبی مت دکھا سوائے نیازمندی اور آہ یعقوبی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

یعنی ناز کے لئے بھی منہ چاہیئے۔ ہر ایک کا منہ ناز کے قابل نہیں ہوتا اگر کسی کو یہ حال حاصل ہو اس کے لئے ناز بجا ہے اور اگر حال نہ ہو تو بجز آہ و نیاز کے کچھ مناسب نہیں اور کبھی تو اہلِ دلال کی بات سُن لی جاتی ہے اور گاہے اُن کی گوش مالی بھی کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ بزرگ اہل دلال میں سے تھے۔ ایک مرتبہ دن میں وہ کسی شہر پر گذرے دیکھا تو شہر پناہ کا دروازہ بند تھا دربانوں سے پوچھا کہ بھائی یہ دن میں دروازہ کس لئے بند کیا گیا۔ ہے انھوں نے کہا کہ بادشاہ کا باز اڑ گیا ہے اس لئے اس نے حکم دیا ہے کہ شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے جائیں کہیں دروازوں سے نکل کر نہ بھاگ جاوے۔ یہ قصہ سن کر وہ بزرگ بہت ہنسے کہ معلوم ہوتا ہے بادشاہ عقل سے بالکل ہی کورا ہے بھلا باز کو دروازے سے کیا نسبت وہ اگر بھاگنا چاہے گا تو اوپر سے اڑ جائے گا دروازے بند کرنے سے اس کی کیا روک ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ہنس کر آسمان کی طرف مُنھ کیا اور حق تعالےٰ سے عرض کی کہ اچھے احمق کو آپ نے بادشاہت دی ہے۔ جس کو اتنی بھی عقل نہیں کہ باز دروازے سے جایا کرتا ہے یا اوپر سے اور ہم تو اتنے عاقل ہیں مگر ہماری یہ حالت ہے کہ نہ پیر میں جوتہ درست۔ ہے نہ لباس اچھا ہے فوراً ادھر سے عتاب ہوا کہ بہت اچھا ہم آپ کو بھی سلطنت دیئے دیتے ہیں لیکن کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمھاری معرفت اور ولایت اور تمام کمالات مع تمہارے فقر و فاقہ کے اس بادشاہ دیدیئے جائیں اور اس کی سلطنت وغیرہ مع اس کی

حماقت کے اس کو دیدی جائے۔ بس یہ عتاب سن کر ان بزرگ کا رنگ زرد ہوگیا اور جلال خداوندی سے ڈر گئے فوراً سجدہ میں گر پڑے اور عرض کرنے لگے کہ میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہوں پھر ایسی گستاخی نہ ہوگی میں اپنی نعمتوں کو ہزار سلطنتوں کے بدلے میں بھی دینا گوارا نہیں کرسکتا۔ خوب کہا ہے ؎

رضینا قسمة الجبار فینا لنا علم و للجہال مال
فان المال یفنی عن قریب و ان العلم باق لایزال

ہم خدا کی اس تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمارے لئے علم و معرفت ہو اور جاہلوں کے پاس مال و دولت ہے کیونکہ مال و دولت تو عنقریب فنا ہو جائے گا اور علم و معرفت کیلئے فنا نہیں ہے۔ اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ دنیا میں نہیں ملتا وہ اس حکایت میں غور کریں کہ ان بزرگ نے فقر و فاقہ کو کیوں گوارا کیا اور ملنے والی سلطنت پر کیوں لات ماردی آخر وہ کوئی تو نعمت تھی جس کے سلب ہو جانے کا نام سن کر وہ لرز گئے۔ کانپ اٹھے اور سلطنت کے بدلے میں بھی اس کو دینا گوارا نہ کیا۔

صاحبو! خدا کی قسم جن لوگوں کو اس دولت کی خبر ہوگئی ہے ان کی مستی کی کچھ حد نہیں وہ سلطنت وغیرہ کو مچھر کے پر کی برابر بھی نہیں سمجھتے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ دین کے کاموں کا ثمرہ آخرت میں تو ملتا ہی ہے اس کو تو سب تسلیم کرتے ہیں دنیا میں بھی اعمال سے زیادہ ملتا ہے اور ایسی ایسی نعمتیں ان پر فائز ہوتی ہیں جن کے سامنے اہل دنیا کی نعمتیں کچھ بھی نہیں۔ پس دین کا مقصود ہونا بھی معلوم ہے اس کا طریق بھی معلوم ہے اور وہ طریق آسان بھی بہت ہے اور طریق پر مقصود کا ترتب بھی یقینی ہے اور دنیا و آخرت میں امید سے بھی زیادہ ثمرہ اس پر مرتب ہوتا ہے اور چوتھی بات یہ ہے کہ اس کے ثمرات دائم بھی ہیں اور دنیا کے ثمرات فانی ہیں مگر باوجود اس کے حیرت در حیرت ہے کہ لوگ

اس کے لئے سعی نہیں کرتے اور اس کے لئے اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔ جو لوگ کچھ سعی کرتے بھی ہیں وہ محض تمنا کا درجہ رکھتے ہیں اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔ حالانکہ دنیوی امور میں محض تمنا بلا اسباب کو سب لوگ حماقت اور پاگل پن سمجھتے ہیں مگر نہ معلوم دین کے معاملہ ہی میں کیوں سب کی عقلیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ پس اسکو سعی سمجھ لیا ہے کہ تھوڑی دیر بزرگوں کے پاس بیٹھ کر رو لئے یا وعظ میں آنسو بہالئے سو یاد رکھو محض رونے سے کچھ نہیں ہوتا کام کو اُس کے طریقہ سے کرنا چاہیئے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بتمنا گریستن

(اے عرفی اگر صرف رونے سے وصال اور قرب مل جاتا تو سو برس تک ہم رونے کی تمنّا کرتے)

ان لوگوں کی اس تمنّا کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی صاحب بزرگوں سے جا کر یہ کہیں کہ حضور دعا کیجئے ہمارے لڑکا ہو جاوے مگر یہ حضرت نکاح کرتے نہیں تو اب بتلایئے ان کے لڑکا کہاں سے ہو۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ حضور دعا کر دیجئے ہم بھی دین میں کامل ہو جاویں مگر جو اس کا طریقہ ہے اس کو اختیار نہیں کرتے تو یہ لغو حرکت ہے یا نہیں۔ یاد رکھو ہر کام طریقہ ہی سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں واْتوا البیوت من ابوابہا گو شانِ نزول اس کا خاص ہے مگر اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے اس لئے یہ حکم عام ہے۔ پس دین ایک گھر ہے اور اس کا دروازہ وہ طرق ہیں جو شریعت نے بتلائے ہیں اس دروازہ سے داخل ہو گے جبھی دین کامل ہو سکتا ہے۔ مولانا اس مضمون کو نظم میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

اطلبوا الارزاق من اسبابہا
وادخلوا الابیات من ابوابہا

(رزق کو حاصل کرو اس کے اسباب سے اور گھروں میں داخل ہو اس کے دروازوں سے)

اطلبوا الارزاق کو پہلے بیان فرمایا جس میں نظیر کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح تم رزق کے واسطے اسباب کو اختیار کرتے ہو اسی طرح دین کے لئے بھی اس کے طریقے اختیار کرو۔ آپ دین کے کام کرنا شروع کریں۔ ان شاء اللہ دروازہ خود بخود کھل جائیگا اور پھر آپ کو دین کے ثمرات بھی حاصل ہوجائیں گے جن میں ایک ثمرہ یہ ہے کہ آپ کو خدا تعالےٰ سے تعلق ہو جائے گا زندگی پر لطف ہوجاوے گی باقی وہ دولت باطنیہ جو اہل اللہ کو حاصل ہے اس کی کیفیت میں آپ کو بتلا نہیں سکتا کیونکہ وہ ذوقی چیز ہے جس کو اہل ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دین کے کاموں میں لگئے۔ ان شاء اللہ آپ کو بھی وہ ذوق ہوجائے گا اور اس سے پہلے کتنا ہی سمجھایا جائے آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اہل اللہ کو کیا دولت عطا ہوتی ہے نامرد کو عورت کی لذت کا کبھی ادراک نہیں ہوسکتا گو اس کے سامنے کتنی ہی وضاحت کردی جائے۔ ہاں جب خدا کرے گا اس کو اس مرض سے شفا ہو جائے گی۔ اس وقت وہ خود بخود اس لذت کو سمجھ جائے گا۔ پھر کسی کے بتلانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ پس خدا کے لئے آپ اس بے حسی کا علاج کیجئے۔ کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا نہ ہو مگر علاج شرط ہے اور طریقہ پر عمل کرنا ایک فرق دنیا اور دین میں اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ دنیوی مقاصد کے حصول کا وعدہ بدون سعی کے بھی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ ہر جاندار کی روزی خدا تعالےٰ کے ذمہ ہے جو بدون سعی کے بھی اس کو مل سکتی ہے مگر اس پر بھی لوگ دنیوی مقاصد میں سعی کو ضروری سمجھتے ہیں اور آخرت کے ثمرات کا وعدہ تو بدون سعی کے ہے ہی نہیں چنانچہ صاف ارشاد ہے من عمل صالحا فلنفسه ومن اساء فعلیها یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا۔ جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ پھر تعجب ہے کہ لوگ دین میں سعی کو کس لئے ضروری نہیں سمجھتے جبکہ بدون سعی کے اس کے حصول کا وعدہ نہیں اہل اللہ نے اس فرق پر نظر کرکے دنیوی مقاصد کے لئے سعی کو ترک کردیا ہے

وہ کہتے ہیں کہ روزی کا ذمہ تو حق تعالیٰ نے لے لیا ہے اس کے لئے سعی کی کیا ضرورت ہے اور دین کے کاموں کو ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے ہم کو اس کیلئے سعی کرنا چاہیئے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انھوں نے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی نماز کا سلام پھیر کر امام صاحب نے ان بزرگ سے ملاقات کی اور یہ سوال کیا کہ آپ کھاتے پیتے کہاں سے ہیں کیونکہ آپ کوئی کام کسب وغیرہ کا نہیں کرتے۔ بزرگ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہریئے میں آپ کے سوال کا جواب ابھی دیتا ہوں یہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی سلام پھیر کر فرمایا کہ اب پوچھئے آپ کیا پوچھتے ہیں امام نے کہا اب تو مجھے ایک سوال اور پیدا ہوگیا وہ یہ کہ آپ نے یہ نماز دوبارہ کیسی پڑھی ہے آپ تو ابھی نماز سے فارغ ہو چکے تھے فرمایا کہ میں نے اُس نماز کا اعادہ کیا ہے کیونکہ مجھے آپ کے سوال سے یہ شبہ ہوگیا تھا کہ شاید آپ کو خدا تعالےٰ کے اس ارشاد پر یقین نہیں وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا تو مجھے آپ کے ایمان ہی میں شک ہوگیا (یہ غلبہ ہے حال کا) اس لئے میں نے جلدی سے اپنی نماز کا اعادہ کیا کہ مبادا کہیں موت نہ آجائے اور یہ نماز میرے ذمہ ہی رہے اس کے بعد فرمایا کہ بندۂ خدا کیا روزی کا ملنا کمانے ہی پر موقوف ہے حالانکہ خدا تعالےٰ نے فرما دیا ہے کہ روزی میرے ذمہ ہے پھر تمھارے قلب میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا کیا تم کو خدا کے اس ارشاد پر اعتماد نہیں وہ امام بہت شرمندہ ہوئے۔

ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے کہ دنیا خدا کا ایک گھر ہے اور ہم یہاں مہمان ہیں اور حدیث میں وارد ہے الضیافۃ ثلاثۃ ایام کہ مہمانی تین دن تک کرنی چاہیئے جب ہم دنیا میں آئے تو تین دن تک تو ہم خدا تعالےٰ کے مہمان ہیں اور خدا تعالےٰ کے یہاں ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ تو ہم کو تین ہزار سال

کے لئے تو بالکل بے فکری ہے اگر اس سے زیادہ عمر ہوئی تو پھر کچھ انتظام سوچ لیا جائے گا۔ ظاہر میں یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر اس سے اہل اللہ کے مذاق کا پتہ چلتا ہے کہ دنیوی کاموں میں وہ سعی اور اہتمام کو ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ روزی کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود لے لیا ہے لیکن اعمال آخرت کا انھوں نے ذمہ نہیں لیا۔ اگر تم آخرت کے لئے ارادہ وسعی نہ کرو جب بھی وہ تم کو جنت دیدیں گے یا کہ از خود تم سے جنت کے کام لے لیں گے بلکہ اگر اس کے متعلق تو یہ ارشاد ہے مَنْ عمل صالحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ اور ارشاد ہے۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ۔ اور رزق کے بارے میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وارد ہے ومن کان له رزق فی رأس جبل او حضیض یأت به الله گر نستانی بستم میرسد۔ پھر حیرت ہے کہ اتنے فرقوں کے ہوتے ہوئے ہم کو اعمال آخرت کی فکر نہیں اور دنیا کی فکر ہے حالانکہ ان فروق کے ہوتے ہوئے دنیا کسی درجہ میں بھی توجہ کے قابل نہیں اور ان کا مقتضا تو یہ تھا کہ دنیا کے لئے سعی اور عمل کو ناجائز ہی کر دیا جاتا مگر خدا تعالیٰ کی شفقت و رحمت ہے کہ انھوں نے ہمارے ضعف پر نظر فرما کر دنیا کے لئے بھی اسباب اختیار کرنے کی اجازت دیدی ہے اور صرف اجازت بھی نہیں بلکہ بعض مواقع میں دنیا کے لئے سعی کو فرض کر دیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے طلب الحلال فریضة من بعد فو الفریضة کہ حلال روزی کا طلب کرنا بھی فریضۂ شرعی کے بعد ایک فرض ہے بلکہ حکماء امت تو یہاں تک ان اسباب کی رعایت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حرام ملازمت میں بھی گرفتار ہو اور فراست سے ان کو اُس کا ضعیف الہمّت ہونا معلوم ہو تو اس کو فوراً حرام ملازمت چھوڑنے کا امر نہیں فرماتے بلکہ یہ فرما دیتے ہیں کہ پہلے کوئی حلال ملازمت تلاش کر لو اس کے بعد اس کو چھوڑنا اور جبتک حلال ملازمت نہ ملے اسی میں گرفتار رہو اپنے کو گنہگار سمجھتے رہو اور خدا تعالےٰ سے استغفار کرتے رہو کیونکہ بعض لوگ تنگی معاش سے گھبرا کر عیسائی یا آریہ، قادیانی ہوگئے ہیں

اہلِ باطل اپنے گروہ میں بلانے کے لئے لوگوں کو طرح طرح کی طمع دلاتے ہیں جن کے سامنے فقر و فاقہ کے ساتھ اپنے دین پر جما رہنا ہمت والوں کا کام ہے بعض لوگ تنگی معاش سے پریشان ہو کر پیری مریدی کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں اور مخلوق کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ؏ او خویشتن گم ست کرا رہبری کند۔ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے جو پیر بنے پھرتے ہیں کہ اپنے گھر پر آکر وہ نماز بھی نہیں پڑھتے اور باہر جا کر مقدس بن جاتے ہیں۔ اور ایک واقعہ تو ایسا سنگین سننے میں آیا جس کی نظیر نہیں سنی گئی۔

میرے ایک دوست مولوی بیان کرتے تھے کہ ہندوستان سے ایک جاہل شخص ضلع بردوان میں جا کر پیری مریدی کرتا تھا۔ یہ شخص ضلع الہ آباد کا رہنے والا تھا اور تکیہ دار فقیر تھا۔ بردوان کے ایک رئیس اس کے پھندے میں پھنس گئے ان رئیسوں کو اکثر دنیا کی ہی عقل ہوتی ہے، دین کی عقل نہیں ہوتی اس لئے جاہل درویشوں اور طریق کے ڈاکوؤں کے ہاتھ میں اکثر رؤسا اور مالدار لوگ ہی پھنستے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس درویش کی طرف زیادہ رجوع اہلِ دنیا کا ہو وہ درویش نہیں بلکہ دنیا دار ہے کیونکہ قاعدہ ہے الجنس یمیل الی الجنس۔ اگر اس میں دین کمال ہوتا تو دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ رجوع کرتے۔ چنانچہ حدیث ہرقل میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ ہرقل نے ابو سفیان سے دریافت کیا کہ نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع زیادہ تر کون لوگ کرتے ہیں اغنیاء یا ضعفاء، تو انھوں نے جواب دیا کہ زیادہ تر ضعفاء اتباع کرتے ہیں تو ہرقل نے اس پر کہا ہم اتباع الرسل کہ رسولوں کا اتباع کرنے والے ضعفاء ہی ہوتے ہیں (چونکہ حضرات صحابہؓ نے ہرقل کے اس قول پر انکار نہیں کیا بلکہ سکوت فرمایا اس لئے تقریر صحابہؓ کی وجہ سے یہ قول حجت ہو گیا ۱۲ جامع) الحمدللہ کہ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں زیادہ تر غرباء و طلباء ہی کی جماعت ہے رؤساء و امراء کم ہیں (اور جو رؤساء ہیں بھی وہ عقلاء اور دیندار ہیں بد دین اور کم عقل نہیں ہیں۔ دینداری کی وجہ سے وہ نعم الامیر علی باب الفقیر کے مصداق ہیں ۱۲ جامع)

غرض ایک بار وہ بنگالی رئیس کسی کام سے ہندوستان آئے الہ آباد پہونچکر ان کو اپنے مرشد سے ملنے کا اشتیاق ہوا اس کے گاؤں میں پہونچکر کوئی چودہری چارپائی بچھائے بیٹھے تھے ان سے بڑی تعظیم کے ساتھ اس کا نام لیکر دریافت کیا کہ وہ کہاں رہتے ہیں انھوں نے کہا کہ وہ تو تکیہ دار فقیر ہے آپ اس کے ہاتھ میں کہاں پھنس گئے وہ بنگالی صاحب بولے کہ آپ جو چاہیں کہیں میرے تو وہ مالک اور مرشد ہیں وہ سمجھ گئے کہ بیچارہ عقل سے کورا ہے انھوں نے اپنے کسی نوکر سے کہا کہ فلانے تکیہ دار کو پکڑ لا۔ بنگالی رئیس نے کہا کہ حضور کے ساتھ ایسی گستاخی مجھ کو زیبا نہیں میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا آپ صرف اتنا کام کر دیجئے کہ راستہ بتلانے کے لئے خادم کو میرے ساتھ کر دیجئے انھوں نے خادم کو ساتھ کر دیا وہ ایک تکیہ میں رہتا تھا وہاں پہنچے اور بڑی تعظیم سے سلام و کلام کیا اس کی حالت یہ تھی کہ تکیہ میں اس کے پاس چند بدمعاش رہتے تھے اور ہر وقت بھنگ وغیرہ پیتا رہتا تھا۔ ان رئیس صاحب کا اعتقاد اس حالت کے مشاہدہ سے بھی نہ گیا۔ یہ پیری ایسا پیشہ ہے کہ اگر ایک دفعہ کسی کے تقدس کا اعتقاد ہو جاوے تو پھر بیوی تمیزہ کے وضو کی طرح وہ تقدس کبھی ٹوٹنا ہی نہیں۔ تمیزہ ایک فاحشہ تھی جو نماز بھی نہ پڑھتی تھی۔ ایک بزرگ نے اس کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا دیا نماز کی ترکیب بتلا دی جب سال بھر گذر گیا تو وہ بزرگ پھر آئے اور بی تمیزہ سے پوچھا کہ نماز بھی پڑھتی ہو کہا حضور روزانہ پڑھتی ہوں پوچھا وضو بھی کیا کرتی ہو کہنے لگی کہ حضور نے تو وضو کرا دیا تھا اسی وضو سے ابتک نماز پڑھتی رہی ہوں تو جس طرح بی تمیزہ کا وضو نہ پیشاب پاخانہ سے ٹوٹتا تھا نہ زنا اور کاری سے وضو کیا لوہا لاٹ تھا) اسیطرح آجکل کی پیری جب چل جاتی ہے تو نہ وہ شرابخوری ایسے ٹوٹتی ہے نہ زناکاری سے نہ صوم و صلوٰۃ کے چھوڑنے سے نہ ڈاڑھی منڈانے سے نہ ننگا پھرنے سے بلکہ اگر کوئی لنگوٹ بھی اتار پھینکدے تو اس کے اور زیادہ معتقد ہوتے ہیں۔ اگر پیر صاحب خاموش رہیں تو چپ شاہ بلکہ فنافی اللہ ہیں۔ اگر اینڈی بینڈی باتیں ہانکنے لگیں تو رموز ہیں گو وہ کفریات ہی کیوں نہ ہوں اور

کوئی ٹھیک بات کہدی تو عارف اور محقق ہیں اور منشا، اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات جم رہی ہے کہ شریعت اور ہے طریقت اور ہے اس لئے اگر کوئی شخص ظاہر میں شریعت کے بالکل خلاف ہو اس سے بھی ان کا اعتقاد زائل نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ بھی طریقت کا کوئی رمز ہوگا۔ استغفر اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ غرض اس فقیر نے چند روز تک ان رئیس صاحب کی دعوت کی آرام سے اپنے پاس رکھا۔ دو چار دن رہ کر رئیس نے واپسی کی اجازت چاہی فقیر نے اجازت دی اور کہا میں اسٹیشن تک آپ کو خود پہنچا دوں گا چنانچہ وہ اور اس کے بھائی اسٹیشن تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہوئے اور اس کو ایسے راستے سے لے چلے جہاں آدمی بہت کم چلتے تھے جب چلتے چلتے دیر ہوگئی تو رئیس کو خطرہ ہوا اس نے کہا کہ حضور یہ تو وہ راستہ نہیں جس سے میں آیا تھا کہنے لگا کہ میں آپ کو قریب کے راستہ سے باہر باہر لے چلتا ہوں۔ یہ غریب خاموش ہوگیا یہاں تک کہ ایک ایسے بن میں اس کو جا پہنچایا جہاں نہ آدمی کا پتہ نہ جانور کا اگر آدمی گلے پھاڑ پھاڑ کر بھی چلا دے تو بھی کوئی مدد کو نہ آسکے وہاں پہونچکر فقیر نے کہا جو کچھ ساتھ لے رہے ہو رکھدو اس بے چارہ نے جو کچھ ساتھ تھا رکھدیا کہا کپڑے بھی اتارو اس نے کپڑے بھی اتار دیئے۔ اس کے بعد اس نے رئیس کے قتل کا ارادہ کیا اس نے بہت کچھ ہاتھ پیر جوڑے اور خوشامدیں کیں کہ آپ مجھے قتل نہ کریں میں اس سے دو چند اور چند روپیہ گھر جا کر بھیجدوں گا، کہنے لگا کہ اب تمہارا زندہ چھوڑنا مصلحت نہیں تم ہمارا راز کھولدوگے۔ اس نے بہت قسمیں کھائیں کہ میں کسی سے یہ معاملہ ظاہر نہ کروں گا مگر اس سنگدل نے ایک نہ سنی اور اس غریب کا کام تمام کردیا اور نعش کو ایک کنوئیں میں پھینکدیا کتنے دنوں کے بعد اتفاقاً ایک چرواہا اس کنوئیں پر آیا تو اس کو کنوئیں میں سے بدبو آئی اس نے جھانک کر دیکھا تو ایک نعش تیرتی ہوئی نظر آئی اس نے فوراً پولیس کو اطلاع دی پولیس نے نعش کو نکالا تو اس کا پہچاننے والا وہاں کوئی نہ تھا مگر اس کی جیب میں سے کچھ کاغذات نکلے جن میں

بردوان کا پتہ لکھا ہوا تھا بس اب کیا تھا پولیس کو پتہ چلانے کے واسطے اتنا کافی تھا سراغ لگاتے لگاتے سب واقعہ منکشف ہوگیا پولیس نے اس فقیر کو پکڑا اور اس سے اظہار لیا آخر اس نے اقرار کیا کہ میں نے اس کو قتل کیا ہے چنانچہ اس کو پھانسی دیگئی سو دیکھئے تنگیٔ معاش سے پریشان ہوکر انسان کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کرلیتا ہے۔ بعض لوگ تنگیٔ معاش سے پریشان ہوکر دوسری طرح حقوق العباد کو ضائع کرتے ہیں کسی سے قرض لے لیا اور مار لیا۔ کسی کی امانت لیکر انکار کردیا۔ کسی کی کوئی چیز مانگ لی اور اس کو رہن رکھدیا اور بہت سے کرتب لوگ کرنے لگتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ حقوق العباد کے تلف کرنے کا ضرر متعدی ہے جو ضرر لازم سے اشد ہے اگر یہ شخص کسی حرام ملازمت میں مبتلا رہا بشرطیکہ اس ملازمت کا فرض منصبی کسی کا اضرار نہ ہو تو اپنا ہی نقصان کرے گا مخلوق کو تو پریشان نہ کرے گا لیکن اگر اس نے بدون حلال روزی تلاش کئے حرام ملازمت کو بھی چھوڑ دیا تو پھر دوسروں کو نقصان پہونچائے گا اس لئے حکمائے امت ان اسباب معیشت کی اتنی رعایت کرتے ہیں کہ حرام سبب کو بھی حکمت سے چھوڑ ولتے ہیں تو حلال سبب کو تو وہ کیوں چھڑانے لگے بعض کم فہم لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ حرام ملازمت کی اجازت دے دی حالانکہ وہ حرام ملازمت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ وہ اس کے ایمان کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت تو گناہ ہی میں مبتلا ہے پھر کہیں ایمان سے بھی نہ ہاتھ دھولے نیز اس وقت تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے اس کو چھوڑ کر کہیں مخلوق کو نہ پریشان میں ڈالدے اور قاعدہ فقہیہ ہے کہ مفسدہ یسیرہ کو مفسدہ عظیمہ سے بچنے کے لئے گوارا کیا جاتا ہے لیکن اس قاعدہ سے کام لینے کا ہر ایک کو حق نہیں۔ اس کا موقع و محل محقق ہی سمجھ سکتا ہے خوب یاد رکھو۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسباب دنیا اسباب دین کے مقابلہ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کے لئے سعی کی جائے نہ کہ ایسی سعی کریں کہ آخرت کی سعی کو بھی چھوڑ دیں مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اسباب دنیا کے اختیار کرنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے

بارہ میں اسباب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ پھر بعض لوگ جو دین ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ تو قابل خطاب ہی نہیں۔ شکایت تو ان لوگوں کی ہے جو دین کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں اور پھر اس کے اسباب اختیار نہیں کرتے۔ بزرگوں کے پاس آتے جاتے ہیں لیکن ان سے دین کا راستہ پوچھتے بڑی دوڑ ان کی یہ ہے کہ بزرگوں سے جاکر عرض کرتے ہیں کہ ہم کو ایک توجہ سے کامیاب کر دیجیے گویا وہ بھی اسیطرح کامیاب ہو گئے تھے۔ میں کہتا ہوں اسی پر فیصلہ ہے اگر محض توجہ سے دین کامل ہو سکتا ہے تو ان بزرگ ہی سے پوچھ لو کہ حضور آپ بھی توجہ ہی سے کامیاب ہوئے تھے یا آپ کو کچھ کرنا بھی پڑا تھا اگر وہ محض توجہ سے کامیاب نہیں ہوئے تو پھر آپ کو اُن سے ایسی درخواست کرنے کا کیا حق ہے۔ صاحبو! یہ سب نفس کے بہانے ہیں وہ آپ کو ان دھوکوں سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ اور منشاء اس کا محض کم ہمتی اور قلت مبالاۃ بالدین ہے کہ ہم کو خدا کی طاعات میں وہ اہتمام نہیں جو دنیا کے کاموں میں ہے۔ بعض لوگ دھوپ کی وجہ سے جماعت کی نماز ترک کر دیتے ہیں لیکن اگر اس وقت حاکم بلاوے تو دھوپ کبھی مانع نہ ہو۔ عین دوپہر کے وقت حاکم کے پاس جاوینگے پھر وہاں سے آکر دھوپ کی کچھ شکایت نہ کریں گے بلکہ حاکم سے ملاقات کرنے پر فخر کریں گے کہ ہم سے آج خوب باتیں ہوئیں حاکم نے فلاں مقدمہ کی بابت یوں سوالات کیے ہمارے فلاں معاملہ کے متعلق یوں کہا۔ حالانکہ یہ کوئی فخر کی بات نہ تھی آخر حاکم کون ہے تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ فخر کی بات تو یہ ہے کہ نماز میں حق تعالیٰ سے باتیں ہوتی ہیں ہم اس قابل تو کہاں تھے کہ خدا تعالیٰ ہم سے باتیں کریں واللہ ہم تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ہم ان کا نام ہی لیلیں ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

(اگر ہم ہزار بار بھی اپنے منہ کو مشک اور عرق گلاب سے دھولیں لیکن پھر بھی اے خدا آپکا نام پاک لینا کمال بے ادبی تھا مگر آپ کے کرم نے ہمکو اجازت دیدیا کہ ہمارا نام لیا کرو)

مگر یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انھوں نے ہم کو اجازت دیدی کہ نماز میں جب چاہو اُن سے باتیں کرلو۔ پھر وہ ہماری باتوں پر توجہ بھی فرماتے ہیں ہماری عرض ومعروض کا جواب بھی دیتے ہیں۔ پھر نماز میں ہم کو قرآن پڑھنے کی اجازت دی بلکہ اس کو فرض کردیا جو کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے گویا اس طرح حق تعالیٰ بھی ہم سے باتیں کرتے ہیں پھر یہ کس قدر رحمت ہے کہ ہم کو اسم عَلَم سے پکارنے کی یعنی یا اللہ کہنے کی اجازت دی کہ اُن کا نام لے کر ان کو پکار سکتے ہیں ذرا کسی حاکم کو تو نام لے کر پکارو۔ فوراً جرم قائم ہوجاوے گا پھر نام بھی اتنا آسان کہ بچہ سب سے پہلے اللہ کا نام یاد کرلیتا ہے۔ افسوس ایسے رحیم وکریم خدا سے باتیں کرنے کے لئے لوگوں کو دھوپ مانع ہوتی ہے اور بلا وجہ جماعت کی نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر ایک رحمت یہ ہے کہ وہ ہماری طاعات ناقصہ کو بھی قبول کرلیتے ہیں۔ باقی یہ بات کہ کیسے معلوم ہوا کہ ہماری یہ طاعات ناقصہ قبول ہوتی ہیں۔ سو حضرت حاجی صاحبؒ نے قبول طاعات کی ایک علامت عجیب بیان فرمائی۔ فرمایا کہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کے آنے سے کسی کو ناگواری ہوا کرتی ہے تو اگر وہ قادر ہو تو دوسرے وقت اس کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیا کرتا تو یاد رکھو اگر حق تعالےٰ کو تمھاری پہلی عبادت ناگوار ہوئی ہوتی تو وہ دوسرے وقت تم کو مسجد میں نہ گھسنے دیتے نہ نماز کی توفیق دیتے۔ پس جب ایک نماز کے بعد دوسرے وقت تم کو پھر اسی نماز کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلے وقت کی نماز قبول ہوچکی اسی طرح تمام طاعات میں سمجھ لو۔ واقعی عجیب بات بیان فرمائی گو یہ حجت قطعیہ نہ ہو مگر انا عند ظن عبدی بی کے ساتھ ملا کر امید ہے کہ اگر ہم حق تعالےٰ کے ساتھ یہی گمان رکھیں تو قبولیت کا اچھا قرینہ ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے تم کو تو پانچوں وقت مسجد میں آنے کی توفیق دیدی اور بہت سی مخلوق ایسی ہے جن کو سال میں ایک وقت آنے کی بھی توفیق نہیں دی معلوم ہوتا ہے خدا تعالےٰ کو ان کا مسجد میں آنا گوارا نہیں۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

ایک گنوار کا قصہ ہے کہ اس کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا۔ ملّا خفا ہونے لگا کہ لوگ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ کچھ کرتے ہیں اور جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں۔ گنوار نے ملّا سے کہا کہ کیوں بڑ بڑ کرتا ہے جانور تھا مسجد میں گھس آیا کبھی ہم کو بھی آتے ہوئے دیکھا ہے۔ دیکھئے توفیق نہ ہونا اس کا نام ہے۔

اسی طرح ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ آقا اور غلام بازار میں کسی کام کو گئے تھے راستہ میں نماز کا وقت آگیا، غلام نمازی تھا اس نے آقا سے نماز کی اجازت مانگی اس نے اجازت دیدی کہ اچھا جلدی نماز پڑھ کر چلے آؤ میں مسجد کے باہر بیٹھا ہوا ہوں۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ غلام کو تو مسجد میں آنے کی اجازت دی گئی اور آقا کو باہر ہی سے روک دیا گیا۔ غلام نے آکر نماز پڑھی اور نہایت اطمینان سے فرض و نوافل کو پورا کیا حتّٰی کہ سب نمازی فارغ ہو کر چلے گئے اس کا آقا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اس نے ایک شخص سے جو سب کے آخر میں مسجد سے نکلا تھا پوچھا کہ اب مسجد میں کتنے آدمی ہیں کہا صرف ایک آدمی ہے وہ سمجھا کہ شاید اب جلدی آجائے گا۔ مگر غلام نے وہاں تنہائی میں کوئی وظیفہ شروع کر دیا پھر بھی نہ آیا آخر آقا نے تنگ ہو کر آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے باہر کیوں نہیں آتے، غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا آقا نے پوچھا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تم کو باہر سے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو اندر سے باہر نہیں جانے دیتا۔ سبحان اللہ خوب جواب دیا صاحبو! توفیق الٰہی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دین کے کام وہی کرتا ہے جس کو خدا توفیق دیتا ہے اور یہاں سے اہل طاعات کو سبق لینا چاہیئے اور ان کو اپنی طاعات پر غرور نہ کرنا چاہیئے نہ کسی محروم الطاعت کو حقیر سمجھنا چاہیئے کیونکہ تم جو کچھ کر رہے ہو محض توفیق الٰہی سے کر رہے ہو اپنا کمال مت سمجھو بلکہ ڈرتے رہو کہ کہیں حق تعالٰے تم سے یہ توفیق سلب نہ کر لیں جس طرح دوسروں سے سلب کر لی ہے۔ اللّٰھم انا نعوذ بک من الحور بعد الکور ۱۲)

غرض مسئلہ توفیق پر نظر کرنے سے حضرت حاجی صاحبؒ نے قبول طاعت کی جو علامت بیان فرمائی ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور اس سے حق تعالےٰ کی رحمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بہت ہی رحمت ہے کیونکہ ہم لوگ جیسی نماز پڑھتے ہیں ظاہر ہے نہ خضوع ہے نہ خشوع نہ ذکر ہے نہ فکر۔ بس گھڑی کی کوک ہے جس سے سوئی خود بخود چل رہی ہے۔ دنیا بھر کے خیالات نماز ہی میں ہم کو سوجھتے ہیں مگر بقاعدۂ مذکورہ بھی قبول ہوتی معلوم ہوتی ہے تو اس رحمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ بھلا تم کسی حاکم کے سامنے کھڑے ہو کر تو دوسری طرف توجہ کرلو جو فوراً دربار سے نہ نکال دیئے جاؤ۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں قبولِ ذکرِ تو از رحمت ست
چوں نمازِ مستحاضہ رخصت ست

(اے خدا آپ کا ہمارے ذکر کو قبول فرمالینا آپ کی رحمت ہے جس طرح سے استحاضہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی آپ نے اجازت عطا فرمادی ہے)

واقعی خوب مثال دی کہ جیسے مستحاضہ کی نماز محض رحمت سے قبول ہوتی ہے حالانکہ اس کو نہ طہارت حاصل ہے نہ نظافت خون ٹپک رہا ہے اور شریعت فتویٰ دیتی ہے کہ کچھ حرج نہیں نماز پڑھے جاؤ سب قبول ہے۔ یہی حال ہماری نمازوں کا ہے۔ مگر اس رحمت کا حال معلوم کرکے بے فکر نہ ہونا چاہیئے کہ بس جب وہ ہر طرح قبول کرلیتے ہیں تو خشوع وخضوع کی کیا ضرورت ہے کیونکہ اس حالت میں نماز کا قبول ہونا قاعدہ کے خلاف ہے۔ قاعدہ وہی ہے کہ نماز جبھی قبول ہوگی جبکہ واجبات وشرائط کے ساتھ ادا کی جائے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ خشوع وخضوع نماز میں فرض ہے اور بعض نے اس کو سنت کہا ہے۔ بہرحال بے فکری کسی حال میں نہیں ہونی چاہیئے غیرت مند طبائع تو اس رحمت و شفقت کا حال معلوم کرکے مارے شرم کے گڑ جاتے ہیں کہ افسوس اُدھر سے

اتنی توجہ اور ہماری طرف سے ایسی بے رخی مرجانے کی جگہ ہے اور شرم سے اور زیادہ سعی اور خدمت کرتے ہیں الغرض دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ دین کو دنیا پر بہت سے وجوہ سے ترجیح ہے اور دنیا کے کاموں میں اسباب و طرق کے اختیار کرنے کی ضرورت عقلاء کے نزدیک مسلم ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دین کے اسباب اختیار نہیں کئے جاتے .. میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ ناکامی کا راز عدم علم مقصود ہوتا ہے یا عدم تعین طریق وصعوبت طریق۔ یا عدم ترتب مقصود علی الطریق۔ اور جہاں ان میں سے کسی کا وجود نہ ہو وہاں ناکامی کا سبب بجز کم ہمتی اور سستی اور کاہلی کے کچھ نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ جو لوگ دین میں ناکام ہیں وہ محض اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے ناکام ہیں اس کے سوا کوئی سبب ناکامی کا نہیں نکل سکتا کیونکہ دین کا مقصود ہونا معلوم اس کا طریق بھی معلوم۔ اور میں دعوے کے ساتھ اس کو بیان کر چکا ہوں کہ دین میں تنگی کچھ نہیں اس لئے صعوبت طریق بھی معدوم یہ بھی نصوص سے میں بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد دنیویہ کا ترتب اسباب دنیویہ پر لازم نہیں مگر مقاصد دینیہ کا ترتب اسباب دینیہ پر ضروری ہے کیونکہ نصوص میں اس کا وعدہ بطور جزم کے ہے بلکہ ترقی عطا کرنے کا بھی وعدہ ہے اور اعانت الٰہیہ کا بھی وعدہ ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی دین میں ناکام رہے تو اس کا سبب بجز بدبختی اور کاہلی اور سستی کے کیا کہا جاوے۔ اس وقت جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں بھی حق تعالےٰ نے اسی مقصود دینی کو بیان فرمایا ہے اور ایک اس کا طریق بتلایا ہے۔ آیندہ آپ کو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس آیت میں جو طریق حق تعالےٰ نے بیان فرمایا ہے وہ کتنا سہل اور آسان طریق ہے جس سے زیادہ آسان کوئی دوسرا طریق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تفصیل سے پہلے میں آیت کی تفسیر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں یَا اَیُّھَا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا

مع الصادقین ٥ اس آیت کے دو جزو ہیں ۔ (۱) اتقوا اللہ (۲) کونوا مع الصادقین ۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ دو جملوں میں دریا کو بھر دیا ہے ۔ چنانچہ ابھی تفصیل معلوم کر لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان دو جملوں میں کتنے بڑے مضمون کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ۔ قرآن کے جملوں کی تفسیر مختلف عنوانات سے ہو سکتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت میں بھی کسی مفسر نے دوسرا عنوان اختیار کیا ہو مگر وہ اختلاف محض عنوان ہی کا ہوتا ہے معنوں میں ایک ہوتا ہے ۔ اس آیت کا جو معنوں میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اتقوا اللہ میں مقصود کا ذکر ہے اور کونوا مع الصادقین میں اس مقصود کے طریق کا ذکر ہے کیونکہ جن لوگوں نے قرآن کو بنظر غائر دیکھا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ قرآن میں مقاصد کے ساتھ طرق کا ذکر بھی اکثر فرما دیا کرتے ہیں اور یہ ان کی غایت شفقت و رحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کسی بات کا حکم فرما کر حیران و پریشان نہیں چھوڑتے بلکہ اس کا طریق بھی ساتھ کے ساتھ بتلا دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح سے ہوگا یہ طریقہ اختیار کرو ۔ اس عادت پر نظر کر کے میرا ذوق یہ بتلاتا ہے کہ اس آیت میں بھی جملہ اولیٰ میں مقصود کا بیان ہے اور ثانیہ میں طریق کا ۔ یعنی تقویٰ مقصود ہے اور معیت صادقین اس کے حصول کا طریق ہے ۔ بعبارت دیگر یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا امر فرمایا ہے اور معیت کاملین اس کا طریق بتلایا ہے اس کو میں آگے چل کر واضح کر دوں گا کہ تقویٰ کی تفسیر کمال دین ہے یا نہیں ۔ اس وقت میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ کمال دین مقصود و مطلوب ہے یا نہیں تو سمجھ لیجئے کہ مقاصد میں ہمیشہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے ناقص حالت میں کوئی قناعت نہیں کرتا ۔ تجارت کرتے ہیں تو اس میں بھی کمال مطلوب ہوتا ہے ۔ لاکھ دو لاکھ پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ جس قدر ترقی ہوا اس سے آگے کے طالب رہتے ہیں ۔ ایسا کوئی نہیں کرتا کہ جب ضرورت سے زیادہ

آمدنی ہو جائے تو آئندہ کے لئے سعی اور کوشش چھوڑ دے۔ نہیں بلکہ قسم قسم کی تجارتیں نئی نئی شروع کر دیتے ہیں اگر ایک شخص کے یہاں بساط خانہ کی تجارت ہے اور اس سے معتدل آمدنی ہوتی ہے تو سرمایہ زیادہ ہو جانے کے بعد وہ کپڑے کی بھی ایک دوکان کھول دیتا ہے اور ترقی ہوئی تو جوتوں کی دوکان بھی کر لیتا ہے یہاں تک کہ پہلے اگر باپ بیٹے سب مل کر ایک دوکان کر رہے تھے تو اب ہر بیٹے کی الگ دوکان کھول دی جاتی ہے چنانچہ مشاہدہ ہے پھر بہت سے مکان خرید کر کرایہ پر دیدیئے جاتے ہیں۔ غرض ہر وقت ترقی کی دھن لگی رہتی ہے کسی حد پر بس نہیں کرتے وہ حال ہو جاتا ہے۔

ع:۔ لاینتھی ارب الا الی ارب + اگر کسی کے پاس ضرورت کے موافق زمین موجود ہو تو وہ اس پر قناعت نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ آج ایک گاؤں پورا خرید لوں، ایک گاؤں خریدنے کے بعد دوسرے گاؤں کی تمنا رہتی ہے ؎

ملک اقلیم ار بگیرد بادشاہ
ہمچناں در بند اقلیمے دگر

(ایک ملک اگر بادشاہ لے لیتا ہے لیکن وہ قناعت سے محروم ہونے کے سبب دوسرے ملک کے حرص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔)

غرض انسان دنیوی ترقی میں ہمیشہ زیادت کا طالب رہتا ہے یہاں تک کہ موت ہی سے یہ سلسلہ منقطع ہوتا ہے اس سے پہلے منقطع نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

گفت تنگِ چشمِ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

(کہا کہ دنیا دار کی تنگ نظر اور لالچ سے پُر نظر کو یا تو قناعت پُر کر سکتی ہے یا قبر کی خاک پُر کر سکتی ہے)

دنیا دار کو قناعت تو ہوتی نہیں ہاں خاک گور ہی سے اس کی حرص منقطع ہوتی ہے۔ شاید آپ مجھ کو کوئی ایسا آدمی دکھلائیں کہ جس نے دس ہزار روپیہ یا دس گاؤں حاصل کر کے بس کر دیا ہو اور آئندہ کے لئے سعی کو ختم کر دیا ہو۔ لیکن اول تو یہ بہت ہی شاذ ہے لاکھوں میں ایک آدمی ایسا ہوگا۔ والنادر کالمعدوم۔ اگر لاکھوں میں ایک آدمی آپ نے ایسا دکھلا بھی دیا تو اس سے میرے بیان پر نقض وارد نہیں ہوتا۔ کیونکہ قواعد میں اکثر کا لحاظ ہوا کرتا ہے اور اکثر کی حالت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ پھر میں کہتا ہوں کہ جو شخص ایسا آپ دکھلائیں گے وہ دیندار ہوگا دنیا دار نہ ہوگا اور گفتگو اہل دنیا کی حالت میں ہے اور اگر وہ دیندار بھی نہ ہو دنیا دار ہی ہو تو اس کا ایک سرسری جواب تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک غالباً یہی کمال ہوگا جب وہ کمال حاصل ہو گیا تو مقصود تک وصال ہو گیا اس سے آگے کوئی کمال اس کی نظر میں ہے ہی نہیں پس وہ بھی طالب کمال نکلا ناقص حالت پر اس نے بھی قناعت ہرگز نہیں کی۔ اور حقیقی جواب یہ ہے کہ گو اس نے صورۃً ترقی کو ختم کر دیا مگر معناً وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے کیونکہ یہ شخص عاقل دنیا دار ہے نادان نہیں وہ دنیا کی روح کو سمجھ گیا ہے کہ اسباب معاش سے مقصود سکون قلب و راحت قلب ہے اور ہر وقت اسباب معاش میں لگے رہنے سے راحت و سکون قلب میسر نہیں ہوتا دل پریشان اور مشغول رہتا ہے اس لئے اس نے ایک معقول سرمایہ حاصل کر کے آئندہ کے لئے صورت ترقی کو بند کر دیا لیکن حقیقت میں وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے پہلے اسباب میں ترقی کر رہا تھا اب مسبب اور مقصود میں ترقی کر رہا ہے یعنی راحت و آرام کے بڑھانے میں مشغول ہے غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ دنیوی اسباب میں ہر شخص کمال کا طالب ہے کسی قدر حاصل پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی آگے کا طالب رہتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی خاص حد پر بس بھی کرتا ہے تو ناقص حالت

پر ہرگز بس نہیں کرتا۔ بلکہ کوشش اور سعی کو ہمیشہ درجۂ کمال پر پہنچا کر ختم کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو تجارت میں نقصان ہو رہا ہے تو اس حالت پر کوئی بھی سعی کو ختم نہ کرے گا۔ بلکہ جب اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جائے کہ وہ ساری عمر کو کافی ہو جاوے بلکہ بچ بھی جاوے اس وقت بعض لوگ سعی کو ختم کر سکتے ہیں پس یہ بات یقیناً معلوم ہو گئی کہ ناقص حالت پر کوئی بھی قناعت نہیں کرتا قناعت ہمیشہ حصول کمال ہی کے بعد ہوتی ہے گو وہ بھی قناعت صوری ہے ورنہ حقیقت میں اب بھی ترقی ختم نہیں ہوئی ۱۲ جامع)

پھر حیرت ہے کہ دین میں لوگوں کو ناقص حالت پر قناعت کیوں ہے چنانچہ بڑی دینداری آج کل یہ ہے کہ نماز پانچوں وقت کی پڑھ لی جب نماز پڑھنا شروع کر دی تو اب وہ اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں اور اسی پر قناعت کر لیتے ہیں پھر افسوس یہ کہ جس نماز پر قناعت کی جاتی ہے وہ بھی کامل نہیں ہوتی یعنی اول تو محض نماز کے کامل کر لینے سے بھی دین کامل نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ نماز بھی کامل نہ ہو ناقص در ناقص ہی ہو اس پر قناعت کر لینا تو بہت ہی کوتاہی ہے بعضے نماز کے بعد زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں زکوٰۃ دیدی تو گویا انھوں نے جنت کو خرید لیا اور اگر حج بھی کر لیا تو پھر کیا تھا جنید وقت ہو گئے اب انھیں آگے ترقی کی کچھ ضرورت نہیں رہتی وہ اسی پر دین کو کامل سمجھ کر سعی اور ترقی بند کر دیتے ہیں عوام کی کیا شکایت کی جائے افسوس یہ ہے کہ بعض اہلِ علم بھی اس بلا میں گرفتار ہیں۔ ایک عالم نے مجھے لکھا کہ آپ نے جو وظیفہ وغیرہ مجھ کو بتلایا تھا وہ تو کر لیا اب آگے کچھ اور سبق بھی ہے یا بس ختم ہو گیا۔ افسوس دنیا مردار تو ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی حد پر بھی قناعت نہیں کی جاتی۔ اور دین کو ایسا حقیر سمجھ لیا ہے کہ چار دن کام کر کے اپنے کو کامل اور منتہی ہونے کا احتمال سوجھنے لگا۔ مجھے ان عالم کا یہ خط سخت ناگوار ہوا اور میں سمجھا کہ ان کو دین کا ادب بھی بالکل نہیں کیونکہ ان کے الفاظ سے تمسخر ٹپکتا تھا میں نے ان کو لکھ دیا کہ

میرا تم سے نباہ نہ ہوگا میں تم کو قابل خطاب بھی نہیں سمجھتا تم کو نہ دین کی طلب ہے نہ اس کا ادب دل میں ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؁ غرض لوگوں نے دین کو نماز روزہ زکوٰۃ وحج میں منحصر سمجھ لیا ہے اس سے زیادہ کی وہ ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ جو شخص تقویٰ کامل اختیار کرے اور حقوق العباد وغیرہ کا پورا لحاظ کرے اور دین میں ترقی کا ارادہ کرے اس کو پاگل سمجھتے ہیں مگر وہ ایسا پاگل ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

او گل سرخ ست تو خونش مخواں　　مست عقل ست او تو مجنونش مداں

(وہ گل سرخ (گلاب کا پھول) ہے تو اس کو خون مت سمجھ وہ مست عقل نورانی ہے تو اس کو پاگل مت سمجھ)

ما اگر قلاشش دگر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر قلاشش اور اگر دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے کیونکہ ہم اس ساقی ازل کے مست ہیں اور اس پیمانۂ ازل کے مست ہیں)

وہ خدا کے دیوانے ہیں جن کے لئے یہ دیوانگی فخر ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
مرعسس را دید و درخانہ نشد

(پاگل وہی ہے جو ان کا دیوانہ نہ ہوا کوتوال کو دیکھا اور گھر میں نہ چھپا)

میرے ایک دوست پہلے ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن انھوں نے اپنی دین کی حفاظت کے لئے صیغۂ حکومت سے اپنا تبادلہ کرالیا ہے اب وہ تعلیم کی لین میں ہیں جس میں تنخواہ ڈپٹی کلکٹری سے کم ہے۔ اس پر بہت لوگوں نے ان کو بیوقوف بنایا کہ یہ بھی عجب دیوانے ہیں کہ اتنی بڑی تنخواہ چھوڑ کر تھوڑی تنخواہ پر قناعت کرلی اور حکومت کا عہدہ چھوڑ کر ذلیل عہدہ اختیار کیا۔ مگر جب یہ لوگ خدا کے سامنے پہنچیں گے اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ بیوقوف کون تھا۔

اِنہیں دوست کا یہ قصہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کرنے کو تھے ان کے ساتھ اُن کا ایک لڑکا بھی تھا وہ اس کی عمر دریافت کر رہے تھے کہ بارہ سال سے کم ہے یا پورے بارہ سال کی ہے اگر پورے بارہ ۱۲ سال کی ہے تو قاعدۂ ریلوے کے موافق اس کا بھی ٹکٹ لینا چاہیئے۔ ان کے ساتھی کہہ رہے تھے کہ اس بچہ کی عمر بارہ سال کی تھوڑا ہی ہے اور اگر ہو بھی تو اس کا قد بہت کم ہے دس ۱۰ سال کا معلوم ہوتا ہے اگر آپ ٹکٹ نہ لیں گے تب بھی کوئی کچھ نہ کہے گا۔ انھوں نے کہا کہ ریل والے کچھ نہ کہیں تو خدا تعالیٰ تو کہیں گے کہ تم نے ایک شخص کی چیز کو اس کی بلا اجازت بدون کرایہ دیئے کیوں استعمال کیا۔ وہ بے چارے اس کی عمر کی تحقیق کر رہے تھے اور اُن کے نوکر ہنس رہے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ بچہ کی عمر بارہ سال سے زیادہ ہے تو انھوں نے اس کا بھی پورا ٹکٹ لیا۔ لوگ ان کو یہ رائے دیتے تھے کہ صاحب اگر آپ کے پاس یہ روپیہ ایسا ہی فضول ہے تو کسی غریب کو دیدیجئے ریل والوں کو آپ کیوں دیتے ہیں خصوصاً جبکہ وہ اس بچہ کے ٹکٹ کا آپ سے سوال بھی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ جس غرض سے میں اس کی عمر دریافت کر رہا ہوں غریبوں کو روپیہ دینے سے وہ غرض حاصل نہ ہوگی۔ یعنی تصرف فی ملک الغیر بلا اذنہ غریبوں کو دینے سے جائز نہ ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں سب لوگ ان کو بیوقوف اور مجنون سمجھ رہے تھے کہ فضول روپیہ ضائع کر رہے ہیں مگر وہ خدا کے مجنون تھے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب دین کا غلبہ ہوتا ہے تو مسلمان کو دنیوی مضرت کی پرواہ نہیں ہوا کرتی مگر یہ بات حکماء الٰہی سے دریافت کرنے کی ہے کہ دین کے لئے کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کس جگہ غیر مناسب ہے۔

یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر مضرت دنیویہ کا تحمل کر لینا چاہیئے اور اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے بلکہ اس میں تفصیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب شریعت کسی کام کو واجب کر دے یا کسی کام کو حرام کر دے تو واجب کے

ادا کرنے اور حرام سے بچنے میں اگر ہم کو کچھ دنیوی مضرت ایسی پہونچے جو مال یا آبرو کو ضرر پہنچانے والی ہو تو ہم کو اس مضرت کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے اور اگر ایسی مضرت ہو جس سے جان کا غالب خطرہ ہو تو اس وقت واجب کے وجوب اور حرام کی حرمت کا مکلف ہی یہ شخص نہ رہے گا اور مستحبات وسنن کے لئے تو مال یا آبرو کی مضرت کا تحمل کرنا بھی واجب نہیں ہوتا بلکہ افضل اور عزیمت ہے اور جان کی مضرت کا تحمل کرنا تو بعض دفعہ مستحبات وسنن کے لئے ناجائز اور حرام ہے غرض اس مسئلہ میں بہت تفصیل ہے (۱) جس کے لئے کتب فقہ کا مطالعہ ضروری ہے ہر شخص اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ کس جگہ مضرت کا تحمل مناسب ہے اور کہاں مناسب نہیں اور کہاں واجب ہے اور کہاں حرام ہے اگر ہر شخص کی رائے پر اس کو چھوڑ دیا جاوے تو وہی قصہ ہوگا کہ ایک شخص نے ایک مولوی صاحب کے وعظ میں توکل کی فضیلت اور اس کی ضرورت کا مضمون سنا تھا وہ بہت خوش ہوا کہ جب خدا تعالےٰ یوں بھی روزی پہنچا سکتے ہیں تو محنت ومشقت کی کیا ضرورت ہے بس آپ نے سارا کاروبار چھوڑ دیا اور جنگل میں لب سڑک جا بیٹھا۔ اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ سڑک سے دور جا بیٹھتے یہ خیال کیا کہ سڑک کے کنارے کوئی تو آتا جاتا دیکھے گا۔ دوسرے وہاں ایک کنواں بھی پاس تھا جس پر بیٹھ کر مسافر کھانا کھایا کرتے تھے تو اس نے یہ جگہ اس لئے تجویز کی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ کوئی مسافر بھی مجھے کھانا نہ دے گا۔ اب آپ کو مسافروں کا انتظار شروع ہوا کہ شاید کوئی آوے اور مجھے کھانا کھلاوے۔ ایک آیا اور اس نے کھاپی سیدھا اپنا رستہ لیا۔ سمجھا کہ ان شاء اللہ تعالےٰ اس مرتبہ جو کوئی آوے گا وہ ضرور مجھے دیکھ کر کھلاوے گا۔ دوسرا آیا اُس نے اس شخص کی طرف سے پشت کرلی اور سڑک کی طرف منہ کرکے کھانا کھایا اور وہ بھی چلتا ہوا اسی طرح دو تین دن گذر گئے اور کسی نے بھی اس کو ایک ٹکڑا نہ دیا۔ آخر میں ایک مسافر آیا اور اس نے بھی کھاپی کر چلنے کا ارادہ کیا تھا کہ آپ نے کھنکارا آہیں ہیں

اس نے مڑکر جو دیکھا تو ایک آدمی نظر پڑا جس کا فاقوں کے مارے برا حال ہے اس کو ترس آیا اور جو کچھ بچی ہوئی روٹیاں تھیں اس کے حوالے کیں جنھیں کھا کر میاں کے حواس درست ہوئے اور بھاگا ہوا مولوی صاحب کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا کہ مولوی صاحب آپ نے توکل کے بیان میں ایک قید ضروری چھوڑ دی ہے جس سے لوگوں کو دھوکہ ہوا ہوگا اور نہ معلوم کتنے آدمی اس دھوکہ سے پریشان ہوئے ہوں گے وہ تو خدا نے خیر کی کہ میں نے اپنے اجتہاد سے اس قید کو سمجھا ورنہ میں بھی ہلاک ہوگیا ہوتا۔ براہِ مہربانی آئندہ آپ جہاں کہیں توکل کا بیان فرمایا کریں اتنی قید اور بڑھا دیا کریں کہ کھڑکانے کی بھی ضرورت ہے پھر اس نے اپنا قصہ بیان کیا۔ تو دیکھئے اس شخص نے ترک اسباب کا بیان سن کر یہ سمجھ لیا کہ میں بھی ترک اسباب کا اہل ہوں اس لئے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گیا اور پریشان ہوا حالانکہ اس کی تشخیص اس کو کسی طبیب روحانی سے کرانی چاہیئے تھی کہ میں ترک اسباب کا اہل ہوں یا نہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے وعظ میں سن لیا تھا کہ اللہ کے راستہ میں جو ایک روپیہ دے گا اس کو دس دنیا میں ملیں گے اور ستر آخرت میں۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ اس سے اچھی تجارت کیا ہوگی۔ بس سب کام چھوڑ کر یہی کرنا چاہیئے چنانچہ اس کے پاس ایک روپیہ تھا اس نے اسے خیرات کر دیا اور منتظر رہا کہ اب دس روپے آویں گے کئی دن گذر گئے ایک پیسہ بھی نہ آیا بڑا پریشان ہوا یہاں تک کہ میاں کو دست لگ گئے کیونکہ اب اس کو رہ رہ کر اپنے روپیہ کے جانے کا بھی غم ہوتا تھا اور دل دل میں مولوی صاحب کو برا بھلا کہتا تھا کہ انھوں نے یہ کیسا غلط مسئلہ بیان کیا بے چارے کو اسی فکر میں دست اور پیچش لگ لگ گئی بار بار اجابت کے لئے جنگل جاتا تھا۔ ایک دن وہ قضائے حاجت کر رہا تھا اور زمین کو کرید رہا تھا کہ دفعۃً مٹی میں سے ایک بٹوہ ملا جس میں پورے دس روپے تھے بڑا خوش ہوا اور دست تو فوراً موقوف ہوگئے کیونکہ جس علت

سے دست آنے شروع ہوئے تھے وہ علت ہی نہ رہی۔ دوڑا ہوا مولوی صاحب کے پاس آیا کہ مولوی صاحب آپ نے جو کچھ وعظ میں فرمایا تھا بالکل درست ہے مگر اس میں ایک قید آپ نے چھوڑ دی۔ آئندہ جہاں یہ مسئلہ آپ بیان کریں ساتھ میں یہ بھی فرما دیا کریں کہ مروڑے بھی لگتے ہیں اس کے بعد جس کو تحمل ہوگا ایک کے دس لے گا۔ اور جس کو تحمل نہ ہوگا وہ اس طریقہ کو اختیار نہ کرے گا۔ یہ سچ ہے کہ ایک کے دس ملتے ہیں مگر مروڑے غضب کے ہیں غرض یہ بات ضروری ہے کہ ہر شخص کو تحمل مضرت کی اجازت نہیں اس کے لئے کچھ شرائط اور محل ہیں مگر یہ بات ضرور ہے کہ جب دین کا غلبہ ہو جاتا ہے تو دین دار کو دنیوی مضرت کی پروا نہیں رہا کرتی۔

میرے ایک دوست کی حکایت ہے جو بی۔ اے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ ریل کا سفر کر رہے تھے ان کے پاس اسباب زیادہ تھا اور جس اسٹیشن سے وہ سوار ہوئے تھے وہاں وزن کرانے اور بلٹی لینے کی فرصت نہ ملی تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس اسٹیشن پر اتروں گا وہاں وزن کرا کے محصول ریلوے ادا کر دوں گا چنانچہ جب وہ منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بابو سے انھوں نے کہا کہ میرے پاس اسباب زیادہ ہے جس کا محصول ادا کرنا میرے ذمہ ہے مجھ کو بوجہ تنگی وقت کے سوار ہوتے ہوئے اس کی بلٹی کرانے کا موقع نہ ملا آپ اس وقت وزن کر کے مجھ سے محصول لے لیجئے اور چونکہ میں نے اپنا واقعہ خود بیان کر دیا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے خیانت اور خلاف ورزی قانون کا قصد نہیں کیا تھا اس لئے آپ کو اصل محصول لے لینا چاہیئے ڈبل چارج نہ کرنا چاہیئے۔ بابو نے کہا ہم کچھ نہیں لیتے انھوں نے پھر اصرار کیا وہ متعجب ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا اس نے بھی وزن کرنے اور محصول لینے سے انکار کیا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا تو وہ دونوں ان کو انگریزی زبان سے ناواقف سمجھ کر انگریزی میں باتیں کرنے لگے وہ باتیں یہ تھیں کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے شراب پی ہے جو باوجود

انکار کے از خود روپیہ دینا چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا میں نے شراب نہیں پی میرا مذہب مجھ کو مجبور کرتا ہے۔ افسوس آج کل فریب اور پالیسی کا بازار ایسا گرم ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی کہ کوئی شخص از خود بھی خدا کے خوف سے دوسروں کا حق ادا کر سکتا ہے۔ بس وہ یوں سمجھتے ہیں کہ عاقل وہی ہے جو از خود کسی کا حق ادا نہ کرے اور جس کو خود بخود اِس کی فکر لگی ہوئی ہو اسے پاگل سمجھتے ہیں چنانچہ ریل والوں نے ان کو پاگل ہی سمجھا اور یہ کہا کہ آپ اپنا اسباب لے جائیں ہماری اجازت ہے آپ کو کوئی کچھ نہ کہیگا انھوں نے کہا کہ آپ کو اس اجازت کے دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں کیونکہ آپ ریلوے کمپنی کے مالک نہیں ہیں بلکہ اس کے ملازم ہیں آپ کو ریلوے کے حق چھوڑنے کا کیا حق ہے مگر کسی طرح ریلوے والوں نے ان سے محصول نہ لیا انھوں نے اپنا اسباب اٹھایا اور باہر آکر سوچنے لگے کہ اے اللہ میں کیا کروں۔ اب حق تعالیٰ نے ان کی اعانت فرمائی جبکہ دیکھا کہ میرے بندہ کو معصیت سے بچنے کا راستہ نظر نہیں آتا اور دوسرے لوگ اس کو معصیت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس سے بچنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ معًا دل میں یہ بات آئی کہ مقدار محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کمپنی کا لے کر چاک کر دینا چاہیئے اس طرح محصول ادا ہو جائیگا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ صاحبو! آپ دین پر عمل کر کے تو دیکھیں ان شاء اللہ قدم قدم پر آپ کو اعانت الٰہیہ کھلی آنکھوں نظر آئیگی یہ تو سب جانتے ہیں کہ کمال دین بدون اعانت خداوندی کے حاصل نہیں ہوتا مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ابتدائی منازل میں بھی حق تعالیٰ پوری اعانت کرتے ہیں پس دین کے کام میں ابتدا سے انتہا تک اعانت الٰہیہ ساتھ رہتی ہے پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ کہ صاحب دین پر عمل کیسے کریں یہ تو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ارے بھائی تم کو اگر مشکل معلوم ہوتا ہے تو خدا کو تو کوئی مشکل نہیں جب وہ تمھاری اعانت کا وعدہ فرماتے ہیں پھر یہ عذر کرنا محض نفس کی شرارت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبُلنا ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا۔ پھر بھی افسوس ہے کہ لوگ دین میں ترقی حاصل

نہیں کرتے اور جس کو جتنا دین حاصل ہے وہ اسی پر قانع ہے۔ میں عوام ہی کی شکایت نہیں کرتا افسوس یہ ہے کہ خواص کو بھی ترقی دین کی فکر نہیں۔ بس جو تعلیم میں مشغول ہے وہ اسی پر قانع ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بڑا دیندار ہوں کہ ہر وقت قال اللہ و قال الرسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی میں رہتا ہوں جو لوگ ذکر شغل میں مشغول ہیں وہ اسی پر قناعت کئے بیٹھے ہیں کوئی ان سے پوچھے آخر شریعت میں معاملات اور معاشرات کی تعلیم کس لئے دی گئی ہے اصلاح اخلاق کا اہتمام کیوں نہیں کیا گیا ہے کیا یہ دین نہیں کیا اس پر عمل کرنے کے لئے مسلمانوں کے علاوہ کوئی دوسری قوم پیدا ہو گی آخر تقویٰ کی فروع فقہیہ پر تم کیوں عمل نہیں کرتے یہ مسائل فقہاء نے کس کے لئے بیان کئے ہیں۔ دنیا دار اگر قلیل حصہ دین پر قناعت کرے تو وہ اتنا خسارہ میں نہیں جتنا خسارہ اہل علم کو ادنیٰ حصہ دین پر قناعت کرنے سے پہنچیگا۔ کیونکہ دنیا دار نے اگر دین کم حاصل کیا تو اس نے دنیا میں تو لذت و راحت حاصل کر لی اور یہ مولوی صاحب دنیا میں تو پھسڈی ہی تھے ہی اگر دین میں بھی پھسڈی رہے تو کسی طرف کے بھی نہ ہوئے نہ دنیا میں چین ہوئی نہ آخرت میں وہاں بھی یہ کلفت ہی میں رہیں گے اور دنیا میں تو یہ کلفت کے اندر ہیں ہی کہ نہ عالیشان محل رہنے کو ہے نہ نوکر چاکر ہیں نہ زیادہ روپیہ ہے نہ عمدہ اور لذیذ غذائیں ہیں نہ ریشمی لباس زیب تن ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ طبقہ ادنیٰ دین پر کیوں کر قناعت کرتا ہے اور دنیا کو چھوڑنے کے بعد یہ کمال دین کی فکر کیوں نہیں کرتے۔

امام غزالی نقل فرماتے ہیں ؎

اری الملوک بادنی الدین قد قنعوا　　وما اراھم رضوا فی العیش بالدون
فاستغن بالدین عن دنیا الملوک　　کما استغنی الملوک بدنیاھم عن الدین

مطلب یہ ہے کہ میں سلاطین و اہل دول کو دیکھتا ہوں کہ انھوں نے تھوڑے سے دین پر قناعت کر کے اپنے کو دنیا میں مشغول کر دیا ہے اب تم ان کو اس طرح

نیچا دکھاؤ کر تھوڑی سی دنیا پر قناعت کر کے دین میں کمال پیدا کرو اور سلاطین کی دنیا سے مستغنی ہو جاؤ کیونکہ اب ان کو نیچا دکھانے کا یہی طریقہ ہے۔ دنیا میں تو ان سے بڑھ جانا تمہاری قدرت میں نہیں ہے مگر دین میں بڑھنا تو قدرت میں ہے پس تم دین میں سلاطین کو نیچا دکھا دو کہ وہ آج تم سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں تو دین کی برکت سے کل تم ان سے بڑھے ہوئے رہو گے اور اگر تم دین میں بھی کم رہے تو سلاطین تم سے ہر جگہ بڑھے ہوئے رہیں گے اور یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ سبحان اللہ کیا عجب تعلیم ہے اور یہ لطیفہ ایسا ہے جیسا ایک شاعر نے کہا ہے ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو ⁂ ہمہ خنداں بُدند و تو گریاں
(کیا تو یاد رکھتا ہے اس بات کو کہ جب پیدا ہوا تھا تو سب تو خوش ہوئے
تھے اور ہنس رہے تھے اور تو رو رہا تھا)
آنچناں زی کہ وقتِ مردنِ تو ⁂ ہمہ گریاں شوند و تو خنداں
(پس جب تو دنیا سے جاوے تو دنیا میں ایسے اعمال کر لے کہ تو ہنستا
ہوا جاوے اور لوگ رو رہے ہوں)

یعنی تم کو یہ بات بھی یاد ہے کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو سب لوگ ہنس رہے تھے اور تم روتے ہوئے آئے تھے۔ تو یہ لوگ نہایت ظالم ہیں کہ اُن کو تمہارے رونے پر بھی رحم نہ آیا اس وقت ان کو خوشی کی سوجھ رہی تھی اب تم ان کو اس طرح بدلہ دو کہ تمہارے مرنے کے وقت وہ سب روئیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ یعنی ایسی زندگی بسر کرو جس کی بدولت سب کو تمہارے مرنے کا غم ہوا اور تم کو لقاء الٰہی کی خوشی ہو وہ روتے رہیں اور تم ہنستے ہوئے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کے وقت بھی سب ہنسیں اور خوش ہوں کہ اچھا ہوا کمبخت کا پاپ کٹا اور تم اعمال سیئہ کی وجہ سے روتے ہوئے جاؤ تو اس مضمون میں بھی ویسا ہی مقابلہ ہے جیسا اوپر کے اشعار میں مقابلہ تھا کہ جس طرح تمہارے رونے پر لوگ ہنستے تھے

اب تم ان کے رونے پر ہنسو اور دنیا سے اس طرح جاؤ کہ آخرت کی راحتیں دیکھ کر
تم بے ساختہ یوں کہو یا لیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی وجعلنی من المکرمین
اے کاش میری قوم کو اطلاع ہو جائے کہ میرے خدا نے مجھے بخشدیا اور مجھ کو معززین
میں داخل کر دیا ہے تو اس اطلاع سے وہ رونے سے باز آجائیں۔ یہی مقابلہ کا مضمون
پہلے اشعار میں تھا کہ تم امراء وسلاطین کو دین میں نیچا دکھا دو۔ جبکہ انھوں نے
تم کو دنیا میں نیچا دکھایا ہے کیونکہ آجکل کے امراء حضرات صحابہؓ کی طرح تھوڑا ہی ہیں
جن کو نیچا دکھانا مشکل ہو۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تو یہ حالت تھی کہ غرباء
حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کرتے ہوئے آئے کہ یا رسول اللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم) مال دار لوگ ہم سے بڑھ گئے کیونکہ جس طرح نماز روزہ ذکر
و شغل ہم کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں اور ان میں یہ بات زیادہ ہے کہ وہ زکوٰۃ بھی
دیتے ہیں، خیرات و صدقات کرتے رہتے ہیں جہاد میں خوب مال خرچ کرتے
ہیں اور یہ کام ہم نہیں کر سکتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم
پانچوں نمازوں کے بعد سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر
پڑھا کرو اس کا تم کو اتنا ثواب ملے گا کہ مالداروں کے صدقات و خیرات سے بڑھ
جائے گا۔ مالدار صحابہؓ کو جو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے بھی یہ کام شروع
کر دیا۔ غرباء پھر شکایت لائے کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) امراء نے بھی
وہ تسبیحیں پڑھنا شروع کر دیں جو آپ نے ہم کو تعلیم فرمائی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا
کہ اب میں کیا کروں۔ میں خدا کے فضل کو کسی سے کیونکر روک دوں ذلک فضل
اللہ یوتیہ من یشاء۔ حضرات صحابہ میں جو لوگ مالدار تھے ان کی یہ حالت تھی کہ
وہ ہر وقت اپنے دین کی ترقی میں لگے رہتے تھے اور جو نیک کام ان کو معلوم ہوتا
اس کی طرف سبقت کرتے تھے ان کو دین میں نیچا دکھانا غرباء کو مشکل تھا۔ ان حضرات
کے پاس مال بہت کچھ تھا مگر حالت یہ تھی کہ دل کو اس سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا
ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا تو وہ رو رہے تھے۔ لوگوں نے اُن کو تسلی دی کہ

ماشاء اللہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فلاں فلاں غزوات میں شرکت کی اور خدا کے راستہ میں اسلام کی بہت سی خدمتیں کی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ تم کو حق تعالیٰ بخشدیں گے تم کیوں روتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں اس وجہ سے نہیں روتا بلکہ میں اس واسطے روتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہماری تنگدستی کی یہ حالت تھی کہ عثمان بن مظعون رض کا جب انتقال ہوا تو ان کے کفن کے لئے صرف ایک چھوٹا سا کمبل تھا جس کو سر کی طرف کھینچتے تو پیر کھل جاتے اور پیر کی طرف کھینچتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کمبل کو سر کی طرف کھینچ دیا جائے اور پیروں پر گھاس ڈال دی جاوے۔ اور آج ہمارے پاس اتنا مال ہے کہ سوائے مٹی کے اور کہیں اس کی جگہ نہیں۔ اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ سوائے زمین میں دفن کرنیکے اور کہیں اس کی جگہ نہیں دوسرے یہ کہ بجز عمارتوں میں خرچ کرنے کے اور کسی کام میں یہ روپیہ نہیں آتا تو وہ حضرات ایسے تھے کہ زیادہ مال جمع ہونے سے روتے تھے اس کی ان کو زیادہ خوشی نہ تھی۔ صاحبو! یہ وہ امرار تھے جن کی وجہ سے حضرات صوفیہ میں اختلاف ہوا ہے کہ صبر افضل ہے یا شکر افضل ہے۔ یعنی فقر و فاقہ پر صابر رہنا افضل ہے یا مال و دولت کے ساتھ شاکر رہنا افضل ہے تو صوفیہ کرام کے اس قول میں ایسے شاکر مراد ہیں جیسے حضرات صحابہ رض تھے نہ کہ ہم جیسے حرامخور جو خدا کی نعمتیں کھا کھا کر معاصی پر اور زیادہ دلیر ہو رہے ہیں اگر حضرات صوفیہ ہمارے زمانہ کے امرا کو دیکھ لیتے تو وہ یہی فرماتے کہ صابر افضل ہے شاکر سے (الا ما شاء اللہ ۱۲) پس آجکل کے امرا کو دین میں نیچا دکھا دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے پھر تعجب ہے کہ ہم کو اس بات پر غیرت نہ آئی کہ ہم دنیا میں تو امرار سے کم رہے دین میں بھی ان سے بڑھے ہوئے نہ رہیں بالخصوص اہل علم کو تو یہ غیرت ضرور ہونی چاہیئے۔ پس ان کو لازم ہے کہ جس طرح اہل دنیا کسی وقت ترقیٔ دنیا سے نہیں تھکتے وہ بھی ترقی دین سے نہ تھکیں اور دین میں کمال حاصل کرتے رہیں جس کا ادنیٰ ایک آسان طریقہ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں جس کو میں نے تلاوت کیا ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو۔ اس میں اول تقویٰ کا امر ہے یہ بات تو اوپر ثابت ہو چکی کہ ہر مقصود میں درجۂ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے اب یہ بات ثابت کرنا ہے کہ تقویٰ کمال دین ہے یا نہیں۔ نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا تقویٰ کا امر اور فضل قرآن میں جس قدر ہے غالباً کسی چیز کا اتنا نہیں اس سے اس کا عظیم بالشان ہونا معلوم ہوا۔ اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تقوے کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے، ایک ڈرنا دوسرے بچنا۔ اور تامل کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو بچنا ہی ہے یعنی معاصی سے مگر سبب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے جبھی اس سے بچا جاتا۔ تقویٰ کا معنی اول میں استعمال الا ان تتقوا منہم تقاۃ۔ میں ہے اور بچنے کے معنی میں استعمال نصوص کثیرہ میں اور اس حدیث میں معلوم ہوتا ہے اتقوا النار ولو بشق تمرۃ۔ بچو جہنم سے اگرچہ ایک ٹکڑا چھوارے کا دے کر یہاں بچنے ہی کے معنی بن سکتے ہیں ڈرنے کے معنی نہیں بن سکتے غرض استعمال دونوں معنی میں وارد ہے لیکن اصل مقصود احتراز عن المعاصی ہے اور خوف علی الاطلاق مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ ذریعہ اور سبب ہے احتراز عن المعاصی کا جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے واسئلک من خشیتک ما تحول بہ بیننا وبین معاصیک اے اللہ میں آپ سے آپ کا اتنا خوف مانگتا ہوں جس سے مجھ میں اور معاصی کے درمیان میں آڑ ہو جاوے اس سے معلوم ہوا کہ خوف علی الاطلاق مقصود نہیں کیونکہ مقاصد کا ہر درجہ مطلوب ہوتا ہے کوئی درجہ غیر مقصود نہیں ہوتا اور حدیث کی اس قید سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف ایک خاص حد تک مطلوب ہے اس سے آگے مطلوب نہیں وہ خاص حد یہ ہے کہ جس سے معاصی میں رکاوٹ ہو جاوے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ما تحول بہ بیننا وبین معاصیک کی قید

بڑھاکرایک ایسی بات بتلائی ہے جو سالکین کو سالہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتی ہے مگر آپ نے دو لفظوں میں اس کو حل فرما دیا وہ بات یہ ہے کہ بظاہر یہ بات سمجھ میں آیا کرتی ہے کہ خدا کا خوف تو اچھی چیز ہے پس وہ جتنا بھی زیادہ ہو اچھا ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس کا حد سے بڑھ جانا مضر ہو جاتا ہے اول تو زیادت خوف سے صحت خراب ہو جاتی ہے ہر وقت انسان رنج وغم ہی میں رہتا ہے اور صحت کے اختلال سے اعمال میں کوتاہی ہونے لگتی ہے دوسرے صاحب خوف کو دیکھ کر دوسرے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں کہ بس صاحب خدا کو راضی کرنا بڑا مشکل ہے ہر وقت رنج وغم میں گھلتا پڑتا ہے۔ تیسرے جب خوف کا غلبہ حد سے زیادہ ہوتا ہے تو یہ شخص رحمت الٰہی سے مایوس ہو جاتا ہے یاس تک نوبت پہنچ جاتی ہے جو کہ کفر ہے اور مایوس ہونے سے وہ بالکل معطل و بیکار ہو جاتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ جب میرے کئے کچھ نہیں ہوسکتا اور میں رحمت حق کے قابل ہی نہیں ہوں تو پھر اس ساری محنت سے کیا فائدہ بس سب کام چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو غلبہ خوف سے یہ باتیں پیش آیا کرتی ہیں اس وقت سالک کو معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا ہر درجہ مطلوب نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دو لفظوں میں اس حقیقت پر متنبہ کر دیا جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اصل مقصود تقویٰ بمعنی احتراز عن المعاصی ہے اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا کمال دین ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس میں ادائے فرائض وواجبات واجتناب عن المحرمات سب داخل ہیں کوئی مقصود شرعی اس سے خارج نہیں مطلب یہ ہوا کہ نماز بھی پڑھو کیونکہ ترک صلوٰۃ معصیت ہے، زکوٰۃ بھی دو کیونکہ ترک زکوٰۃ معصیت ہے اسی طرح تمام مامورات کا چھوڑنا معصیت ہے تو اس میں مامورات کے ادا کا حکم بھی ہے اور محرمات کے ترک کا بھی اور کمال دین کے یہی دو اجزاء ہیں تو تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل ایک اور ہے جس سے تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہے وہ

یہ کہ حدیث میں ہے الا ان التقوی وجہنا واشار الی صدرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ سن لو تقویٰ یہاں ہے یعنی تقوی کا محل قلب ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اس کے ساتھ دوسری حدیث کو ملائیے الا ان فی الجسد مضغۃً اذا صلحت صلح الجسدُ کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب یعنی جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوجاتا ہے تو تمام بدن درست ہوجاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ قلب ہے۔ اس حدیث سے اصلاح قلب کا صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہے اور پہلی حدیث سے یہ معلوم ہوچکا کہ تقوی کا اصل محل اور موصوف قلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تقویٰ سے اول اصلاح قلب کی ہوتی ہے تو ان دونوں مقدموں سے تقویٰ کا مستلزم صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہوگیا اور صلاحیت کاملہ یہی کمال دین ہے پس یہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ تقویٰ کمال دین ہے اور رقلب کو محل تقویٰ اس حدیث میں اس لئے فرمایا کہ تقویٰ بمعنی الاجتناب عن المعصیۃ کا سبب خوف خداوندی ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کا اصلی محل قلب ہے ۱۲ جامع) یہاں تک تو جملہ اولیٰ کے متعلق کلام تھا دوسرے جملہ کی بابت میں۔ ؎ یہ کہا تھا کہ کونوا مع الصادقین۔ بیان ہے مقصود مذکور کے طریق کا کہ حاصل اس کا معیت مع المتقین ہے پس صادقین

؎ اس حدیث سے بعض جاہل صوفیوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس اصل مقصود اصلاح قلب ہے اعمال ظاہرہ کی کچھ ضرورت نہیں یہ بالکل غلط اور صریح زندقہ ہے اور اس کا غلط ہونا خود اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ جب دل صالح ہوتا ہے تو تمام بدن صالح ہوجاتا ہے اور جب دل بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ظاہرہ صلاحیت قلب و فساد قلب کی دلیل ہیں پس جس شخص سے اعمال صالحہ صادر ہوں یہ اسکے قلب کے صلاحیت کی دلیل ہے اور جس سے اعمال سیئہ صادر ہوں یہ اس کے قلب کے فساد کی دلیل ہے پس صلاحیت قلب کے بعد اعمال صالحہ کا ترک ممکن نہیں اور جو شخص اعمال صالحہ کو ترک کرکے صلاحیت قلب کا دعوی کرتا ہے وہ جھوٹا ہے پس یہ مسلم کہ اصل مقصود اصلاح قلب ہے مگر وہ اعمال صالحہ کی مداومت اور اعمال سیئہ سے اجتناب سے منفک نہیں ہوسکتی ہے لہذا اعمال ظاہرہ ہرگز بے کار نہیں فافہم ۱۲ جامع۔

اسی کا ایک عنوان ہے اور متقی کے معنی کاملین فی الدین ثابت ہو چکے ہیں پس صادقین کے بھی وہی معنی ہوں گے یعنی کمال فی الدین کا لائق کاملین فی الدین کی معیت ہے پس کونوا مع الصادقین کی توجیہ کونوا مع الکاملین ہوئی ہے کیونکہ صادقین سے معنی مشہور صادقین فی القول مراد نہیں بلکہ راسخ فی الدین مراد ہیں جیسے ہمارے محاورہ میں بھی پکے آدمی کو سچا کہتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو صدیق فرمایا ہے واذکر فی الکتاب ابراھیم انہ کان صدیقاً نبیا اور اسی صدیقیت کا درجہ بعد نبوۃ کے ہے پھر شہدا و صالحین کا درجہ چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اسی ترتیب سے ان درجات کو بیان فرمایا ہے فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا اور رسوخ فی الدین بھی کمال فی الدین ہے پس مع الصادقین کی توجیہ مع الکاملین ثابت ہوگئی۔ نیز اس کی دلیل ایک اور آیت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لیس البر ان تولوا وجوھکم بلکہ یہ آیت اتفاق سے میرے دونوں دعووں کو ثابت کر رہی ہے یعنی اس سے تقویٰ اور صدق دونوں کے معنی کمال دین ہونا ثابت ہو رہا ہے پوری آیت اس طرح ہے لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملئکۃ والکتاب والنبیین ط واٰتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسّائلین وفی الرقاب ط واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباساء والضّراء وحین الباس ط اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون ط

ترجمہ:۔ کچھ ساری خوبی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف لیکن (اصلی) خوبی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی (ذات و صفات) پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور مال دیتا ہو

اللہ کی محبت میں (اپنے حاجتمند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو اور دوسرے غریب محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کرلیں اور وہ لوگ مستقل مزاج رہنے والے ہوں تنگدستی میں اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آگیا ہے دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا پس یہ اوصاف کمال دین کو متضمن ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان اوصاف سے متصف ہیں وہی صادق اور وہی متقین ہیں اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت کمال دین ہونا ثابت ہوگیا۔ رہا یہ کہ آیا اس آیت میں تمام اجزاء دین کا ذکر آگیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں کل احکام کا ماحصل تین چیزیں ہیں عقائد، اعمال، اخلاق اور تمام جزئیات انہی کلیات کے تحت میں داخل ہیں اور اس آیت میں اقسام ثلثہ کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں اس اعتبار سے یہ آیت منجملہ جوامع کلم کے ہے [illegible] فرماتے ہیں لیس البر ان تولوا وجوھکم [illegible] کے لئے [illegible] کے ہیں اور لام عہد ہے معنی یہ ہوئے لیس البر الکافی ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب۔ یعنی مشرق و مغرب کی طرف نماز میں منہ کرلینا ہی کافی نہیں ہے کہ اسی پر قناعت کرلی جائے اس توجیہ سے یہ اشکال رفع ہوگیا کہ استقبال قبلہ بھی تو مامور بہ شرعاً ہے اور مامور بہ شرعی کا بر ہونا لازم ہے پھر اس کی نسبت لیس البر کیوں فرمایا اس اشکال کے جواب لوگوں نے مختلف وجوہ سے دیئے ہیں لیکن جو توجیہ میں نے بیان کی ہے یہ بہت آسان ہے اور یہ توجیہ اسی وقت سمجھ میں آئی ہے۔ حاصل

اس کا یہ ہے کہ اس میں استفہام سے مطلق خیریت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ اس کے بِر کافی ہونے کی نفی ہونے کی مراد ہے رہا یہ کہ اس مضمون کی اس جگہ ضرورت کیا تھی استقبالِ مشرق و مغرب سے بِرّ کافی کی نفی کیوں کی گئی سو بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تحویلِ قبلہ کا مسئلہ مذکور ہوا ہے جس میں کفار و مشرکین نے بہت شور و غل کیا تھا اور اس وقت ان کی تمام تر بحث اسی میں رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کا بھی عجیب دین ہے کبھی کسی طرف منہ کرتے ہیں کبھی کسی طرف تو حق تعالیٰ ان کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ تم تو اس بحث میں ایسے پڑ گئے کہ گویا مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا کوئی بڑا مقصود ہے حالانکہ یہ مقصود نہیں بلکہ شرائط و وسائل مقصود میں سے ہے پس یہ حماقت ہے کہ مقاصد کو چھوڑ کر غیر مقاصد کی بحث پر اکتفا کر لیا جاوے مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا یہ بِرّ کافی نہیں بلکہ بِرّ کافی وہ ہے جس کا آگے بیان آتا ہے اس کا اہتمام کرو۔ اور مشرق و مغرب کی تخصیص ذکر میں ایک نکتہ کی وجہ سے ہے اس سے قبلہ کا مشرق و مغرب میں منحصر کرنا مقصود نہیں کیونکہ جن لوگوں سے مکہ معظمہ کا رُخ جانب شمال میں ہے ان کا قبلہ شمال ہے اور جس جگہ سے مکّہ کا رخ جنوب میں ہے اس جگہ کا قبلہ سمت جنوب ہے۔ چنانچہ مدینہ والوں کا قبلہ جنوب ہے۔ اسی لئے حدیث میں اہلِ مدینہ کو فرمایا گیا ہے ولکن شرقوا او غربوا۔ کہ استنجا کے وقت تم لوگ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کیا کرو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قبلہ مشرق و مغرب میں منحصر نہیں۔ پس اس جگہ مشرق و مغرب کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے کہ تمام جہات میں سے یہی دونوں جہتیں عرفاً زیادہ مشہور ہیں۔ جب ان کا غیر مقصود ہونا بیان کر دیا تو دوسری جہات کا مقصود نہ ہونا بھی اس سے واضح ہو گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی جہت میں امتیاز بوجہ تقابل حسّی کے زیادہ محسوس ہے پس اولاً و بالذّات انہی دو جہالت کا علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری جہات کا علم ان کے واسطے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی جہت کا سمجھنا شمال و جنوب کے جاننے پر موقوف نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مشرق وہ جہت ہے

جدھر سے آفتاب نکلتا ہے اور مغرب وہ ہے جدھر آفتاب ڈوبتا ہے اور شمال و جنوب کی معرفت بدون مشرق و مغرب کے نہیں ہو سکتی چنانچہ شمال و جنوب کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ مشرق کی طرف منھ کر کے کھڑے ہونے سے داہنے ہاتھ کی سمت جنوب ہے اور بائیں ہاتھ کی سمت شمال ہے۔ پس یہ دونوں جہتیں اصل ہوئیں اور جنوب و شمال ان کی فرع ہیں اور ظاہر ہے کہ اصل کے غیر مقصود ہونے سے فرع کا غیر مقصود ہونا خود ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ شریعت میں قلیل انحراف مفسد صلوٰۃ نہیں تو مشرق و مغرب جن کا قبلہ ہے وہ اگر قدرے شمال و جنوب کی طرف مائل ہو جاویں نماز فاسد نہ ہوگی اس طرح گویا مشرق و مغرب میں شمال و جنوب بھی آگئے۔ پس مطلب صرف یہ ہے کہ کسی جہت کی طرف بھی منھ کرنا بِرّ کافی نہیں بلکہ بِرّ کافی وہ ہے جس کا آگے ذکر ہے وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ الخ یہاں دونوں جہتیں جائز ہیں ایک یہ کہ مسند الیہ کی جانب میں مضاف کو مقدّر کیا جائے ولکن ذا البِرِّ من اٰمن باللّٰہِ الخ ایک یہ کہ مسند کی طرف مضاف مقدر مانا جاوے یعنی ولکن البِرِ بِرُّ من اٰمن باللّٰہ الخ۔ اور حاصل دونوں کا ایک ہے خواہ یہ کہا جائے کہ بھلائی کافی اس شخص کی بھلائی ہے یا کافی بھلائی والا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ذات و صفات کے متعلق جس قدر احکام ہیں سب آگئے اور قیامت کے دن پر ایمان لانے میں جزا و سزا و حساب و کتاب و جنت و دوزخ وغیرہ کے سب احکام آگئے وَالْمَلٰٓئِکَۃِ اور فرشتوں پر ایمان لائے یعنی اُن کے وجود کا قائل ہو اس میں تمام غیبیات داخل ہیں اور فرشتوں کی تخصیص اسی لئے کی گئی ہے کہ شریعت کے معلوم ہونے کا مدار و واسطہ ملائکہ ہی ہیں وَالْکِتٰبِ اور کتاب پر ایمان لائے یہاں کتاب بصیغۂ مفرد لایا گیا ہے۔ حالانکہ کتب سماویہ متعدد ہیں اور ایمان لانا سب پر واجب ہے گو عمل منسوخ پر جائز نہیں ۱۲ اور اسی وجہ سے دوسری آیتوں میں صیغۂ جمع اختیار کیا گیا ہے کل اٰمن باللّٰہ

وملائکتہ وکتبہ ورسلہ الخ لیکن یہاں صیغۂ مفرد اختیار کرنے میں اشارہ ہے ایک امر کی طرف وہ یہ کہ قرآن ایسا جامع ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ پر حاوی ہے اسی لئے اس پر ایمان لانا گویا سب پر ایمان لانا ہے۔ یا یہ کہا جاوے کہ کتب سماویہ میں سے ہر کتاب دوسری کتاب پر ایمان لانے کا امر کرتی ہے پس وہ سب مل کر بمنزلۂ کتاب واحد کے ہیں ان سب پر ایمان لانا بمنزلۂ کتاب واحد پر ایمان لانے کے ہے (اور جو شخص ایک کتاب کو مان کر دوسری کا انکار کرے وہ حقیقت میں پہلی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتا) لیکن یہ حکم ایمان کا ہے اور عمل کرنا سب کتابوں پر جائز نہیں بلکہ عمل صرف موخر پر ہوگا کیونکہ وہ مقدم کے لئے ناسخ ہے والنّبیین اور پیغمبروں پر ایمان لائے یہاں تک تو امہات عقائد مذکور ہیں آگے اخلاق واعمال کا ذکر ہے۔ اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں طاعات۔ دیانات دوسرے معاملات (معاملات کی پھر دو قسمیں ہیں ایک متعلق اموال کے دوسرے متعلق غیر اموال کے جو معاملات متعلق غیر اموال کے ہیں ان میں نکاح وطلاق وعتاق وحدود وغیرہ داخل ہیں) اور دیانات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک طاعات بدنیہ دوسرے طاعات مالیہ اسی طرح اخلاق کی دو قسمیں ہیں حسنہ وسیئہ۔ اخلاق حسنہ کے ساتھ موصوف ہونا مقصود شرعی ہے اور اخلاق سیئہ سے خالی ومنزہ ہونا مطلوب ہے۔ عقائد سے آگے ان سب کے اصول مذکور ہیں جن میں طاعات مالیہ کا ذکر مقدم کیا گیا کیونکہ بہت لوگ طاعات بدنیہ میں ہمت والے ہوتے ہیں اور طاعات مالیہ میں ان کا یہ حال ہوتا ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی سخن دریں است

(اگر جان طلب کرلے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر مال طلب کریگا تو اس میں مجھے اعتراض ہوگا۔)

چنانچہ ارشاد ہے وآتی المال علی حبہ۔ اور دیتا ہو مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو علیٰ حُبّہٖ کی ضمیر اگر اللہ کی طرف راجع ہو جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو اس میں علم

اخلاق کا بھی ایک اصل عظیم مذکور ہوگا یعنی مال خدا کے راستہ میں محبت الٰہی کی وجہ سے دینا چاہیئے اس میں ایک تو محبت الٰہی کے حاصل کرنے کی تعلیم ہوئی کہ خدا سے محبت پیدا کرنی چاہیئے محض ضابطہ کا تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ دوسرے اخلاص کی تعلیم اور ریا و ناموری کی ممانعت ظاہر ہوئی کہ مال خرچ کرنے میں کسی کی مدح و ثنا یا شکریہ وغیرہ کا منتظر نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہونا چاہیئے اور اخلاص بھی اخلاق باطنیہ کا ایک بڑا رکن ہے اور اگر مرجع ضمیر مال ہے تو معنی یہ ہونگے کہ ایسا مال جس سے محبت ہو اور دل کو تعلق ہو خدا کے لئے خرچ کردے اس میں ایک تو خرچ کرنے کا ادب مذکور ہوا کہ راستہ کے واسطے عمدہ مال خرچ کرنا چاہیئے ردی مال نہ دینا چاہیئے دوسرے علم سلوک کا یہ مسئلہ بھی اشارۃً مذکور ہوا کہ محبت مال جو کہ خلق ذمیم ہے اس کا علاج یہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کردے دو چار بار ایسا کرنے سے حب مال کا مرض جاتا رہے گا ذوی القربیٰ میں تمام قرابت دار داخل ہیں بیوی بچے بھی ان میں آگئے جن کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے اور دوسرے غریب رشتہ دار بھی آگئے جن کو کچھ دیتے رہنا اور ان کا خیال رکھنا مستحب ہے والیتمٰی والمسٰکین وابن السبیل اور یتیموں کو بھی دے اور مسکینوں کو بھی دے اور مسافروں کو بھی یہ سب صدقات نافلہ کیونکہ زکوٰۃ کا بیان آگے آرہا ہے۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ طاعات مالیہ کا ذکر طاعات بدنیہ سے کیوں مقدم ہوا اس کا جواب تو میں نے دیدیا کہ بعض طبائع میں بخل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ طاعات بدنیہ کی ہمت خوب کرلیتے ہیں اور مال دینے سے جان چراتے ہیں اس لئے طاعات مالیہ کو اہتماماً مقدم کردیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ طاعات مالیہ میں سے صدقۂ نافلہ کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ پر کیوں مقدم کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے ایسا ضابطہ کا تعلق رکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مفروضہ کے علاوہ اور کچھ خیرات نہیں کرتے اس میں گناہ نہیں مگر ضعف تعلق مع الحق کی دلیل ضرور ہے اس لئے حق تعالیٰ نے صدقات نافلہ کو زکوٰۃ سے مقدم فرمایا جس سے اس طرف

اشارہ کر دیا کہ زکوٰۃ واجب ہے وہ تو تم ادا کرو ہی گے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ صدقہ خیرات موقع بموقع کرتے رہنا چاہیئے۔ دیکھئے اگر کوئی محبوب یا کوئی بادشاہ ہم سے یہ کہے کہ اس موقع میں تم دو روپیہ خرچ کر دو تو غور کیجئے اس وقت ہمارے دل کی کیا حالت ہو گی کیا ہم صرف دو روپیہ ہی پر اکتفا کریں گے ہرگز نہیں بلکہ محبوب کو خوش کرنے یا بادشاہ کی نگاہ میں جاں نثار بننے کے لئے ہم دو کی جگہ دس خرچ کریں گے ورنہ چار تو دے ہی ڈالیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے ضابطہ کا تعلق نہ رکھنا چاہیئے۔ اس نکتہ کی وجہ سے صدقات نافلہ کو صدقہ مفروضہ مالیہ سے مقدم کیا بلکہ طاعت بدنیہ یعنی صلوٰۃ سے بھی مقدم کر دیا لیکن بعد میں جب زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو نماز کو اس سے مقدم کیا تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ رتبہ کے اعتبار سے نماز ہی مقدم ہے چنانچہ دیکھ لو ہم نے زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا ہے اور جن صدقات مالیہ کو نماز اور زکوٰۃ سے پہلے بیان کیا ہے وہاں تقدیم کی وجہ محض اہتمام بالشان ہے نہ کہ رتبہ کا زیادہ ہونا۔ رتبہ نماز کا طاعات مالیہ سے بڑھا ہوا ہے اور زکوٰۃ کا رتبہ صدقات نافلہ سے بڑھا ہوا ہے سبحان اللہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ہر چیز کے درجہ کا کتنا لحاظ ہے۔ یہی تو باتیں ہیں جن کی وجہ سے بشر کی عقل اس کلام کو دیکھ کر چکراتی ہے کہ اتنی رعایتیں انسان ہرگز نہیں کر سکتا۔ والسائلین وفی الرقاب اور مانگنے والوں کو بھی دے اور گردن چھڑانے میں بھی۔ یہ بھی صدقات نافلہ کی ایک فرد ہے اس میں اس قدر تفصیل ضروری ہے کہ دیگر نصوص شرعیہ سے سائلین کا لفظ ان سوال کرنے والوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرتے ہوں جن کا پیشہ سوال نہ ہو گیا ہو اور جو لوگ مضبوط ہٹے کٹے سوال کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں ان کو دینا جائز نہیں نہ ان کو سوال کرنا جائز ہے۔ اس مسئلہ پر اس زمانہ میں سب سے پہلے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تنبیہ فرمائی۔ ایک دن فرمایا کہ ایک مسئلہ بتلاتا ہوں گالیاں تو بہت پڑیں گی چنانچہ واقعی جب اس مسئلہ کی شہرت ہوئی تو لوگوں نے بہت اعتراضات کئے اور برا بھلا کہا کوئی یہ کہتا تھا کہ

پس اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فقیر کو کچھ مت دو مجھے دے جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ بس یہی تو ایک نئے مولوی پیدا ہوئے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی ان سوال کرنے والوں کو دینا حرام نہیں بتلایا۔ مگر مولانا تو شریعت الٰہیہ کے عاقل تھے اور عاشق کو گالیوں کی پرواہ نہیں ہوا کرتی کسی نے خوب کہا ہے ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقل والوں کے نزدیک اس میں بدنامی و اعتراض ہے لیکن
میں اتباع اور اطاعت کی بدنامی سے خوش ہوں ہم ایسی نیک نامی سے
باز آئے جو نافرمانی سے تعلق رکھے۔)

اور اسی معنی میں ایک شعر اردو کا ہے مگر ذرا شاعریت سے گرا ہوا ہے اور نہ معلوم یہ کیا بات ہے کہ اردو کے اشعار فارسی اشعار کے سامنے پھیکے ہوتے ہیں مگر خیر مضمون کے موافق کی وجہ سے پڑھے دیتا ہوں ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا
اور جو خود ناکام ہو اسکو کسی سے کام کیا

ناکامی کا مطلب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھو۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ بھائی جو بامراد ہونا چاہے وہ کسی اور بزرگ کے یہاں جائے اور جو نامرادی چاہے وہ ہمارے پاس چلا آوے۔ پھر چپکے سے فرمایا کہ جانتے ہو نامرادی کے کیا معنی ہیں اس کے معنی ہیں عشق۔ کیونکہ عاشق بوجہ طلب اور اشتیاق کے غلبہ کے ہر جگہ اپنے آپ کو ناکام اور بے مراد ہی سمجھتا ہے وہ کسی حالت یا کسی مقام پر قناعت نہیں کرتا ہر وقت آگے کی طلب رہتی ہے اسی لئے وہ ہمیشہ ناکام رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ چشتیہ میں بعد تمکین کے بھی سوز و گداز رہتا ہے مگر یہ دنیا ہی میں ہے کیونکہ یہاں وصال کامل نہیں ہو سکتا جس سے تسلی ہو جائے لیکن آخرت میں تسلی ہو جاوے گی۔

ایک صاحبِ حال صوفی کا قول مشہور ہے ان فی الجنان جنۃ لیس فیہا حُورٌ ولا قصور ولکن فیہا ارنی ارنی یعنی ایک جنت ایسی بھی ہے جس میں نہ حوریں ہیں نہ محلات ہیں بس وہاں جو لوگ رہیں گے ان کی یہ حالت ہوگی کہ وہ ہر وقت حق تعالےٰ سے عرض کرتے رہیں گے کہ اپنے کو دکھلا دیجئے اپنے کو دکھلا دیجئے بعض لوگ اس کو حدیث سمجھتے ہیں یہ غلط ہے بلکہ ایک صوفی کا قول ہے اور قول بھی غلط میرے نزدیک اس صوفی نے جنت کو دنیا پر قیاس کیا ہے حالانکہ جنت میں حسب استعداد وصال کامل نصیب ہو جائے گا جس سے پوری تسلی ہو جائے گی اور کسی قسم کی خلش باقی نہ رہے گی جس کی دلیل یہ ہے کہ نصوص قرآنیہ سے جنت میں ہر قسم کی کلفت اور خلش کی نفی صراحۃً معلوم ہو چکی ہے اور یقیناً اگر یہ خلش وہاں بھی رہی تو اس سے بڑھ کر کوئی خلش نہ ہوگی عشاق تو آخرت ہی کی امید پر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اگر وہاں بھی تسلی کامل نہ ہوئی تو بڑی حسرت کی بات ہے اور نصوص سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جنت میں کوئی حسرت باقی نہ رہے گی۔ ولکم فیہا ما تشتہی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون ۵ اور دنیا میں سکون کامل اور پوری تسلی اسلیئے نہیں ہو سکتی کہ یہاں وصال کامل عادۃً ممتنع ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہمارے قومی وصال کامل کے متحمل نہیں اور جنت میں تحمل عطا ہو جائے گا اور اہل نسبت کو جو دنیا میں وصال نصیب ہوتا ہے اس کو حالت تلوین کی اضافت سے وصال کہدیا جاتا ہے ورنہ حقیقی وصال کے سامنے وہ بھی کچھ نہیں بس ایک قسم کا حضور حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی کسی وقت ہوتا ہے کسی وقت نہیں بھی ہوتا اس لئے عارف شیرازی فرماتے ہیں

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو
یعنی طمع مدار وصالِ دوام را

(بزم قرب میں دو یا ایک جام پی اور راستہ لے یعنی دائمی وصال کی طمع مت رکھ)

اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ولکن یا حنظلہ ساعۃ ساعۃ یعنی ساعۃ کذا وساعۃ کذا غرض یہ کہہ رہا تھا کہ عاشق کو بدنامی اور

ذلت اور گالیوں کی پرواہ نہیں ہوا کرتی چنانچہ مولانا گنگوہی رحمہ نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ فقہاء نے بھی صراحۃً فرمایا ہے کہ یہ لوگ جو گلی کوچوں میں سوال کرتے پھرتے ہیں جنھوں نے سوال کو پیشہ بنا لیا ہے ان کو سوال کرنا حرام ہے اور چونکہ ان کا سوال پورا کر دینے سے ان کو آئندہ کے لئے سوال پر جرأت ہوتی ہے اس لئے ان کو کچھ دینا سوال حرام پر اعانت کرنا ہے اور اعانت علی الحرام حرام ہے۔ اس لئے ہٹے کٹے لوگوں کو سوال کرنا بھی حرام اور ان کو دینا بھی حرام خوب سمجھ لو۔ وفی الرقاب اور گردن چھڑانے میں۔ یہ قیدیوں اور غلاموں کے متعلق ہے اور اسی کے حکم میں یہ صورت بھی ہے کہ جو شخص قرض کے اندر بندھا ہوا ہو اس کی اعانت کر دی جائے کہ یہ بھی گردن چھڑانے میں داخل ہے واقام الصلوٰۃ وآتی الزکوٰۃ اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ یہاں زکوٰۃ کو نماز سے اصل کے مطابق مؤخر کر دیا جس کا نکتہ اوپر مذکور ہو چکا ہے یہاں تک طاعات بدنیہ و طاعات مالیہ کے اصول عظام مذکور ہوئے آگے حقوق العباد کا بیان ہے۔ والموفون بعہدہم اذا عاہدوا۔ اور وہ لوگ عہد کو پورا کرنے والے ہیں جب عہد کر لیتے ہیں۔ ہر چند کہ حقوق العباد میں بعض حقوق ایسے ہیں جو ایفاء عہد سے مقدم ہیں مثلاً قرض کا ادا کر دینا امانت میں خیانت نہ کرنا لیکن اس جگہ حق تعالیٰ نے صرف ایفائے عہد کو بیان فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ لوگ ایسے حقوق العباد کو ادا کرتے ہیں جن کا مطالبہ کرنے والا ان سے کوئی بھی نہیں (کیونکہ ایفاء عہد قضاءً لازم نہیں گو دیانۃً بعض کے نزدیک واجب ہے ۱۲) تو اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہو گئی کہ جن حقوق کا مطالبہ کرنے والا موجود ہو ان کو تو ضرور ادا کریں گے اور اسی نکتہ کی وجہ سے مواریث میں وصیت کو دین پر مقدم فرمایا ہے اس سے حقوق العباد کا درجہ معلوم ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو

ان حقوق کا بھی اہتمام ہے جس کا مطالبہ کوئی نہ ہو تو جن حقوق کا مطالبہ بھی موجود ہو وہ تو کس قدر قابل اہتمام ہوں گے اور یہاں بطور مثال کے بعض حقوق کا ذکر فرمایا گیا ورنہ حقوق العباد اور بھی ہیں اگرچہ لوگ فقط مال کو حق العباد سمجھتے ہیں مگر ایک حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق العباد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ حقوق العباد کے اقسام اور بھی ہیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو خطبہ پڑھا ہے اس میں آپؐ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا ایت یوم ھذا یہ کون سا دن ہے قالوا اللہ ورسولہ اعلم۔ صحابہ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا الیس یوم النحر کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے قالوا بلی صحابہؓ نے عرض کیا بیشک اس سے صحابہ کا غایت ادب معلوم ہوا کہ جس بات کو وہ جانتے بھی تھے اس کو بھی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیتے تھے اپنی شان علم ظاہر نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ مقام کونسا ہے پھر اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے صحابہ نے عرض کیا بیشک پھر آپؐ نے مہینہ کی بابت سوال کیا اور اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے صحابہؓ نے عرض کیا بیشک۔ پھر آپؐ نے فرمایا فان اموالکم ودماءکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شہرکم ھذا فی بلدکم ھذا۔ کہ تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آپس میں تم پر ہمیشہ کے لئے ایسی ہی حرام ہیں جیسے اس مہینہ میں اس مقام میں اس دن میں حرام ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ایک قسم حقوق العباد کی جان کو تکلیف پہنچانا ہے مثلاً ناحق مارنا جس میں اہل حکومت اور معلمین بکثرت مبتلا ہیں اور ایک قسم حقوق العباد کی کسی کی آبرو کو صدمہ پہنچانا بھی ہے۔ یعنی کسی کی تحقیر کرنا کسی پر لعن طعن کرنا کسی پر بے وجہ بدگمانی کرنا یہ سب حرام ہے۔ اسی طرح کسی کی غیبت کرنا بھی ناجائز ہے بلکہ بعض نصوص سے حقوق آبرو کا درجہ زنا وغیرہ سے بھی

بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ بالخصوص آبرو کے حقوق کی ذرا پرواہ نہیں ایسے لوگ بکثرت ہیں جو کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے۔ حقوق مالیہ میں فروگذاشت نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا متقی سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کا حق نہیں رکھتے مگر آبرو کے حقوق میں وہ بھی مبتلا ہیں۔ ہماری کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی عوام کی تو کیا شکایت علماء کی مجالس بھی غیبت سے خالی نہیں اور سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ مشائخ کی مجالس بھی اس سے خالی نہیں عوام تو عوام ہی کی غیبت کرتے ہیں جن میں اکثر فساق بھی ہوتے ہیں جن کی آبرو کا زیادہ حق بھی نہیں لیکن علماء جب غیبت کریں گے تو وہ عوام کی نہ کریں گے بلکہ علماء کی غیبت کریں گے اور مشائخ ہمیشہ مشائخ کی غیبت کریں گے کیوں تاکہ یہ ہم سے بڑھ نہ جائیں۔ لوگ ہم سے زیادہ ان کے معتقد نہ ہوجائیں اسی لئے اکثر علماء و مشائخ کی مجلیس علماء و مشائخ کی غیبت سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ مقبولان الٰہی و اولیاء اللہ کی غیبت کرتے ہیں تو اس بارہ میں یہ عوام سے بڑھے ہوئے ہیں۔
یاد رکھو یہ باتیں معمولی نہیں ہیں لوگ اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں حالانکہ یہ باتیں سارے نماز روزے کو لے ڈوبیں گی جس کی تم نے آبرو ریزی کی ہوگی قیامت میں اس کو تمہاری نیکیاں دلوائی جائیں گی اس لئے نماز روزہ سے زیادہ حقوق آبرو کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ ایک بات اور یاد آئی وہ یہ کہ مال اور جان کا حق تو مرنے پر ختم ہوجاتا ہے اور آبرو کا حق بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے اگر بعد مرنے کے کسی کو مارو تو اس کو اس کا احساس نہیں ہوتا اس لئے ضرب کا قصاص بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح مرنے کے بعد کسی کا مال چراؤ تو وہ مال اس کا نہیں رہا ورثہ کا ہوگیا ہے لیکن مرنے کے بعد کسی کو متہم کرو اور اس کو برا بھلا کہو تو غیبت کا گناہ اس وقت بھی ہوگا اور اب اس کا کفارہ یہ ہے کہ میت کے لئے بکثرت دعا و استغفار کرو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس کو تم سے راضی کردیں گے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مرنے کے بعد ضرب کا احساس نہیں ہوتا شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

کسرُ عظمِ المؤمن میتاً ککسرہٖ حیًّا (مسلمان کی ہڈی کو مرنے کے بعد توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا) اس کا مطلب یہ نہیں کہ تشبیہہ من کل الوجوہ ہے جس سے میت کو بعد موت کے زندہ کی برابر احساس ہونے کا شبہ کیا جاوے اگر ایسا ہوتا تو شرعاً اس شخص سے قصاص لیا جاتا بلکہ یہ تشبیہہ بعض وجوہ میں ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض موت کے بھی روح کو کسی قدر تعلق جسم سے رہتا ہے اور وہ ایسا تعلق ہوتا ہے جیسا کہ اس وقت ہمارے جسم کو لباس سے تعلق ہے پس اگر کوئی ہمارا اترا ہوا کرتہ پھاڑ دے تو ہم کو کلفت ہوتی ہے اسی طرح روح کو موت کے بعد ہڈی توڑنے سے ایسی ہی کلفت ہوتی ہے۔ نیز اس تعلق کا یہ اثر بھی ہے کہ قبر کے پاس جاکر سلام و دعا جو کچھ کی جاتی ہے مردہ اس کو سنتا ہے اور شہداء میں یہ تعلق عام مومنین سے زیادہ ہوتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ان کا جسم بعد موت کے سالم رہتا ہے زمین اس کو کھا نہیں سکتی نیز اس تعلق سے بعض اولیاء کو مرنے کے بعد قوت تصرف بھی عطا ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان کے مزاروں پر جاکر ان سے مرادیں مانگا کریں کہ شرعاً یہ بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں کہ ان کے وسیلہ سے حق تعالےٰ سے دعا مانگی جائے۔ باقی ان سے یہ بھی نہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کرو کیونکہ شریعت میں اس کا کہیں ثبوت نہیں کہ وہ ایسی دعاؤں کے ماذون ہیں۔ احادیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں جاکر مردوں کے لئے دعا کی جائے یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو احیاء کی دعا سے نفع ہوتا ہے اور اس کے منتظر رہتے ہیں مگر اسکا

---

[1] قال السخاوی فی المقاصد الحسنۃ حدیث کسر اعظم المیت ککسر اعظم الحی احمد وابو داؤد وابن ماجۃ والبیہقی من حدیث عائشۃ مرفوعاً وحسنہ ابن القطان وقال ابن دقیق العید انہ علی شرط مسلم ورواہ الدار قطنی من وجہ آخر عنہا وزاد فی الاثم وفی روایۃ یعنی فی الاثم وذکرہ مالک فی المؤطا بلاغا عن عائشۃ رض موقوفا ورواہ ابن ماجۃ من حدیث ام سلمۃ رض ص ۱۴۸ واللہ اعلم ۱۲ جامع عفا اللہ عنہ۔

ضروری اطلاع:۔ خط وکتابت کرنے وقت یا اپنا پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

کہیں ثبوت نہیں کہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کرو تو وہ دعا کر دیتے ہیں اور اولیاء سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو اپنے اجسام سے تعلق رہتا ہے جس کے بعض آثار یہ ہیں کہ ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی۔ ایک اثر یہ ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا ان کے بعد بھی حرام ہے (گویا یہ حکم آیات واحادیث میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیان کیا گیا ہے مگر بعض علماء نے تمام انبیاءؑ کے لئے یہ حکم عام مانا ہے واللہ اعلم ۱۲) تو کسر عظم سے جسمانی ایذاء تو نہیں ہوتی ہاں روحانی ایذاء ہو سکتی ہے۔ اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیساکہ زندہ کی ہڈی توڑنا۔ حضرت استاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) فرماتے تھے کہ مردہ کے جسم کو جلانے سے اس کو ایسی ایذاء ہوتی ہے جیسے تمہارے چادرہ کو اتار کر کوئی تمہارے سامنے جلا دے تو اس سے تم کو رنج اور غم ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کو بھی رنج ہوتا ہے ظاہر ہے کہ چادرہ کے جلانے سے ہمارے جسم کو ایذاء نہیں ہوتی صرف روحانی ایذاء ہوتی ہے۔ یہی حال بعد موت کے بدن جلانے کا ہے۔ ایک وجہ تشبیہ تو یہ ہوئی دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ گناہ میں ہو کہ جب گناہ زندہ کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے ایسا ہی میت کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے۔ (قلت وھٰذا الوجہ اولیٰ لانہ مؤید بالروایۃ وقد ذکرتہا فی الحاشیۃ ۱۲ جامع) اور وجہ شبہ ترک احترام ہے کیونکہ ہڈی توڑنے اور بدن جلانے سے میّت کی بے حرمتی ہوتی ہے احترام میّت کا اب بھی باقی ہے اور تقدیر پر اس حدیث کا مآل بھی حقوق آبرو کی طرف ہو جائے گا۔ حاصل یہ ہوا کہ چونکہ مردہ کا احترام بعد موت کے بھی باقی ہے اور کسر عظم میں اس کی بے حرمتی اور بے عزتی ہے اس لئے یہ فعل حرام ہے اور ظاہر ہے کہ اقوال کی تاثیر بے حرمتی میں کسر عظم سے زیادہ ہے پس مردوں کو بُرا بھلا کہنا بھی حرام ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ اپنے مردوں کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ اعمال کی جزا کو پہونچ چکے ہیں اگر واقع میں وہ بُرے ہیں

تو اپنے افعال کی سزا بھگت رہے ہیں پھر تمھارا ان کو برا بھلا کہنا بے سود ہے۔ اور اگر واقع میں وہ اچھے ہیں تو ان کو برا کہنے سے تم کو گناہ ہوگا۔ اس لئے یہ حرکت قابل ترک ہے (البتہ جو لوگ اپنی زندگی میں کوئی برا طریقہ رائج کر گئے ہوں اور ان کی موت کے بعد بھی لوگ اس کا اتباع کرتے ہوں اُن کو برا کہنے کا مضائقہ نہیں تاکہ لوگ اس کے اتباع سے باز آجائیں ۱۲ جامع) پس مسلمان مُردوں کی بے حرمتی کرنا خواہ فعل سے ہو یا قول سے ہر طرح ناجائز ہے اور اس بے حرمتی کے بہت سے شعبے ہیں جن میں سے ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ضرورت کی طرف مجھ کو میرے ایک عنایت فرمانے توجہ دلائی ہے وہ یہ کہ سنا گیا ہے کہ بعض لوگ قبرستانوں میں ہگتے موتتے ہیں اور قبرستان زمین میں گھر بناتے ہیں تو اس میں ایک تفصیل ہے جس کو غور سے سن لینا چاہیئے۔

وہ یہ کہ اگر قبرستان کی زمین کسی کی ملک ہو تب تو اس کو قبروں کے نشانات مٹاکر اس جگہ مکان بنانا جائز ہے مگر جس جگہ قبر کا نشان ہو وہاں پاخانہ بنانا ہگنا موتنا اس وقت بھی حرام ہے اور جو قبرستان وقف ہیں ان کا استعمال بالکل حرام ہے ان میں کسی کو مکان بنانا جائز نہیں اور اکثر قبرستان وقف ہی ہیں اس لئے اس سے بچنا چاہیئے اور اس میں آخرت کا ضرر تو ہے ہی کہ گناہ ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے کہ بعضے مردے پٹک بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے واقعات بکثرت سنے گئے ہیں۔ میں یہ نہیں دعوے کرتا کہ سب حکایات صحیح ہیں مگر بہت سی سند صحیح سے ثابت بھی ہیں۔ ثابت ہے پھر اس سے قطع نظر اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ قبروں پر ہگنے موتنے سے مُردوں کو ایذا ہوتی ہے۔ اور ان میں بعض اولیاء بھی ہیں جن کی نسبت حدیث صحیح میں وارد ہے من اذی لی ولیًّا فقد اذنته بالحرب یعنی مہ ذکرنی المرقاۃ بروایة ابن لشبنه عن ابن مسعود اذی المؤمن فی موته کاذاه فی حیوۃ وفی المشکوٰۃ عن عمرو بن حرب قال رانی النبی صلی اللہ علیہ وسلم متکا علی قبر فقال لا توذ صاحب ھٰذا القبر اوا توذ؛ زادہ احیا۔

جو کوئی میرے کسی ولی کو ایذا پہنچاوے اس کو خدا تعالےٰ کی طرف سے اعلان جنگ دیا جاتا ہے۔ اللہ اکبر یہ وعید کتنی سخت ہے خدائی الٹیمیٹم کا کون مقابلہ کر سکتا ہے پھر اس وعید کا ظہور کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ خود اولیاء کو تصرف کی اجازت دیتے ہیں اور وہ اپنے تصرف سے اس شخص کو ضرر پہنچا دیتے ہیں اور بعض دفعہ اولیاء کوئی تصرف نہیں کرتے لیکن حق تعالےٰ کو اپنے محبوب کی بے حرمتی پر غیرت آتی ہے کہ ہمارے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا گیا۔ اس لئے حق تعالےٰ خود اس شخص کو کسی بلا میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ غرض اولیاء کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرنا بڑا سنگین جرم ہے اگر وہ حضرات اپنی شفقت سے کچھ بھی نہ کہیں تو غیرت حق نہیں چھوڑتی اس لئے اس سے بہت بچنا چاہیئے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں

بس بتجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(ہم نے اس کائنات میں بارہا تجربہ کیا کہ اللہ والوں کے ساتھ جو بدتمیزی کرتا ہے وہ خود ذلیل ہوجاتا ہے)

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد
تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد

(کسی قوم کو خدائے تعالےٰ ذلیل اس وقت تک نہیں فرماتے جب تک کہ وہ کسی اللہ کے مقبول بندے کو نہیں ستاتے)

یاد رکھو جب کوئی قوم کسی ولی کا دل دکھاتی ہے تو ان کا صبر ضائع نہیں جاتا حق تعالےٰ بعض دفعہ ان کی طرف سے اس طرح انتقام لیتے ہیں کہ خود ان کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی یہ مت سمجھو کہ حقوق العباد صرف جان ومال ہی کے متعلق ہیں بلکہ آبرو بھی حقوق العباد میں داخل ہے اور اس کے حقوق جان ومال سے بھی زیادہ ہیں کہ بعد موت کے بھی اس کے حقوق باقی رہتے ہیں جن میں سے ایک حق یہ بھی ہے جس کو ابھی ذکر کیا کہ

بعد مرنے کے مسلمانوں کی قبروں کا احترام کیا جائے ان کی بے حرمتی نہ کی جائے جس کو میں نے ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ یہ مضمون میرے دوست نے کئی مرتبہ مجکو یاد دلایا مگر ہر بیان کے وقت میں اس کو بھول جاتا تھا کیونکہ فرمائشی مضمون بہت کم یاد رہتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ یاد رہا۔ اور بحمد للہ اس کا بیان کافی ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ بعض مخلصین قبرستانوں کی حفاظت کے لئے خاص اہتمام کر رہے ہیں سب مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیئے اور ان کی اعانت کرنی چاہیئے اس تقریر پر شاید کوئی یہ اشکال کرے کہ تم نے بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ کی بیحرمتی سے وبال آتا ہے لیکن ہم تو اب تک قبرستانوں میں ہگتے موتتے رہے ہیں یا اولیاء اللہ کو برا بھلا کہتے رہے ہم کو تو کچھ ضرر نہیں ہوا ہم تو ویسے ہی ہٹے کٹے صحیح وسالم موجود ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض ویسا ہی ہے جیسا کہ کفار نے انبیاء؈ سے کہا تھا کہ تم روز روز ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو کہ اگر کفر کرو گے تو یوں وبال آئے گا یوں بلائیں نازل ہوں گی مگر ہم تو مدت سے کفر کر رہے ہیں اور اب بھی کفر میں مبتلا ہیں ہم پر تو کچھ بھی عذاب نہ آیا پس جو انجام کفار کے اس اعتراض کا ہوا تھا وہی انجام یہ حضرات سوچ لیں میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر اب تک کوئی وبال تم پر نہیں آیا تو کیا آئندہ کے لئے بھی تمھارے پاس وحی آگئی ہے کہ تم کبھی وبال میں مبتلا نہ ہو گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا اعتراض کر رہے ہیں وہ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں لیکن وبال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری ایک باطنی ظاہری وبال تو یہ ہے کہ جان و مال کا نقصان ہو جاوے، صحت برباد ہو جاوے مثلاً اور یہ وبال آہ دن ہے اور باطنی وبال یہ ہے کہ دل سیاہ ہو جاوے اس میں اعمال صالحہ کی صلاحیت باقی نہ رہے نیک کاموں سے دل گھبرانے لگے یہ وبال بہت سخت ہے کیونکہ جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے جس کا انجام ابدالآباد کے لئے عذاب جہنم ہے۔ پس میں کہتا ہوں

کہ یہ لوگ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہیں لیکن باطنی وبال میں گرفتار ہیں کہ ان کے دلوں سے قہر خداوندی کا خوف نکل گیا ہے جبھی تو اتنی جرأت ہے کہ قہر خداوندی کا نام سن کر اپنی حرکتوں سے باز آنے کا قصد نہیں کرتے بلکہ الٹا اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اگر ان کے دلوں میں قہر الٰہی کا خوف ہوتا تو جس کام میں اس کا وہم بھی ہوتا اس سے فوراً الگ ہو جاتے۔ اسی مضمون کو مولانا ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں ۔

آتشے گر نامدست ایں دود چیست
جاں سیہ گشت درواں مردود چیست

(اگر آگ اندر نہیں لگی تو دھواں کس سبب سے ہے اگر دل نہیں سیاہ ہو چکا تو
یہ گستاخی کے کلمات کیوں نکل رہے ہیں)

یعنی تم جو کہتے ہو کہ ہم پر گناہوں کا وبال نہیں آیا مولانا فرماتے ہیں کہ تمہارے اندر قہر کی آگ تو جل رہی ہے اگر تمہارے اندر آگ نہیں ہے تو یہ دھواں کہاں سے آیا یعنی یہ کلمات جرأت اور بے باکی کے تمہاری زبان سے کیونکر نکل رہے ہیں جن سے دل کے سیاہ ہو جانے کا پتہ چل رہا ہے اور یہ بہت بڑا قہر ہے جو ظاہری قہر سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ یہاں تک حقوق العباد کا ذکر ہو گیا آگے اخلاق کا ذکر ہے والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس۔ اور وہ لوگ صبر کرنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال کے وقت۔ ہر چند کہ اخلاق باطنیہ بہت ہیں لیکن حق تعالےٰ نے ان میں سے اس مقام پر صرف صبر کو بیان فرمایا ہے اور اس کے تین مواقع بیان فرمائے ہیں وجہ اس تخصیص کی یہ ہے کہ صبر ایسی صفت ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد یقیناً اخلاق کا حصول خود بخود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صبر کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ عزیز و قریب کے مرنے پر مستقل مزاج رہے یہ بھی صبر کی ایک فرد ہے لیکن صبر کی حقیقت اس سے عام ہے صبر کے معنی لغت میں حبس کے ہیں یعنی روکنا اور یہی معنی شریعت

یں بھی ہیں صرف ایک قید زیادہ ہے یعنی حبس النفس علی ما نکرہ انسان کا اپنے نفس کو اس کی ناگوار بات پر روکنا اور ناگواری کے اقسام پر شرعاً صبر کی تین قسمیں ہیں ایک صبر علی العمل (۲) صبر عن العمل (۳) صبر فی العمل۔ صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا مثلاً نماز زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا ناغہ ان کو ادا کرتے رہنا اور صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجا لانا مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ بچہ جی اتنی دیر تک تم سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے اتنی دیر تک تجھکو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے جب یہ ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو سب اعمال ٹھیک ٹھیک ادا ہوتے ہیں بعض لوگوں کو فرائض شرعیہ کی پابندی تو نصیب ہے اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو صبر علی العمل کا درجہ حاصل ہے لیکن اعمال کو بجا لاتے وقت وہ ان کے آداب و حقوق کی رعایت نہیں کرتے گڑبڑ کر دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صبر فی العمل حاصل نہیں ہوا۔ تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو ما نہی اللہ عنہ سے روکنا شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رُکنا جن میں سب سے اہم صبر عن الشہوت ہے کہ نفس کے تقاضائے شہوت کو روکا جاوے اور یہ سب سے اہم اس لئے ہے کہ نفس کے دوسرے تقاضے تو ایسے ہیں کہ ان سے اگر نہ روکا جاوے تو بعد میں اس کو خود ہی بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت کا خیال کر کے نفس ان تقاضوں سے خود ہی رک جاتا ہے۔ مثلاً صبر عن الغضب بہت آسان ہے کیونکہ غصہ کے وقت گو نفس کو لذت آتی ہے مگر بعد میں کوفت ہوتی ہے مشاہدہ ہے کہ غصہ کرکے بعد میں ایک ندامت سی طاری ہوتی ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ غصہ کیا بات کو ٹال کیوں نہ دیا غصہ کرکے کبھی جی بھلا نہیں ہوتا نیز بعض دفعہ کسی پر غصہ کرنے سے اس کو دشمنی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایذا

رسائی کے درپے ہو جاتا ہے ان مضرتوں پر نظر کر کے غضہ کو انسان خود ہی دبانے لگتا ہے لیکن غض الشہوت بہت مشکل ہے کیونکہ شہوت رانی میں وقت قضاء شہوت کے بھی لذت آتی ہے اور بعد میں بھی اس کی لذت رہتی ہے قضاء شہوت کے بعد کچھ کوفت نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو روحانی کوفت ہوتی ہو تو ممکن ہے لیکن ایسے بہت کم ہیں عام حالت یہی ہے کہ شہوت رانی کے بعد اس کا مزہ پڑ جاتا ہے پہلے سے زیادہ آگ بھڑک جاتی ہے گو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو جاتا ہے اور شہوت بالنساء سے بھی اشد شہوت بالامارد ہے آج کل امردوں کے ساتھ ابتلاء عام ہو رہا ہے جس کی چند وجوہ ہیں اول تو عورتوں میں قدرتی حیا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان سے اظہار شہوت کی جرأت ذرا دقت سے ہوتی ہے اور لڑکوں میں حیاء کا مادہ کم ہوتا ہے۔ دوسرے عورتوں کی حفاظت بہت کی جاتی ہے ان کے پاس پہونچنا آسان نہیں۔ اور جو کوئی پہونچ بھی جاتا ہے اس کی رسوائی جلد ہو جاتی ہے اور بچوں کی کچھ بھی حفاظت نہیں کی جاتی اُن کا کسی سے پردہ نہیں ہوتا۔ تیسرے اس میں اتہام کم ہوتا ہے بچوں کے سر پر شفقت سے بھی ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور شہوت سے بھی اب اگر کسی کے بچہ کو پیار کریں اس کے سر پر ہاتھ پھیریں تو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ان کو بچوں پر شفقت زیادہ ہے شہوت کی کسی کو کیا خبر ان وجوہ سے آجکل امارد کی ساتھ ابتلاء بہت زیادہ ہے اور شہوت بالنساء سے یہ شہوت بالرجال اشد ہے کیونکہ عورتوں میں محارم کے ساتھ ابتلا کم ہوتا ہے اکثر غیر محارم سے ہوتا ہے سو وہ کسی نہ کسی وقت تمھارے لئے حلال بھی ہو سکتی ہیں اگر وہ کنواری ہے تو اسی وقت نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے اور اگر شوہر والی ہے تو ممکن ہے شوہر مر جاوے یا طلاق دیدے تو پھر تم اس سے نکاح کر سکتے ہو بہر حال اس میں حلت کی توقع تو ہے گو کسی وقت ہو گو توقع ضعیف ہی ہو مگر امردوں کا حلال ہونا تو کسی وقت بھی متوقع نہیں بلکہ بعضے گناہ تو ایسے ہیں جو جنت میں جا کر گناہ نہ رہیں گے مثلاً شراب پینا دنیا میں گناہ ہے لیکن جنت میں شراب ملے گی

اور یہ شہوت بالرجال ایسا خبیث فعل ہے کہ جنت میں بھی اس کا وقوع نہ ہوگا پس یہ زنا اور شراب خواری سے بھی بدتر ہے، بلکہ شراب میں تو جو کچھ حرمت ہے سکر کی وجہ سے ہے اگر کسی تدبیر سے شراب کا سُکر زائل ہو جائے۔ مثلاً سرکہ بن جائے تو بعینہٖ اُسی کا پینا حلال ہو جاتا ہے لیکن شہوت بالامرد کی خباثت لذاتہٖ ہے یہ کسی طرح بھی زائل نہیں ہو سکتی پس یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کہ اس میں کسی طرح بھی حلت کی گنجائش نہیں یہ ناپاک فعل سب سے پہلے قوم لوط میں رائج ہوا اُن سے پہلے آدمیوں میں اس کا وقوع نہ ہوا تھا۔ چنانچہ لوط علیہ السلام نے اُن سے فرمایا۔

اناتون الفاحشۃ ما سبقکم بہا احدٌ من العالمین گو حیوانات میں بعض کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان میں پہلے سے اس کا وقوع تھا حق تعالیٰ نے قوم لوط پر جب سنگین عذاب نازل کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ فعل کیسا سنگین ہے کیونکہ کفر تو تمام کفار میں مشترک تھا لیکن انواع عذاب کا مختلف ہونا بظاہر خصوصیت افعال ہی کی وجہ سے ہے اور سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل بد قوم لوط نے بھی خود نہیں ایجاد کیا بلکہ شیطان نے ان کو سکھایا۔

یہ فعل ایسا خبیث ہے، کہ انسان کا نفس باوجود امارۃٌ بالسوء ہونیکے اسکی طرف از خود منتقل نہیں ہوا بلکہ شیطان خبیث نے اس کی طرف قوم لوط کو متوجہ کیا جس کا قصہ اس طرح کتابوں میں لکھا ہے کہ شیطان خوبصورت لڑکے کی صورت میں متشکل ہو کر ایک شخص کے باغ میں سے انگور توڑ توڑ کر کھا جاتا تھا، باغ والا اس کو دھمکاتا مارتا تھا مگر یہ باز نہ آتا تھا ایک دن اس نے تنگ آکر اس سے کہا کہ کمبخت تو نے میرے باغ کا یہ پیچھا کیوں لے لیا سارے درخت برباد کر دیئے تو مجھ سے کچھ روپے لیلے اور میرے باغ کا پیچھا چھوڑ دے شیطان بصورت امرد نے کہا کہ میں اس طرح باز نہ آؤں گا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے درختوں کا ناس نہ کروں تو جو بات میں کہوں اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا وہ کیا بات ہے۔ ابلیس نے اس کو یہ فعل تعلیم کیا کہ میرے ساتھ تو یہ فعل کیا کر پھر میں تیرے باغ کو چھوڑ دوں گا چنانچہ پہلی بار

تو اس نے جبراً قہراً اپنے باغ کے بچاؤ کے لئے یہ فعل کیا پھر خود اس کو مزہ پڑ گیا وہ اس کی خوشامدیں کرنے لگا کہ تو روز آیا کر اور جتنے انگور چاہے کھا لیا کر پھر اس نے دوسرے آدمیوں کو اس کی اطلاع دی اور لوگ بھی یہ فعل کرنے لگے۔ پھر کیا تھا عام رواج ہو گیا۔ اس کے بعد شیطان تو غائب ہو گیا لوگوں نے لڑکوں کے ساتھ یہ فعل کرنا شروع کر دیا۔ خدا تعالےٰ کو یہ فعل بہت ہی ناگوار ہے۔ چنانچہ لوط علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو اس فعل سے روکو ورنہ سخت عذاب آئے گا۔ انھوں نے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے آخر عذاب نازل ہوا اور سب کے سب تباہ ہو گئے۔ صاحبو! یہ فعل ایسا خبیث ہے کہ جو اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ تو بدنام ہوتا ہی ہے مگر اس سے بڑھ کر یہ ستم ہے کہ جس نبی کی امت نے اس فعل کا ارتکاب کیا ہے آج اس نبی کی طرف سے بھی بلفظاً نسبت کرنا لوگوں میں باعث ننگ ہو گیا۔ یعنی کوئی شخص اپنے لئے یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کو لوطی کہا جاوے حالانکہ لفظ لوطی میں یائے نسبت ہے اور لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور موسوی اور عیسوی اور یوسفی۔ اگر لوط علیہ السلام کی قوم نے یہ فعل بد نہ کیا ہوتا تو آج لوطی کا لفظ باعث فخر ہوتا جیسا کہ دیگر انبیاء کی طرف نسبت کرنا باعث فخر ہے۔ مگر اس کمبخت قوم نے اپنے نبی کے نام کو بھی نہ چھوڑا۔ صاحبو! مجھے تو اس فعل کے لئے لفظ لواطت کا استعمال بہت ہی ناگوار ہوتا ہے کیونکہ لواطت کا لفظ لوط علیہ السلام کے نام سے بنایا گیا ہے تو ایسے گندے کام کا نام نبی کے نام سے مشتق کرنا بہت ہی نازیبا ہے جس نے یہ لفظ ایجاد کیا ہے بہت ہی ستم کیا ہے میرے نزدیک یہ لفظ عربیت میں دخیل اور مولد ہے فصحائے عرب کے کلام میں اس کا استعمال نظر سے نہیں گذرا۔ عربی میں اس کے لئے اتیان فی الدبر کا لفظ معلوم ہوتا ہے یا اور کوئی لفظ بھی ہو بہرحال لواطت کا لفظ قابل ترک ہے اور میرے نزدیک اغلام کا لفظ بھی مولد ہے۔ عربی فصیح میں اس کا بھی استعمال نہیں ہے یہ سب بعد کے گھڑے ہوئے ہیں۔ غرض اس فعل کی خباثت عقلاً و نقلاً ہر طرح ثابت ہے اور

طبیعت سلیمہ اس سے خود ہی انکار کرتی ہے۔ اس فعل پر سوائے بدطینت آدمی کے اور کوئی سبقت نہیں کرسکتا۔ ایک کھلا ہوا فرق شہوت بالنساء اور شہوت بالرجال میں یہ ہے کہ عورت سے قضاء شہوت کرنے کے بعد آپس میں محبت بڑھتی ہے اور مرد کی عزت عورت کی نظر میں بڑھ جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ یہ مرد ہے نامرد نہیں ہے۔ اور لڑکوں سے قضاء شہوت کرکے ایک دوسرے کی نظر میں اسی وقت ذلیل وخوار ہوجاتا ہے پھر بہت جلد مشغول کے دل میں عداوت ایسی قائم ہوجاتی ہے کہ وہ دوسرے کی صورت سے بیزار ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو شہوت بالرجال سے پاک وصاف ہیں مگر ان میں بھی نظر کے مرض میں اکثر مبتلا ہیں حالانکہ حدیث سے معلوم ہوچکا ہے کہ زنا آنکھ سے بھی ہوتا ہے۔ پس امردوں کو بنظر شہوت دیکھنا بھی حرام ہے اس میں بہت کم لوگ احتیاط کرتے ہیں حالانکہ نظر مقدمہ ہے فعل کا اور مقدمۃ الحرام حرام۔ قاعدہ فقہیہ ہے یعنی حرام کے مقدمات بھی حرام ہوتے ہیں اس لئے نگاہ کی حفاظت بھی بہت ضروری ہے۔ بعض اکابر کا قول ہے کہ جس شخص کو حق تعا اپنے دربار سے نکالنا چاہتے ہیں اس کو محبت امارد میں مبتلا کردیتے ہیں۔ محبت گو فعل اختیاری نہیں مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی ان کو دیکھنا اُن سے اختلاط کرنا وغیرہ۔ پس مطلب یہ ہے کہ جس کو حق تعالےٰ اپنے دربار سے مطرود کرنا چاہتے ہیں اسی کو نظر الی الامارد اور اختلاط بالامارد میں مبتلا کردیتے ہیں اور یہ افعال اختیاریہ ہیں جو مفضی ہوجاتے ہیں محبت وغیرہ کی طرف جس کا انجام طرد عن الحق ہے (اعاذنا اللہ منہ ۱۲)

دوسرے میری سمجھ میں یہ ہرگز نہیں آتا کہ لڑکوں سے کسی کو عشق ہوتا ہو۔ آج کل لوگوں نے فسق کا نام عشق رکھ لیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق رنگ وروپ ظاہری پر ہوتا ہے اس کا انجام ذلت اور بدنامی اور رسوائی ہے)

کسی اور کا قول ہے ؎

این نہ عشق ست آنکہ در مردم بود
این فسادِ خوردن گندم بود

(آدمیوں کے اندر ایک دوسرے سے نفسانی عشق ہرگز عشق نہیں بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے اگر نہ ملے تو سب عاشقی بھول جائے)

اور اگر ہزار میں کسی ایک کو عشق ہو بھی جائے تو اس کو عشق پر ملامت نہ کی جائے گی مگر اس کے بعد جو افعال اس سے صادر ہوتے ہیں ان پر ملامت کی جائے گی کیونکہ وہ اختیاری افعال ہیں حتیٰ کہ اس کا تصور کرنا اور تصور سے لذت لینا یہ بھی فعل اختیاری ہے جس کا چھوڑنا واجب ہے اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس حالت میں محبوب سے بعد کو نفع میں بہت زیادہ دخل ہے بتاعدے اکثر یہ مرض خفیف ہو جاتا ہے اور تکشف میں جو علاج میں نے اس کا لکھا ہے اس سے بہت لوگوں کو نفع ہوا ہے اس پر بھی ضرور عمل کیا جاوے اس باب میں سالکین کو خصوصاً اور تمام مسلمانوں کو عموماً سخت احتیاط کرنا چاہیئے۔

ہمارے یہاں ایک ذاکر ہیں ایک مرتبہ ان کو ذکر کے وقت ایسا معلوم ہوا کہ گویا یہ آیت ان کے قلب پر وارد ہوئی انا منزلون علی اھل ھذہ القریۃ رجزاً من السَّمَآءِ بما کانوا یفسقون ۰ اور یہ منجانب اللہ الہام تھا جو کسی ہاتف وغیرہ کے ذریعہ سے ان پر القا ہوا اور اس کا مطلب بے ساختہ اُن کے دل میں یہ آیا کہ اس بستی پر جس میں میں مقیم ہوں عذاب خداوندی نازل ہونے والا ہے اور وہ عذاب بصورت طاعون ہوگا کیونکہ بعض احادیث میں طاعون کو رجز سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ آیت قوم لوط کی شان میں ہے اس لئے ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ اس عذاب کا سبب عمل قوم لوط ہے جو اس بستی میں بکثرت رائج تھا۔ اس کے بعد ایک جمعہ میں انھوں نے یہ واقعہ بیان کر دیا کہ مجھ کو یہ بتلایا گیا ہے کہ اس بستی پر عمل قوم لوط کی کثرت کی وجہ سے عذاب نازل ہوگا جو بصورت طاعون ہوگا۔

اس لئے لوگوں کو اس عمل سے رک جانا چاہیئے اور خدا تعالیٰ کی جناب میں توبہ و استغفار کرنا چاہیئے مگر اس عمل خبیث سے قلوب کچھ ایسے سیاہ ہو جاتے ہیں کہ ان میں تاثیر کا مادہ نہیں رہتا اس لئے لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ سبحان اللہ ان پر تو وحی آنے لگی بجائے تاثیر اور توبہ کے الٹا تمسخر کرنے لگے۔ آخر تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہاں اس زور کا طاعون آیا کہ گھر کے گھر تباہ ہو گئے۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ اس منحوس عمل سے باطنی عذاب بھی نازل ہوتا ہے کہ قلوب مسخ ہو جاتے ہیں اور ظاہری بلائیں بھی نازل ہوتی ہیں۔ خدا سب مسلمانوں کو اس سے نجات دے۔ (آمین)

پس شہوت سے صبر کرنا صبر عن الغضب سے بھی دشوار ہے یہی وجہ ہے کہ اس مرض میں عام ابتلا ہے لیکن یہ دشواری اس وقت تک ہے جب تک آپ اس سے بچنے کا ارادہ نہ کریں اور جس دن آپ اس سے بچنے کا اہتمام کریں گے اسی دن سے آسانی شروع ہو جائے گی کیونکہ یہ مشکل آپ کے لحاظ سے ہے خدا تعالیٰ کے لحاظ سے تو مشکل نہیں آپ ارادہ کر کے دیکھیں وہ اس مشکل کو بہت جلد آسان کر دیں گے مولانا فرماتے ہیں ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست
بر کریماں کارہا دشوار نیست

(تم یہ مت کہو کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری رسائی نہیں ہو سکتی
ارے بھائی اہل کرم پر کوئی کام دشوار نہیں ہوتا)

دوسرا مصرع اصل میں ایک جملہ مقدرہ کی دلیل ہے تقدیر عبارت یوں تھی تو مگو ما را بداں شہ بار نیست ∴ زیرا کہ وصول در دست تو نیست بلکہ در دست خدائے کریم ست و بر کریماں کارہا دشوار نیست + یعنی تم یہ مت کہو کہ ہم خدا کے دربار میں نہیں پہونچ سکتے کیونکہ وصول تمہارے قبضہ میں تھوڑا ہی ہے جو دشواری اس کی مانع ہو بلکہ خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور وہ کریم ہیں اپنی عنایت سے

وہ خود تم کو پہونچا دیں گے کیونکہ کریموں پر بڑے سے بڑا کام بھی دشوار نہیں بس اس میں کچھ بھی دشوار نہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنے تک پہنچا دیں گے ہم اس قابل نہ تھے اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمہاری سعی سے تو پہونچنا مشکل تھا مگر سعی کے بعد وہ امداد فرماتے ہیں تم طلب اور ارادہ کرو وہ خود تم کو پہونچا دیں گے اور تمام دشواریوں کو آسان کر دیں گے اس پر شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ صاحب ہماری تو طلب اور سعی بھی ناتمام ہے۔ پس یہ مانا کہ سعی کے بعد حق تعالیٰ خود پہونچا دیتے ہیں مگر پہلے سعی تو ہو اور یہاں تو سعی بھی ناتمام ہے اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہم باین دلہا نماید خویش را
ہم بدوزد خرقۂ درویش را

(اپنی ناتمام کوشش جاری رکھو لیکن حق تعالیٰ خرقۂ درویش کو (ناتمام کوشش کو) قبول فرما کر کامل فرما دیتے ہیں۔ یعنی تمہارے پھٹے ہوئے خرقہ کو خود سی دیتے ہیں)

خرقۂ درویش سے مراد سالک کی ناتمام سعی ہے۔ یعنی وہ ایسے کریم ہیں کہ تمہاری ناتمام سعی کو بھی خود ہی کامل کر دیتے ہیں اور تمہارے پھٹے ہوئے خرقہ کو بھی خود ہی سی دیتے ہیں اور سالکین کے قلوب میں جلوہ گری فرماتے ہیں ورنہ ہمارے قلوب اس قابل کہاں تھے کہ حضرت حق ان کو تجلی فرمائیں لیکن تم جس حال میں بھی اپنی طلب اور ارادہ ظاہر کرو گو ناتمام ہی طلب ہی پھر وہ اپنی رحمت سے طلب کو بھی کامل کر دیتے ہیں اور تمہارے دلوں کو بھی اپنی تجلی کے قابل کر دیتے ہیں پھر اس میں تجلی بھی فرماتے ہیں تم کو آئینہ تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں وہ تم کو بلا کر آئینہ بھی خود ہی عطا کر دیتے ہیں کہ لو اس کے اندر سے ہمارے جمال کا مشاہدہ کرو۔ سبحان اللہ کیا رحمت ہے بس اب تو کوئی اشکال نہیں رہا اب آپ کو سعی اور طلب سے کون مانع ہے آپ اس کا بھی

خیال نہ کیجئے کہ آپ کی طلب کامل ہے یا ناقص تم طلب میں لگو سب کامل ہو جائے گی۔ حدیث قدسی میں وارد ہے من تقرب الیّ شبرا تقربت الیہ ذراعاً ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعاً ومن اتانی یمشی اتیت الیہ ھرولۃ اوکما قال جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ چلتا ہے میں اس کی طرف کھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں۔ اس حدیث میں بالشت اور گز وغیرہ اور دوڑ کر آنا سمجھانے کے لئے ایک مثال ہے مقصود یہ ہے کہ جو میری طرف ذرا بھی توجہ کرتا ہے میں اس کی طرف دو چند اور سہ چند توجہ کرتا ہوں کہ واقعی سچ ہے اگر حق تعالیٰ اتنی توجہ اور رحمت نہ فرمائیں تو انسان کی کیا مجال تھی جو ان تک پہونچ سکے آخر انسان کو خدا سے نسبت ہی کیا ہے وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں اس کا وہم و گمان بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتا تو جو ذات اس قدر بالا و برتر ہو اس کی معرفت اور محبت اور مشاہدہ انسان خود کیونکر کرسکتا ہے۔ پس یہ اُنہی کی عنایت ہے جو کچھ حصہ معرفت وغیرہ کا انسان کو عطا ہو جاتا ہے ورنہ واقعی وہ مسافت تو ایسی ہے ؎

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بُریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ راستہ مثل انگور کے درخت کے قطع کرنے سے اور بڑھ جاتا ہے)

غیر متناہی مسافت ہے جس کا قطع کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لیکن وہ کیونکر قطع ہوتی ہے سنئے ؎

خود بخود آں شہ ابرار برمی آید ۔۔۔ نہ بزور و نہ بزاری نہ بزر می آید

(ترجمہ) وہ محبوب حقیقی خود بخود اپنے کرم سے مل جاتا ہے زور اور زاری
اور زر سے نہیں ملتا یعنی اسباب وصل کے اور تدابیر رضا کے
اختیار تو کرے مگر کام بنے گا صرف فضل ہی سے)

یعنی صورت وصول کی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء میں تو سالک میں اور محبوب حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جس کو سالک طے نہیں کر سکتا مگر جب یہ چلنا شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی مسافت اس سے قطع نہ ہوگی اب وہ خود بھی چلنا شروع کرتے ہیں اور ان کو اس مسافت کا طے کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تو وہ خود اس کے نزدیک آجاتے ہیں اس طرح وصول ہو جاتا ہے۔ پس حقیقت میں بندہ واصل نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ اس کے پاس پہونچ جاتے ہیں (مگر کیا ٹھکانا ہے رحمت کا کہ پھر بھی بندہ کو واصل کا خطاب دیدیا گیا ۱۲ جامع) اور اس کی مثال میں نے ایک تجویز کی ہے جس سے وصول عبد کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ مثلاً آپ کا ایک شیرخوار بچہ ہو جو آپ سے دور کھڑا ہو، آپ اس سے کہتے ہیں کہ دوڑ کر چلے آؤ۔ حالانکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اتنی مسافت یہ طے نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی اس کو بلاتے ہیں اب بچہ ہمت کرکے ایک دو قدم چلتا ہے اور گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے اس وقت باپ کو خود جوش آئے گا اور وہ دوڑ کر خود آوے گا اور اس کو گود میں اٹھالے گا تو دیکھئے یہ مسافت بعیدہ جو لقا سے مانع تھی کیونکر طے ہوئی اس طرح طے ہوئی کہ بچہ تو دو قدم چل کر گر پڑا اور رونے لگا پھر باپ خود اس کے پاس آگیا اور اس کو گلے سے لگالیا یہی صورت سلوک باطن کی ہے کہ اول تم اپنی ناتمام طلب اور سعی ظاہر کرتے ہو تمہاری وہ سعی ہرگز وصول کے لئے کافی نہیں تھی مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑتے ہو اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت کو جوش ہوتا ہے وہ خود آکر تم کو گلے سے لگالیتے ہیں مگر ہاں اس کی ضرورت بیشک ہے کہ تم بچہ کی طرح ایک دو قدم چل کر رونا تو شروع کرو۔

مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی است آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے پانی وہاں ہی جاتا ہے جہاں مشکل ہوتی ہے جواب وہاں ہی جاتا ہے)

؎ ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں درد ہوتا ہے دوا وہاں ہی پہنچتی ہے جہاں مرض ہوتا ہے شفا وہاں ہی پہنچتی ہے)

؎ گر نہ گرید طفل کے جوشد لبن
گر نہ گرید ابر کے خندد چمن

(اگر بچہ رونا نہ شروع کرے تو دودھ ماں کا کب جوش کرے اگر بادل نہ روئے یعنی بارش نہ کرے تو چمن ہرا بھرا کب ہوتا ہے)

اور رونے اور گر پڑنے سے میری مراد یہ نہیں کہ چلانا چیخنا شروع کرو بلکہ سالک کا رونا اور گرنا یہ ہے کہ اپنی عاجزی اور ناتوائی کا مشاہدہ کرے حق تعالیٰ کے سامنے الحاح والتجا کرے تواضع اور خاکساری پیدا کرے۔ تکبر اور فرعونیت کو دماغ سے نکال پھینکے اس کے بعد وصول میں دیر نہیں لگتی ذرا تم خاکساری اختیار کر کے تو دیکھو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں را یک زمانے خاک باش

(عرصہ تک تو پتھر دلخراش رہا ہے کچھ دن خاک بن کر بھی آزمالے یعنی تکبر ترک کر کے اللہ والوں کی جوتیاں سیدھی کر لے)

؎ در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

ترجمہ :- (موسم بہار میں پتھر کب ہرا بھرا ہوتا ہے خاک ہوجا تاکہ تجھ سے اعمال صالحہ کے اور اخلاق حسنہ کے رنگ برنگ پھول پیدا ہوں یہ تواضع کے برکات سے ہیں کہ آدمی صلحاء کے پاس نیازمندی سے جاتا رہتا ہے اور فیضان خاصان حق سے مالا مال ہوتا رہے ۔)

میں نے وصول الی اللہ کی مثال جو بچہ کی حالت سے بیان کی ہے اس پر ایک بادشاہ کی حکایت یاد آئی ۔ میں نے کسی بزرگ سے یہ حکایت سنی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے سے ایک درویش کا گذر ہوا ۔ بادشاہ نے درویش کو آواز دی کہ ذرا میرے پاس آؤ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے ۔ اس نے کہا میں تمھارے پاس کیونکر آؤں تم بالاخانہ پر میں زمین پر اور محل کا دروازہ دور کیوں کہ شاہی محلات کا بڑا دروازہ وہاں سے دور تھا اور جس بالاخانے پر بادشاہ تھا وہاں بہت سے دروازے اور درجے طے کرکے پہونچنا ہوتا تھا ۔ بادشاہ نے فوراً ایک کمند لٹکادی کہ اس کو پکڑلو ۔ درویش نے اس کو پکڑ لیا بادشاہ نے کھینچ لیا دو منٹ میں اوپر آگیا ۔ جب وہ اوپر پہونچ گیا تو بادشاہ نے ان سے سوال کیا کہ تم خدا تک کیونکر پہونچے ۔ انھوں نے برجستہ جواب دیا کہ جیسے تم تک پہنچا ۔ خدا تک پہونچنا تو بہت مشکل تھا مگر میں نے خدائی کمند کو مضبوط پکڑ لیا تھا انھوں نے خود ہی کھینچ لیا ۔ سبحان اللہ خوب ہی جواب دیا ۔ اے صاحبو ! تم بھی خدا کی کمند کو مضبوط پکڑ لیتے تو اسی طرح تم بھی ان کے جذبے سے واصل ہو جاتے مگر افسوس ہے کہ لوگ تو کمند الٰہی کو قطع کر رہے ہیں ۔

صاحبو ! خدا کی کمند یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے جنھوں نے مخلوق کو خدا تک پہونچا دیا ۔ انبیاءؑ کے بعد علماء حقانی و اولیاء امت پیدا ہوئے جو ہر وقت مسلمانوں کو احکام الٰہی اور اس تک پہونچنے کا راستہ بتلاتے رہتے ہیں ترغیب و ترہیب ہو رہی ہے ۔ محبت الٰہی و معرفت کے فضائل و اصلاح نفس کا طریقہ بیان ہو رہا ہے مگر پھر بھی لوگوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی اور وہ اسی

طرح غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ جوان کو خدا تک پہنچانا چاہے اس پر طعن و ملامت چاروں طرف سے ہوتی ہے محض اس لئے کہ وہ ان کو ان کاموں سے منع کرتا ہے جو وصول الی اللہ سے مانع ہیں بس یہی کمند الٰہی کو قطع کرنا ہے جب تم ہی خود نہ پہونچنا چاہو تو خدا کو کیا غرض پڑی ہے کہ جو خوشامد کر کے تم کو پہونچا دے انلزمکموھا وانتم لھا کارھون ۔ الغرض صبر عن الشہوت گو فی نفسہ دشوار ہو مگر جب آدمی اس کا ارادہ کرتا ہے تو آسانی شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ پھر بھی دشواری نہیں رہتی ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شہوت عورتوں اور لڑکوں ہی کے تعلق میں منحصر نہیں بلکہ لذیذ غذاؤں کی فکر میں رہنا بھی شہوت ہے۔ عمدہ لباس کی دھن میں رہنا بھی شہوت ہے۔ ہر وقت باتیں بگھارنے کی عادت ہونا بھی شہوت ہے اور ان سب شہوتوں سے نفس کو روکنا یہ بھی عن الشہوت میں داخل ہے آجکل لوگوں کو باتیں بنانے کا بہت مرض ہے بس جہاں کام سے فارغ ہوئے مجلس آرائی کر کے فضول باتیں کرنے لگے میں صرف عوام کی شکایت نہیں کرتا بلکہ میں علماء و مشائخ کو بھی مجلس آرائی سے منع کرتا ہوں کیونکہ یہ مرض ان میں بھی بہت ہے۔ بعض مشائخ کے یہاں عشاء کے بعد بھی مجلس آرائی ہوتی ہے جس سے خوامخواہ نیند برباد ہوتی ہے اگر شیخ کے معمولات میں اس سے فرق بھی نہ آتا ہو تاہم سب اہل مجلس یکساں نہیں ہوتے ان میں سے بعض صبح کی نماز بھی غائب کر دیتے ہیں پھر یہ بھی نہ ہو تو بلا ضرورت باتیں بنانا ظلمت قلب کا سبب ہے۔ یہی بڑا کافی نقصان ہے۔ گو اور کوئی بھی نقصان نہ ہو خصوص اگر باتیں بھی شیخ کی مدح کی ہوں جو خوشامدی مرید بناتے ہوں بیچارے ممدوح کا تو اُس سے ستیاناس ہو جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

تن قفس شکل ست آنا خارِ جاں　　از فریب داخلان و خارجان

(ترجمہ)

(جسم مثل قفس کے ہے خوشامدی لوگ اس کی تحریک کر کے فریب دیتے ہیں)

۵ اینست گوید اے منم ہمراز تو   آنت گوید اے منم انبار تو
(کوئی کہتا ہے ہم تمھارے ہمراز ہیں کوئی کہتا ہے میں تمہارا ہمراز ہوں)

۵ او چو بیند خلق را سرمست خویش   از تکبر میرود از دست خویش
(جب وہ مخلوق کو اپنی تعریف میں مست دیکھتا ہے تو تکبر کے سبب حواس باختہ اور بے وقوف ہو جاتا ہے)

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ صبر کتنا جامع خُلق ہے مگر لوگ صرف اسی کو صبر سمجھتے ہیں کہ مصیبت کے وقت رویا نہ جاوے حالانکہ شہوت و غضب کو روکنا بھی صبر ہے اور شہوت میں شہوت رجال و نساء، و شہوت لباس و شہوت طعام و شہوت کلام بھی داخل ہے اسی طرح تمام معاصی سے نفس کو روکنا یہ بھی صبر میں داخل ہے۔ نیز طاعات پر پابندی کرنا بھی صبر میں داخل ہے طاعات بجالانے کے وقت ان کے حقوق و آداب کو اطمینان و سکون سے ادا کرنا بھی صبر میں داخل ہے۔ پس یہ ایسا جامع خلق ہے کہ بہت سے اخلاق اس کے اندر داخل ہیں اسی لئے حدیث میں آیا ہے الصبر نصف الایمان اور یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ نے اخلاق میں سے اس جگہ صرف صبر کو بیان فرمایا۔

اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اس آیت میں تمام اجزاء دین بالاجمال مذکور ہیں آگے صبر کے چند مواقع جو مہتم بالشان ہیں بیان فرماتے ہیں فی الباساء والضراء وحین الباس۔ یعنی وہ صبر کرتے ہیں باساء میں اور ضراء میں اور باس کے وقت ان الفاظ کی تفسیر مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ باساء سے فقر و تنگدستی مراد ہے اور ضراء سے بیماری اور باس سے حرب۔ لیکن عموم الفاظ پر نظر کر کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ باساء سے تو فقر و تنگدستی ہی مراد ہو جس کا حاصل یہ ہو گا کہ فقر و تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے مخلوق کے مال و دولت پر نظر نہ کرے نہ ان سے کچھ توقع رکھے اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہو گئی۔ اور ضراء سے مطلق بیماری مراد ہو خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ ظاہری مرض میں تو صبر یہ ہے کہ

لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے خدا سے دل میں مکدر نہ ہو اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہو گئی۔ اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراض قلبیہ کے مقتضا پر عمل نہ کرے ہمت سے ان کا مقابلہ کرے مثلاً کسی میں شہوت بالنساء یا بالرجال کا مرض ہے تو اس کے مقتضا پر عمل نہ کرے اور ہمت کر کے عورتوں اور مردوں کی طرف نگاہ نہ اٹھائے ان سے اختلاط نہ کرے بلکہ بُعد اختیار کرے اسی طرح بخل کا مرض ہو تو اس کے مقتضا پر عمل نہ کرے بتکلف خدا کے راستہ میں مال خرچ کردیا کرے وعلی ہذا تمام امراض کو اسی پر قیاس کرلیا جائے۔ اور بأس سے مراد مطلق شدت و پریشانی ہو تو یہ تعمیم بعد تخصیص کے ہو جائے گی یعنی فقر و فاقہ اور امراض ظاہریہ و باطنیہ میں بھی ہمت سے کام لے اور اسی طرح جو پریشانی بھی لاحق ہو اس میں مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے۔ پس اب صبر کا حاصل یہ ہوا کہ موحد کامل بن جانا چاہیئے جس کی یہ شان ہوتی ہے ؎

موحد چہ برپائے ریزی زرش چہ فولادِ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش بناشد زکس ہمیں ست بُنیادِ توحید و بس

(موحد یعنی اہلِ توحید کے قدموں پر اگر سونا بکھیر دو یا ان کی گردن پر تلوار رکھدو تو بھی نہ کسی سے امید رکھتے ہیں نہ کسی سے خوف رکھتے ہیں اور یہی توحید کی اصل بنیاد ہے)

جب مقامِ صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے: ان تمام اجزاء شریعت کو بیان فرماکر آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں اولئك الذين صدقوا و اولئك هم المتقون ۝ یہی لوگ ہیں جو صادق ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔ یہ جملہ گویا بمنزلہ مہر کے ہے کہ سارا مضمون بیان فرماکر اخیر میں مہر لگادی کہ یہی لوگ صادق و متقی ہیں۔

چونکہ تفصیل سابق سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں جو اوصاف

مذکور ہیں وہ تمام اجزاء دین کو جامع ہیں تو اب جملہ اولٰئک الذین صدقوا و اولٰئک ھم المتقون سے یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہوگیا کہ صادق و متقی کامل فی الدین کو کہتے ہیں اور یہ کہ تقویٰ و صدق کمال فی الدین کا نام ہے لہٰذا آیت مذکورہ میں جو میں نے دعویٰ کیا تھا کہ اتقوا اللّٰہ وکونوا مع الصّٰدقین کے معنی یہ ہیں اکملوا فی الدین وکونوا مع الکاملین۔ یہ دعویٰ بالکل بے غبار ہوگیا اور قرآن ہی سے اس دعویٰ کی تائید مل گئی (اور ظاہر ہے کہ جس تفسیر کی تائید قرآن کی دوسری آیتوں سے ہو جائے وہ زیادہ اولیٰ ہے ۱۲)

معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اے مسلمانوں! دین میں کامل ہو جاؤ جس کا طریقہ بھی آگے بتلاتے ہیں کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاملین کے ساتھ ہو جاؤ۔ صاحبو! جو طریقہ کمال حاصل کرنے کا حق تعالیٰ نے بتلایا ہے واللہ کوئی سالک کوئی محقق ہرگز نہیں بتلا سکتا یہ بات کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ کاملین کی معیت سے بھی کمال حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاملین کی خالی معیت ہی معیت حصول کمال کے لئے کافی ہے ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص سالہا سال کاملین کے ساتھ رہے اور خود کچھ نہ کرے تو اس کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل طریق تو کمال فی الدین حاصل کرنے کا یہ ہے کہ اعمال میں کمال حاصل کرو۔ اعمال میں کمال حاصل کرنا یہ ہے کہ طاعات کو بجالاؤ اور معاصی سے اجتناب کرو۔ چنانچہ آیت لیس البر ان تولوا وجوھکم الخ میں انہی اعمال کو برّ کافی فرمایا ہے اور اُن کو بیان فرما کر ان لوگوں کا متقی اور صادق ہونا بتلایا ہے جو ان اعمال کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس سے اعمال پر مدار کمال ہونا بخوبی ظاہر ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ اعمال میں کیسے کامل ہوں کیونکہ کمال فی الاعمال کی تحصیل میں ایک مانع پیش آتا ہے جو کہ نفس ہے ہر عمل میں اس کا ایک تقاضا مزاحم ہوتا ہے۔ شریعت حکم دیتی ہے کہ جاڑوں میں پانچوں وقت

وضو کرو نفس کی آرام طلبی اس کی مزاحمت کرتی ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ زکوٰۃ سالانہ ادا کرو۔ نفس کا تقاضا ہے کہ بخل اسکی مزاحمت کرتا ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ رشوت اور سود مت لو نفس کا تقاضا ہے کہ حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے، شریعت کا حکم ہے کہ لڑکوں اور نامحرم عورتوں کو بُری نگاہ سے نہ دیکھو تقاضائے شہوت اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ اسی طرح حکم ہے کہ فقر و تنگدستی میں مخلوق کے مال پر نظر نہ کرو تقاضائے حرص اس کی مزاحمت کرتا ہے علیٰ ہذا القیاس جتنے احکام شریعت کے ہیں ہر عمل کے مقابلہ میں اُس کے خلاف نفس کا ایک تقاضا ہے جو اس حکم کی مزاحمت کرتا ہے تو خدا تعالےٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا تو حکم کر دیا اور اس کا طریقہ بھی بتلا دیا کہ اعمال کا جمع کرنا ہے مگر اس نفس کے ان بے شمار تقاضوں کا کیا علاج ہو جو ہر حکم پر عمل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں سو حق تعالےٰ نے کونوا مع الصّٰدِقِین ۝ میں اسی مانع کو مرتفع فرمایا ہے اور نفس کی اس مزاحمت ہی کا علاج بتلایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ طریق حصول کمال فی الدین یعنی تکمیل اعمال ظاہری و باطنی میں جو مزاحمت نفس کی پیش آتی ہے اس معیت صادقین یعنی کاملین میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مزاحمت مرتفع ہو جاتی ہے یعنی نفس میں اس درجہ کا تقاضا نہیں رہتا اور جو کچھ رہتا ہے اُس کی مقاومت سہل ہو جاتی ہے۔ پس اعمال کی تکمیل سہولت سے میسر ہو جاتی ہے اور اسی طرح کمال فی الدین حاصل ہو جاتا ہے دیکھئے کتنا آسان اور سہل علاج ہے گویا دمڑی کا نسخہ اور ہزاروں کا فائدہ ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جڑی بوٹی کا علاج ہے جس میں دھیلہ کا بھی خرچ نہیں اور اس آیت میں جو طریقہ دینی کمال حاصل کرنے کا بتلایا گیا ہے حقیقت میں وہ اصل طریق کمال کے مانع کا مرتفع کرنے والا ہے لیکن چونکہ وہ طریق بدون اس مانع کے مرتفع ہوئے دشوار تھا اس لئے اگر اسی کو طریق کمال کہدیا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ علت نامہ وجوہ شرائط

ارتفع موانع سے مرکب ہوتی ہے اور ان دونوں میں اس میں دخل ہوتا گو وجود معلول کا ان سب سے نہیں ہوتا وجود صرف جزو اخیری سے ہوتا ہے اور جو طریقہ تقاضائے نفس کی مزاحمت کو مضمحل کرنے کا اس آیت میں بتلایا گیا ہے واللہ اس سے سہل علاج کوئی نہیں بتلا سکتا۔ فن شناس لوگوں نے نفس کی اصلاح کے لئے نہ معلوم کیا کیا طریقے تجویز کر رکھے ہیں جن پر عمل کرنا ہمت والے کا کام ہے مگر یہ طریقہ تو ایسا آسان ہے کہ کسی کو بھی اس پر عمل دشوار نہیں اور یہ محض قرآن کا دعوے ہی نہیں بلکہ مشاہدہ سے یہ بات ثابت ہے کہ کاملین کی صحبت میں یہ اثر ہے کہ اُن کے پاس جا کر نفس کا تقاضا مضمحل ہو جاتا ہے کاملین تو بھلا کامل ہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ عام مومنین کے مجمع میں جا کر دیکھو کہ جس وقت سب لوگ نماز کا اہتمام کرتے ہوتے ہیں تو بے نمازی کے دل میں بھی نماز کا تقاضا ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو آخر یہ بھی تو اولیاء اللہ ہیں کیونکہ ولایت کی دو قسمیں ہیں ایک ولایت عامہ دوسری ولایت خاصہ ولایت عامہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اس لئے عام مومنین کی صحبت میں بھی ضرور اثر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کیفما اتفق جمع ہو گئے ہوں چھانٹ چھانٹ کر بدمعاش جمع نہ کئے گئے ہوں۔ لیکن یہ بات سنکر کوئی صاحب تازہ نہ کریں کہ جب عام مسلمان بھی ولی ہیں تو پھر ہم کو کسی اور ولی کی کیا ضرورت ہے ہم کیوں کسی کے پاس جاویں کیونکہ ولایت عامہ سے جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے باغیوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں عام رعایا کو بادشاہ کا دوست اور وفادار کہدیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ باغی اور دشمن نہیں مگر کیا اتنی بات پر کوئی اکتفا کیا کرتا ہے اور کیا اس سے عام رعایا بادشاہ کے مقربین میں داخل ہو گئی ہرگز نہیں کیونکہ رعایا میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو چوری اور بدمعاشی کرنے کی سزا میں قید خانہ بھیجدیا جاتا ہے جہاں روزانہ سنٹو بیدیں

ان کی کمر پر لگائی جاتی ہیں مگر اس حالت میں بھی یہ شخص بہ نسبت باغی کے بادشاہ کا وفادار اور اس کی رعیت ضرور کہلاتا ہے جس کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ کبھی مراحم خسروانہ سے اس کو رہا بھی کر دیا جاتا ہے اور باغی مراحم خسروانہ کا اہل نہیں رہتا۔ تو ولایت عامہ بدون ولایت خاصہ کے ایسی ہی جیسے جیل خانہ کے مجرموں کو باغیوں کے مقابلہ میں بادشاہ سے تعلق ہوا کرتا ہے مگر عاقل محض اتنے تعلق پر کبھی کفایت نہیں کیا کرتا وہ خاص تعلق کے لئے کوشش کیا کرتا ہے چنانچہ میں اسی کو پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد میں درجۂ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے لیکن عام مؤمنین کی صحبت کا اثر بیان کرنے سے میرا مقصود یہ تھا کہ جب ناقصین کی صحبت میں یہ اثر ہے تو خود سمجھ جاؤ کہ کاملین کی صحبت میں کیا کچھ اثر ہوگا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

(وہ جرعہ جو خاک ملا ہوا ہے اس طرح تم کو مست کرتا ہے تو صاف اگر پیو گے تو تمہاری کیا حالت ہوگی یعنی گناہوں کے نیک اعمال کے اثرات جب یہ ہیں تو تقویٰ کے ساتھ کیا اثر محسوس ہوگا۔)

جب خاک آمیز گھونٹ میں اتنی تاثیر ہے تو صاف اور مقطر میں تو نہ معلوم کیسی مستی ہوگی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جس شخص کی رات کو آنکھ نہ کھلتی ہو وہ چند دنوں ایسے لوگوں میں جا کر رہے جو رات کو اٹھتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی تہجد کی عادت ہو جائے گی۔ اسی طرح جس شخص کو ذکر اللہ سے مناسبت نہ ہوتی ہو وہ کچھ دنوں ذاکرین کی جماعت میں رہے بہت جلد ذکر سے مناسبت ہو جائے گی کیونکہ ذاکرین کے حلقہ میں رہ کر خود بخود اندر سے دل تقاضا کرے گا کہ میں بھی ذکر کروں گویا آج ہی سے اس کا وہ تقاضا جو ذکر کے خلاف تھا مضمحل ہو گیا۔ پھر جو لوگ کامل ہیں ان کی صحبت میں تو کیا کچھ نفع ہوگا اس کو خود ہی سمجھ لینا چاہیئے۔ بس ان کی صحبت کا نفع یہ ہے ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد
فی الحال بصورت طلا شد

(وہ لوہا جو پارس پتھر کے ساتھ لگ جاتا ہے فوراً سونا بن جاتا ہے
یعنی اہل اللہ کے ساتھ رہیں تو برُے لوگ بھی اچھے بن جاتے ہیں)

جیسے ایک پتھر مشہور ہے جس کا نام پارس ہے اس کی یہ تاثیر سنی گئی ہے کہ لوہے کو اس سے مس کر دیا جائے تو وہ خالص سونا ہو جاوے یہ خاصیت کاملین کی صحبت میں ہوتی ہے مگر کاملین کی صحبت کے موثر ہونے کی ایک شرط ہے اور اس کے لئے ایک پرہیز بھی ہے۔ پرہیز تو یہ ہے کہ اعمال و افعال وغیرہ میں اس کی مخالفت نہ کرو۔ اور شرط یہ ہے کہ اپنے حالات سے اس کو اطلاع دیتے رہو تمہارے نفس میں جو مرض بھی ہو اس سے صاف صاف کہدو و حیا نہ کرو کیونکہ طبیب اور ڈاکٹر کے سامنے بضرورت علاج بدن مستور کا کھولنا جائز ہے۔ اسی طرح طبیب روحانی سے نفس کے امراض بیان کر دینا جائز ہیں تو ایک مرتبہ اپنا سارا کچا چھٹا اس کے سامنے کھول کر رکھدو اور اس سے مت ڈرو کہ ان کی نظر میں ذلیل ہو جاؤ گے۔ بخدا اہل اللہ کی نظر میں ان سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں وہ اپنے کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ فساق و فجار بھی اپنے کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتے اس سے بالکل مطمئن رہو پھر جب تم اپنا حال بیان کر چکو تو اُس پر وہ کچھ بتلادیں اس کا اتباع کرو یہی طریقہ علاج ظاہری میں بھی آپ کرتے ہیں کہ پہلے آپ اپنا حال طبیب سے ظاہر کرتے ہیں پھر وہ نسخہ تجویز کرتا ہے آپ اس کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ پرہیز بتلاتا ہے اس سے آپ بچتے ہیں۔ یہی طریقہ حضرات کاملین کی صحبت میں اختیار کرنا چاہیئے۔ بھلا اگر کوئی شخص طبیب کے پاس روزانہ محض ملاقات کے طور پر چلا جایا کرے نہ اس سے اپنا حال کہے نہ نسخہ پوچھے تو کیا اس طرح وہ مرض سے شفا پا سکتا ہے ہرگز نہیں اسی طرح اولیاء کی صحبت میں محض زیارت و ملاقات کی نیت سے جانا

امراض باطنیہ سے شفا حاصل ہونے میں کافی نہیں گو ان کی زیارت بھی موجب ثواب ہے یہ الگ بات ہے۔ مگر اس وقت محض ثواب حاصل کرنے سے گفتگو نہیں ثواب کے لئے تو اور بھی بہت سے کام ہیں یہاں تو کمال دین حاصل کرنے سے بحث ہو رہی ہے تو اولیاء کاملین سے کمال دین اسی طرح حاصل ہوگا جیسا کہ میں نے بیان کیا اس کا ہمیشہ لحاظ رکھو اور جب ان کے پاس جاؤ یا خط لکھو تو اس کا قصد کرو کہ اُن کے سامنے نفس کے امراض بیان کریں گے اور جو وہ بتلا دیں گے اس پر عمل کریں گے۔ پس اولیاء کاملین کے پاس رہنے کی صورت میں بھی عمل کرنا آپ ہی کو پڑے گا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم کچھ نہ کرو اور کامل بن جاؤ مگر اتنا فرق ہوگا کہ پہلے تم عمل کا قصد کرتے تھے اور اس کے خلاف تقاضا پیدا ہوتا تھا اور ان کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا تقاضا پیدا ہوگا اور دوسرا تقاضا مضمحل ہو جائے گا تو کیا یہ تھوڑا نفع ہے کہ جس کام کا کرنا پہلے مشکل تھا آج آسان ہو گیا اور صرف آسان ہی نہیں بلکہ اس کی طرف دل کو از خود تقاضا ہونے لگا کہ اس کے بغیر تم کو چین نہیں ملتا۔ صاحبو! یہ بہت بڑا نفع ہے اس کو کم مت سمجھو کاملین کی صحبت میں جا کر بس یہ بات پیدا ہوتی ہے جو اُن سے دور رہ کر نہیں پیدا ہوتی جن لوگوں کو کاملین سے تعلق نہیں وہ متقی ہوسکتے ہیں مگر بڑی مصیبت کے ساتھ ان کو تقویٰ حاصل ہوگا اور جن کو ان سے تعلق ہے ان کو بہت آسانی اور راحت سے تقویٰ حاصل ہو جاتا ہے یہ تو ان کی صحبت کا ادنیٰ اثر ہے کہ اعمال میں سہولت ہو جاتی ہے اس کے بعد نور فہم اور معرفت اور احوال وکیفیات کی سلامتی مقامات باطنیہ کی ترقی حاصل ہوتی ہے اس کی تو کچھ انتہا نہیں پس یہ مضمون اس آیت کے متعلق مجھ کو بیان کرنا تھا جس کو میں بیان کر چکا اور اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ گو میں نے آج کوئی نیا مضمون نہیں بیان کیا مگر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے آج خدا تک پہونچنے کا سیدھا رستہ آپ کو بتلا دیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ میں نے سب کو واصل کر دیا ہے کیونکہ وصول کا آسان طریق بتلا دینا یہ بھی واصل کر دیتا ہے اور آج میں نے

ایسا آسان راستہ آپ کو بتلا دیا ہے جو شاید کبھی کان میں نہ پڑا ہوگا اب بھی اگر قدم نہ اٹھاؤ اور واصل بننے کی کوشش نہ کرو تو حجّت الٰہیّہ ختم ہو چکی ہے۔ اب میں اس آیت کے متعلق ایک دو بات مختصر طور پر بیان کر کے تقریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں ایک بات یہ جاننے کی ہے اور اجمالاً پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس آیت میں صدق سے مراد محض زبان سے سچ بولنا نہیں ہے کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جس صدق کو کمال دین بتلایا ہے وہ تو ہم کو حاصل ہے کیونکہ ہم سچ بولتے ہیں۔ پس سمجھ لیجئے کہ صدق کے معنی پختگی کے ہیں اور اسی سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال وافعال واقوال میں مرتبہ رسوخ حاصل کر چکتا ہے۔ صدق کے معنی جو اصطلاح لغاۃ و بلغاء میں بیان کئے گئے ہیں مطابقۃ الخبر للمحکی عنہ یہ معنی اصطلاح شرعی سے خاص ہیں شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی اقوال کو بھی احوال کو بھی۔ اقوال کا صدق تو یہی ہے کہ بات پکّی ہو یعنی واقعہ کے مطابق ہو کچی بات نہ ہو جو کہ واقع کے خلاف ہو جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو حکم شرعی کے خلاف نہ ہو۔ پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اوس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔ اور احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنّت کے موافق ہوں پس جو احوال خلاف سنّت ہوں وہ احوال کاذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال وکیفیات سنّت کے موافق ہوتے ہوں اُس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔ نیز صدق احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا جیسا کہ بعض لوگوں کو کسی وقت خوف کا یا توکل کا غلبہ اپنے اوپر معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا اس کو صادق الاحوال نہ کہیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہیئے کہ جو حالت طاری ہو بعد میں وہ مقام ہو جائے اس میں سالکین کو بہت دھوکہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ محض وہم

سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو تسلیم و رضا یا توکل و رجا کا حال حاصل ہے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا جس سے اس حالت کا ان کا وہم ہونا ظاہر ہو جاتا ہے غرض صدق شریعت میں صرف اقوال کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس سمجھنے سے اغلاط میں ابتلا ہو جاتا ہے اسی کو امام غزالی نے لکھا ہے کہ منجملہ احداثات کے ایک یہ بھی احداث ہے کہ لوگوں نے اصطلاحاتِ شرعیہ کو بدل دیا ہے جیسے فقہ نام رکھا ہے کنز و ہدایہ کے پڑھ لینے کا حالانکہ فقہ شریعت میں محض کتاب پڑھ لینے کا نام نہیں بلکہ وہ ایک خاص فہم ہے جس سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے احکام کے سمجھنے کا۔ نیز سلف صالحین فقیہ ایسے کو کہتے تھے جس کو احکام کی فہم کے ساتھ عمل کامل بھی حاصل ہو مگر آجکل فقہ کے لئے عمل کو ضروری نہیں سمجھا جاتا اسی طرح بہت سے الفاظ شرعیہ کو شرعی اصطلاح سے بدل دیا گیا ہے مثلاً شریعت میں علم مخصوص ہے علوم نقلیہ شرعیہ کے ساتھ مگر آج کل بعض لوگوں نے اس کو عام کر دیا ہے۔ نیچری فرقہ اس مرض میں زیادہ مبتلا ہے انھوں نے علم میں سائنس اور جغرافیہ کو بھی ٹھونس دیا ہے انگریزی زبان سیکھنے کو بھی وہ علم میں داخل کرتے ہیں چنانچہ میں نے بعض تحریریں ایسی دیکھی ہیں جن میں علم کی فضیلت احادیث سے ثابت کر کے اس پر انگریزی تعلیم اور سائنس وغیرہ کی تحصیل کو متفرع کیا ہے وہ اپنی تحریروں میں سائنس وغیرہ کی ترغیب دیتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں اطلبوا العلم ولو بالصین سے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جس علم کی ترغیب دی گئی ہے ان میں یہ علم بھی داخل ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے یا امر کیا گیا ہے وہاں صرف علوم نقلیہ شرعیہ مراد ہیں جن میں اصل الاصول علم فقہ علم حدیث و علم قرآن ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے مقدمات کو بحکم مقدمۃ الواجب واجب اصول کے ساتھ ملحق کر دیا جائے مگر سائنس و جغرافیہ تو ان علوم کے لئے مقدمات بھی نہیں ان کو کس دلیل سے علم شرعی میں داخل کیا جاتا ہے اور ان پر احادیث سے

استدلال کس طرح صحیح ہوسکتا ہے یہ سخت مغالطہ ہے جس کی طرف بہت کم لوگوں کو التفات ہے یہی حال اصطلاح صدق میں ہو رہا ہے کہ لوگوں نے اس کو محض اقوال کے ساتھ خاص کرلیا ہے حالانکہ شرعًا وہ افعال و احوال سب کو عام ہے خوب سمجھ لو۔

اب ایک بات یہ رہ گئی کہ جب تقوٰی اور صدق دونوں کا کمال دین ہونا ثابت ہوگیا تو سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقوٰی کا ذکر مقدم اور صدق کو مؤخر کیوں کیا گیا کیونکہ آیت کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہوسکتا ہے کہ یوں فرما دیتے یا ایہا الذین اٰمنوا اصدقوا وکونوا مع المتقین اس کے بھی وہی معنی ہوئے کہ اے مسلمانو دین کامل حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو۔ جب یہ مضمون صدق کو مقدم اور تقوٰی کو مؤخر کرنے سے بھی حاصل ہوسکتا تھا تو پھر تقوٰی کو مقدم کیوں کیا گیا۔ یہ سوال میرے ذہن میں اسی وقت آیا ہے اس سے پہلے یہ سوال ذہن میں نہ تھا اس کا جواب بھی الحمد للہ اسی وقت ذہن میں آیا ہے اس کو بیان کرتا ہوں اگر کسی کے ذہن میں اس سے اچھا جواب ہو وہ اس کو بیان کردے میرے نزدیک اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کے تتبع سے تقوٰی کے تو درجات چند در چند معلوم ہوتے ہیں اور صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے جس کی دلیل یہ آیت ہے لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جناحٌ فیما طعموا اذا ما اتقوا واٰمنوا وعملوا الصالحات ثم اتقوا واٰمنوا ثم اتقوا واحسنوا واللہ یحب المحسنین ۝ شان نزول آیت کا یہ ہے کہ جب حق تعالٰی نے شراب کو مسلمانوں پر حرام کردیا تو بعض صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ہم میں جو لوگ تحریم سے پہلے شراب پیتے تھے مرگئے ہیں کہیں ان کو گناہ نہ ہوا ہو۔ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس وقت تک شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی تو انھوں نے حرام کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا پھر صحابہ کو ان پر گناہ کا وہم کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے

کہ اتنی بات تو صحابہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت حرمت خمر کا نزول نہ ہوا تھا لیکن ممکن ہے کہ ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ نہ معلوم اس وقت تک جو شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ ہے کہ شراب اب تک واقع میں حلال تھی یا یہ سبب یہ ہے کہ واقع میں تو وہ پہلے بھی حرام تھی لیکن چونکہ ہم لوگ اس کے عادی بہت زیادہ تھے تو دفعۃً اس کی تحریم اس وجہ سے نازل نہیں کی گئی کہ ہم اس پر عمل نہ کر سکیں گے پھر تدریجاً جب ہمارے اندر قابلیت عمل زیادہ ہوگئی اس وقت حکم تحریم نازل ہوگیا۔ پس صورت اول میں تو جن لوگوں نے تحریم سے پہلے شراب پی تھی انھوں نے حلال کا ارتکاب کیا لیکن دوسری صورت میں حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے گو بوجہ نص نازل نہ ہونے کے ان کو گناہ نہ ہوا ہو۔ لیکن شاید اُن کے درجات میں کچھ کمی اس لئے ہوگئی کہ وہ حرام فی نفسہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں ۱۲ جامع)

اس شبہ کا ازالہ حق تعالےٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اِس چیز میں جو انھوں نے (اب تک) کھایا پیا ہے (یعنے حکم تحریم سے پہلے شراب پینے میں تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہوا) جبکہ وہ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور نیک اعمال کرتے رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور اخلاص سے کام لیتے رہے ہوں اور اللہ تعالےٰ اہل اخلاص سے محبت رکھتے ہیں اس جگہ اصل مقصود تو یہ بتلانا تھا کہ نزول تحریم سے پہلے جن لوگوں نے شراب پی ہے ان پر اس فعل کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔ لیکن لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات جناحٌ فیما طعموا سے چونکہ بظاہر گناہ کی نفی مطلقاً ہو رہی ہے اس لئے آگے قاعدہ کلیہ کے طور پر وہ شرائط بھی بیان فرمادیں جن کے اجتماع کے بعد گناہ کی نفی مطلقاً صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ اگر کسی شخص نے

تحریم خمر سے پہلے شراب بھی پی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو یہ گناہ تو صحیح ہے کہ شراب کی وجہ سے اس کو گناہ نہیں ہوا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو کچھ بھی گناہ نہیں ہوا۔

پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جب وہ لوگ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں جن کی حرمت اس وقت نازل ہو چکی تھی۔ نیز ان اعمال صالحہ کو بھی بجا لاتے رہے ہوں جن کا امر اس وقت نازل ہو چکا تھا تو پھر ان کو شراب پینے کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔ اب اس جگہ ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ جب ان کو ایک بار مومن کہدیا گیا اور اس کے بعد تقویٰ سے ان کو موصوف کر دیا گیا تو پھر دوبارہ آمنوا واتقوا کے ذکر سے کیا مقصود ہے یہ ایمان کے بعد ایمان لانا اور تقویٰ کے بعد پھر تقویٰ کرنا کیسا ہے تکرار ایمان کا جواب تو یہ ہے کہ ایمان کے مختلف مراتب ہیں۔ ایک مرتبہ ایمان کا یہ ہے کہ شرک و کفر سے توبہ کرلے یہ درجہ تو ایمان کا وہ ہے جو صحت کے لئے شرط ہے کہ اس کے بغیر کوئی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا اور ایک مرتبہ ایمان کا وہ ہے جو اعمال صالحہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس کے دل میں پیوستہ اور جاگزیں ہوجانا اور اس پر ثبات و استقامت حاصل ہونا دوبارہ لفظ آمنوا میں اس درجہ کی طرف اشارہ ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایمان لا کر وہ اعمال صالحہ کرتے رہے اور محرمات سے بچتے رہے تو اس سے ان کو ایمان پر مداومت و استقامت حاصل ہوئی پھر اس کے بعد جیسے اعمال ہوتے ہیں ویسا ہی ایمان ان سے پیدا ہوتا ہے مطلق مداومت و ثبات علے الایمان کہ اعمال صالحہ کے ہمیشہ بجا لانے سے ہر شخص کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس شخص کے اعمال ناقص ہیں ان سے جو ایمان پیدا ہوگا وہ بھی ناقص ہوگا اور جس کے اعمال کامل ہیں ان سے کامل ایمان پیدا ہوگا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ)

تیسری مرتبہ ذکر ایمان سے اس درجہ کی طرف اشارہ ہے کہ بعد ثبات علی الایمان کے حسب اعمال ان کو ایمان میں ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے اس کے بعد پھر ایمان کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ احسان کا ذکر فرمایا جس کے معنی شریعت میں اخلاص کے ہیں اور یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اسی کو صدق سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور صدیق بھی صاحبِ احسان ہی کو بولتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ اس کے بعد ترقیٔ اعمال سے درجہ احسان کا عطا ہوتا ہے اور یہی درجہ ایمان کا مطلوب ہے اور جو شخص اس درجہ میں فائز ہوتا ہے وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے پھر اس کو کچھ عذاب اور گناہ نہیں ہوتا کیونکہ محبوب مطیع کو کوئی بھی عذاب نہیں دیا کرتا۔ یہ جواب تو تکرار ایمان کے اشکال کا ہوا اور اسی سے تکرار تقویٰ کا جواب بھی نکل آیا وہ یہ کہ تقویٰ کے بھی مدارج مختلف ہیں۔ ایک تقویٰ تو یہ ہے کہ کفر و شرک سے بچے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے پھر جیسے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا حتیٰ کہ درجہ احسان جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے وہی تقوے کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ پس اس آیت سے تقوے کے مراتب کا چند در چند ہونا معلوم ہو گیا اور صدق میں ایسے مدارج کی کوئی دلیل نہیں اور آیت براہیں اولئك الذين صدقوا دال ہے صدق کے خاص ہونے پر انتہائی درجہ کے ساتھ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے جس کو میں نے ابھی بتلایا ہے کہ احسان ہی کا دوسرا نام شریعت میں صدق و اخلاص ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھو کہ اگر حق تعالیٰ اس طرح فرماتے۔ یاایہاالذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّٰدِقِیْنَ تو سامعین کے دل پر ایک پتھر سا رکھا جاتا وہ یہ سمجھتے کہ ہم کو اول ہی دن میں کامل بن جانے کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ شروع ہی سے کامل بننا دشوار ہے اس لئے اول صدق کو بیان نہیں فرمایا بلکہ تقویٰ کا ذکر مقدم کیا کیونکہ اس کے درجات مختلف ہیں تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے گا کہ اول ہی دن میں کامل بننے کا حکم ہے بلکہ سامعین سمجھ لیں گے کہ تقویٰ کے درجات بہت ہیں مطلب یہ ہے کہ تدریجاً یکے بعد دیگرے تقوی کے تمام درجات حاصل کرتے رہو۔ یہاں تک کہ تم درجۂ صدق میں پہونچکر صادقین اور کاملین کے ساتھ مل جاؤ گے جس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ظاہر میں ان کی صحبت اختیار کرو پھر باطناً بھی اُن جیسے ہو جاؤ گے اور درجات تقویٰ کا مختلف ہوتا آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم کے شانِ نزول سے بھی واضح ہوتا

ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اول فاتقوا اللہ حق تقاتہ کا نزول ہوا تھا صحابہؓ اس سے ڈر گئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی سے حق تقوے لازم ہوگیا۔ حالانکہ شروع ہی سے حق تقوے کا حصول دشوار ہے حق تقوی کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جیسا تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے وہ اختیار کرو۔ اتقوا اللہ حق تقاتہ میں یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور اس کی تکلیف تکلیف مالا یطاق ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجالاؤ۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور گو یہ تقویٰ طاقت سے خارج نہیں کیونکہ اس کا مکلف کیا جانا دلیل ہے اس کے تحت الاختیار ہونے کی لیکن ابتداہی سے انسان کا اس درجہ میں پہونچ جانا دشوار ضرور ہے گو ممتنع نہیں۔ صحابہؓ کے خوف کا یہی سبب تھا پس وہ اس لئے خائف ہوئے کہ یہ درجہ گو اختیار سے باہر نہیں مگر عادۃً پہلے ہی دن اس کا حاصل ہو جانا دشوار ہے اور وہ صیغہ امر فاتقوا اللہ سے یہ سمجھے کہ ہم کو اس وقت اس درجہ کی تحصیل کا امر ہو رہا ہے نہ اس لئے کہ صیغہ امر فور کو مقتضی ہے بلکہ اس لئے کہ محاورات میں بسا اوقات امر فور کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے اور صحابہ کی نظر ہمیشہ اسی جانب جاتی تھی جس میں احتیاط ہو اس لئے انھوں نے امر فور پر محمول کیا۔ اگر یہ خطاب ہم لوگوں کو ہوتا تو ہم کو کچھ بھی اندیشہ نہ ہوتا کیونکہ ہم تاویل کر لیتے کہ امر فور کو مقتضی تھوڑا ہی ہے پس حق تقوی کا امر اسی وقت دفعۃً نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تدریجاً حاصل کرتے رہنا یہ مطلب صحابہ کے ذہن میں بھی ضرور آیا ہوگا۔ مگر انھوں نے غایت خشیت واحتیاط کی وجہ سے اس کو فور پر محمول کیا کیونکہ احتمال تو یہ بھی تھا۔ چنانچہ محاورات میں کثرت سے امر کا استعمال فور کے لئے ہوتا ہے جس کا پتہ قرینہ مقام سے چل جاتا ہے آپ اگر اپنے کسی نوکر سے پانی مانگیں اور وہ اگلے دن لاکر پلاوے تو کیا آپ خفا نہ ہوں گے ضرور خفا ہوں گے اور اس کے جواب میں نوکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور نے تو اتنا فرمایا تھا کہ پانی لاؤ یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ ابھی لاؤ کیونکہ قرینہ مقام سے اس امر کا فور کے لئے ہونا متعین ہو چکا تھا اور اسی طرح اکثر صیغہ امر کا استعمال فور ہی میں ہوتا ہے گو کبھی عدم فور کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہمارے یہاں ایک حافظ صاحب تھے جن کا لقب حافظ جنازہ تھا وہ ایک گاؤں میں

مسجد کے امام تھے وہاں کوئی مرگیا تو لوگ اس کا جنازہ مسجد میں لائے اور حافظ جی سے کہا کہ اس کی نماز پڑھا دو تو آپ نے یہ عذر کیا کہ مجھے اس وقت ایک دعا میں کچھ شبہ ہے اس کو یاد کرلوں پھر پڑھاؤں گا، لوگ جنازہ لے گئے اور کسی دوسرے سے نماز پڑھوا کر دفن کر دیا اگلے دن حافظ جنازہ صاحب نے گاؤں والوں سے کہا کہ بھائی مجھے اب دعا یاد ہوگئی ہے لاؤ اب جنازہ لے آؤ لوگ ہنسنے لگے کہ سبحان اللہ آپ کی دعا کے بھروسہ اب تک ہم اس کا اچار ڈالے رکھتے ہم نے تو اس کو دفن بھی کر دیا۔ تو دیکھئے فور و عدم فور میں فرق نہ کرنے سے لوگوں نے ان کو بیوقوف بنایا یہاں تک کہ ان کا لقب ساری عمر کیلئے حافظ جنازہ ہی پڑ گیا تو صحابہؓ نے اس آیت کو بمعنی فور سمجھا اور پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ حق تقوےٰ کا آج ہی حاصل کرنا تو بڑا دشوار ہے پھر اس حکم کی تعمیل کیونکر ہو۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی فاتقوا اللہ ما استطعتم یعنی یہ مطلب نہیں کہ حق تقویٰ آج ہی حاصل کرلو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہوسکتا ہے۔ اس وقت تو اس کو اختیار کرو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جاوے۔ اس تقریر پر شاید طلبہ کو یہ اشکال ہو کہ تمہاری تقریر سے تو اتقوا اللہ حق تقاتہ کا بھی مامور بہ ہونا معلوم ہوتا ہے حالانکہ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد اتقوا اللہ ما استطعتم نازل ہوئی اور اس نے پہلی آیت اتقوا اللہ حق تقاتہ کو منسوخ کر دیا سو طلبہ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ کے معنی یہاں تبدیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر وغیرہ پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں اس پر تنبیہ کی ہے واقعی بہت لطیف بات ہے خدا ان کو جزائے خیر دے۔ پس حدیث میں جو اتقوا اللہ ما استطعتم کو ناسخ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کر دی بیان تفسیر کو نسخ سے تعبیر کر دیا گیا۔ ورنہ فاتقوا اللہ حق تقاتہ کے معنی میں نے بیان کئے ہیں وہ ہرگز قابل تبدیل و نسخ نہیں ہیں اور ایک بات طلبہ کو یہ بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ اتقوا اللہ ما استطعتم میں استطاعت باعتبار کمیت کے مراد نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ جتنے اعمال بجا لا سکو اور جتنے محرمات سے بچ سکو بس انہی کے تم مکلف ہو یہ معنی بالکل غلط ہیں کیونکہ تمام واجبات و فرائض کا بجا لانا اور تمام محرمات سے بچنا ہر شخص پر ہر وقت واجب ہے اور سب لوگ اس وقت ان کے مکلف ہیں اور ان میں سے کوئی کام بھی استطاعت سے باہر نہیں

اس لئے کمیت کے اعتبار سے ما استطعتم کی قید کا لغو ہونا لازم آئے گا بلکہ یہ قید کیفیت کے اعتبار سے ہے یعنی اعمال شرعیہ میں جس کیفیت کا تقویٰ تم اس وقت حاصل کر سکو اس کو تو ابھی بجا لاؤ اور باقی کیفیات کے حصول کی کوشش کرتے رہو پس اس سے تقویٰ کے درجات کا کیفیت کے اعتبار سے متفاوت ہونا معلوم ہوتا ہے نہ کمیت کے اعتبار سے خوب سمجھ لو اب یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ اس آیت میں صدق کا موخر کرنا اور تقویٰ کا مقدم کرنا ہی مناسب تھا کہ اس سے سامعین کی طبیعت پر بوجھ نہیں ہوا بلکہ ہمت بلند ہوگئی کہ ہم کو تدریجاً تقوے کے مراتب حاصل کرکے کمال تقویٰ تک پہنچنا چاہیئے۔

بس اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کمال دین مطلوب ہے۔ ہم کو اپنی ناقص حالت پر قناعت نہ کرنی چاہیئے بلکہ کمال دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال کو کامل کیا جائے۔ فرائض و واجبات کے بجالانے میں کوتاہی نہ ہو، محرمات کا ارتکاب نہ ہو اور اعمال کے کامل کرنے میں جو نفس کی مزاحمت مانع ہوتی ہے اس کا علاج کاملین کی صحبت اختیار کرنا ہے ان کے پاس جانا چاہیئے اور جا نہ سکے تو ان سے خط و کتابت کا تعلق رکھا جائے جس میں فضول قصے نہ لکھیں بلکہ اپنے کو مریض اور ان کو طبیب سمجھ کر اپنے حالات سے ان کو اطلاع کرتے رہیں۔ پھر اس کے بعد جو کچھ وہ بتلا دیں اس پر عمل کریں اور ان کے احکام کا اتباع کریں۔ بس یہ راستہ ہے خدا تک پہونچنے کا۔ جس سے زیادہ آسان راستہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔

مجلس ختم ہوچکی ہے اب دعا کیجئے حق تعالیٰ شانہٗ ہم کو فہم سلیم اور عمل مستقیم عطا فرماویں۔ آمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلے اللہ

علیٰ سیدنا محمد و علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین)

البیان المشید عکسی جلد | از حضرت شیخ احمد کبیر رفاعی قدس سرہٗ یہ وہ ہستی ہیں کہ آپ نے روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر عرض کیا کہ آپ اپنا مبارک ہاتھ دیجئے کہ میں اسے بوسہ دیکر سعادت حاصل کروں، اسی وقت روضۂ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے دست مبارک چمکتا ہوا نکلا اور آپ نے اسے بوسہ دیا اس کتاب کے ترجمہ سے حضرت حکیم الامت کو بے حد خوشی ہوئی تھی اس کا مطالعہ مبتدیان سلوک کے لئے بہت مفید اور نافع ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ روزانہ بطور ورد کے پڑھا جائے یہ معرفت و حقیقت کا نایاب خزانہ ہے۔ امید ہے کہ برادران اسلام عموماً اور برادران سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ خصوصاً اس کی قدر فرمائیں۔ قیمت ۳۰ روپے علاوہ خرچ ڈاک

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تھانوی۔ بندر روڈ کراچی مل

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً
(رواہ البخاری)

الوعظ المسمّٰی بہ

التحصیل والتسہیل

مع

التکمیل والتعدیل

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ـــ دفتر الابقاء
مسافرخانہ بندر روڈ / ایم۔اے جناح روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

الوعظ المسمّٰی بہ

التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من ای شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت پر ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون ہوا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	آخر جمعہ من رمضان ۲۲ سنہ ۱۳۴۲	۳ گھنٹہ اور وقت ضبط چار گھنٹہ	جالسا علی الکرسی	بوجہ اجتماع کثیر مشتاقان بیان کے	آجکل عام طور پر اہل سلوک سہولت کے طالب ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنی قوت اختیاریہ سے کام لینا چاہئے اور امانت الٰہیہ کو برباد کرتے ہیں پس خود سہولت کے طالب نہ بنو بلکہ اختیار سے کام لو پھر اس کا بیان کہ اعمال رمضان کو سہولت لاعات میں دخل عظیم ہے۔	طبقہ سالکین کو خصوصاً	ظفر احمد عفا اللہ عنہ وغفر لوالدیہ ورضی عن مشائخہ	۳۰۰ تقریباً	

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتاً من انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ اصابھا وابل فاٰتت اکلھا ضعفین ؕ فان لم یصبھا وابل فطل واللہ بما تعملون بصیر ط۔ جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے غالباً موقع و وقت کے لحاظ سے وہ سامعین کو غیر مرتبط معلوم ہوئی ہوگی کیونکہ اس میں احکام رمضان کا پتہ بھی نہیں مگر مجھے جزئیات سے زیادہ کلیات کا اہتمام ہے کیونکہ کلیات سننے میں کم آتے ہیں اور جزئیات کو اکثر لوگ بیان کرتے رہتے ہیں دوسرے کلیات جامع بھی ہوتے ہیں جزئیات کو اور ان کا یاد رکھنا بہت سے جزئیات کو یاد رکھنے سے مغنی ہوتا ہے اس وجہ سے میں نے اس وقت

ایک مضمون کلی اختیار کیا ہے جو کلیت وعموم کی وجہ سے احکام رمضان کو بھی شامل ہے چنانچہ تقریر سے معلوم ہو جائیگا کہ اس مضمون کو ہر عمل سے تعلق ہے اور روایات حدیثیہ کو بھی ملا لیا جائے تو اس آیت کا تعلق احکام رمضان سے اور زیادہ معلوم ہوگا نہ اس لئے کہ اس میں انفاق کا ثواب مذکور ہے اور رمضان میں انفاق کا ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ دوسری وجہ[1] سے جس کو میں آخر بیان کرونگا گو انفاق کو بھی اس مہینہ سے خاص خصوصیت ہے اور یہ بھی رمضان کی ساتھ اس آیت کی مناسبت کی وجہ ہو سکتی ہے اس لئے حدیث میں اس کو شهر المواساة کہا گیا ہے جس کا استعمال اکثر اعانات[2] مالیہ میں ہوتا ہے یعنی اس مہینہ میں باہم ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا چاہیئے۔ نیز اس مہینہ میں تضاعف حسنات ہوتا ہے جو انفاق وصلوٰۃ سب کو عام ہے تو ایک تعلق عام اس آیت کا رمضان سے یہ بھی ہے یعنی اس مہینہ میں فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ہے اور نفل کا ثواب فرض کے برابر ہے مگر اس تضاعف حسنات کے معاملہ میں لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہیں جسکو میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے مگر شاید بعض لوگ اس وقت حاضر نہ ہوں اس لئے دوبارہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض حضرات نے یہ سنکر کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اس سے یہ اثر لیا کہ رمضان کے لئے طاعات صدقہ کو ملتوی اور مؤخر کرنے لگے۔ زکوٰۃ تو عموماً اسی مہینہ میں ادا کی جاتی ہے گو وجوب زکوٰۃ اس سے پہلے ہو گیا ہو اور اس کے سوا بھی دیگر صدقات کو اس ماہ پر موقوف رکھا جاتا ہے۔ یہ غلطی ہے جس کا منشا مقصد نصوص سے بُعد ہے اور مقصد نصوص کا سمجھ لینا ہی فقہ ہے جس کی فضیلت حدیث میں یوں آئی ہے من یرد اللہ بہ خیرًا یفقھہ فی الدین جس کی بنا پر علماء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت حق کیا ہے بجز فقیہ کے کہ اس کو معلوم ہے کہ خدا نے اس کی ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے بوجہ اس حدیث کے تو یہ فضیلت محض اس بات سے حاصل نہیں ہوئی کہ حدیث وقرآن کا ترجمہ جان لیا جائے اور کچھ علمی نکات بیان کر دیئے جائیں بلکہ یہ فضیلت اس سے حاصل ہوتی ہے کہ شارع کا مقصد سمجھ لیا جائے اسی کا نام فقہ ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں ہمارے اکابر سلف ممتاز تھے گو وسعت نظر میں متاخرین بڑھے ہوئے ہیں مگر عمق نظر میں متقدمین

---

[1] جس مقام پر بالکل ختم کے قریب یہ حدیث مذکور ہے من سلم لہ رمضان الخ ۱۲ [2] کذا التفہیم من القاموس مادہ اسا ۱۲ منہ

بدرجہا افضل ہیں یہاں تک کہ صحابہؓ کی نظر سب سے زیادہ عمیق ہے ان سے بڑھ کر شارع کے مقصد کو کون سمجھ سکتا ہے ان کی برابر نورِ ایمان وتقویٰ کس کو نصیب ہے، اور علوم قرآنیہ میں عمقِ نظر اسی نور کی برکت سے حاصل ہوتا ہے اس مضمون پر کسی کو اس حدیث سے شبہہ نہ ہو۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایّ الخلق اعجب الیکم ایمانًا قالوا الملٰئکۃ الیٰ آخر الحدیث یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ایک دن دریافت فرمایا کہ بتلاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے صحابہؓ نے عرض کیا فرشتوں کا آپؐ نے فرمایا کہ فرشتوں کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو ہر وقت اپنے رب کے قرب میں ہیں صحابہؓ نے عرض کیا پھر انبیاءؑ کا فرمایا ان کے ایمان نہ لانے کی کیا وجہ وہ تو وحی کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں صحابہؓ نے عرض کیا پھر ہمارا ایمان عجیب تر ہے فرمایا تمہارے ایمان نہ لانے کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے میں تمہارے درمیان موجود ہوں یعنی تم نے مجھے دیکھا نزولِ وحی کو دیکھا میرے معجزات دیکھے پھر آپ نے فرمایا ان لوگوں کا ایمان عجیب تر ہے جو میرے بعد آئیں گے اور صرف چند اوراق دیکھیں گے جن میں قرآن ہوگا اور اُن پر ایمان لائیں گے تو اس سے یہ وسوسہ نہ ہو کہ تم صحابہؓ کو متاخرین سے افضل بتلاتے ہو اور اس حدیث کی رو سے صحابہؓ سے متاخرین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلوں کے ایمان کو اعجب ہی تو فرمایا ہے اکمل واقوی وافضل تو نہیں فرمایا اور اعجب ہونے سے اکمل وافضل ہونا لازم نہیں آتا۔

پس اس حدیث کی بنا پر یہ مسلّم کہ متاخرین کا ایمان سب سے عجیب تر ہے مگر صحابہؓ کے ایمان سے افضل واقوی نہیں کیونکہ دوسرے دلائل سے یہ طے ہو چکا ہے کہ سب سے زیادہ کامل ایمان انبیاءؑ علیہم السلام کا ہے پھر ملائکہ کا پھر صحابہؓ کا پھر جو صحابہؓ کے مشابہ ہو اسی طرح ہر زمانہ میں دیکھتے جاؤ جو شخص صحابہؓ کے ساتھ اخلاق وعادات وطرزِ معاملات میں مشابہ تر ہوگا اسکا ایمان قوی تر ہوگا۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ اعجب ہونا قوی واکمل ہونے کو مستلزم نہیں اس کی ایک نظیر میرے پاس ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا حق تعالیٰ کا علیم وقدیر وسمیع ہونا عجیب ہے ہرگز نہیں بلکہ انسان کا علیم وحکیم ہونا عجیب ہے کیونکہ حادث ممکن کا صفات کمالیہ سے متصف

: رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ کذا فی المشکوۃ ۱۲

ہونا واقعی تعجب کی بات ہے اور واجب قدیم کا صفات کمال سے موصوف ہونا کیا عجیب ہے وہ بھی صفات کمال سے موصوف نہ ہوتو اور کون ہوگا مگر انسان کے علم وحکمت کے اعجب ہونے سے اس کے علم وحکمت کا اکمل ہونا لازم نہیں بلکہ اکمل و افضل واقوی اللہ تعالیٰ ہی کا علم وحکمت ہے یہ گفتگو درمیان میں ایک شبہ کے رفع کرنے کو شروع ہوگئی تھی کہ حضرات صحابہ کے ایمان کی قوت وفضیلت پر حدیث ا الخلق اعجب ایماناً سے شبہ نہ کیا جاوے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مقاصد نصوص کا سمجھنا فقہ ہے جس میں حق تعالےٰ نے متقدمین کو فضیلت دی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ وغیرہ اسی عمق فہم کی وجہ سے امام ہیں اس خاص صفت میں ائمہ مجتہدین سب ممتاز ہیں اور کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا رہا یہ کہ پھر باہم مجتہدین میں کون افضل ہیں سو اس کے بیان کرنے کو ہمارا منہ نہیں، ہم اس قابل نہیں کہ فقہاء میں تفاضل کریں کیونکہ اول تو ہمارا یہ درجہ نہیں دوسرے ہمارے اندر احتیاط نہیں ہم تفاضل کے وقت دوسرے کی تنقیص کر دیتے ہیں اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جڑ ہی کاٹ دی۔ فرماتے ہیں لا تفضلوا بین الانبیاء کہ انبیاء علیہم السلام میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ اور فرماتے ہیں لا ینبغی لعبد ان یقول انی خیر من یونس ابن متی اس میں انا سے مراد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہر متکلم مراد نہیں (کما قیل ۱۲) یعنی کسی کو میری نسبت یہ کہنا لائق نہیں کہ میں یونس علیہ السلام سے افضل ہوں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام انبیاء پر قطعی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں تفصیلی گفتگو سے منع فرما دیا (نیز اس سے بھی منع فرما دیا کہ کسی نبی کا نام لیکر یہ کہا جائے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فلاں نبی سے افضل ہیں پس اجمالاً ہی کہنا چاہیئے کہ آپ سب سے افضل ہیں ۱۲) کیونکہ تفصیل سے دوسرے نبی کی تنقیص ہو جاتی ہے اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تفصیلی کلام مقابلہ میں تنقیص سے بچ سکیں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ غایت رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو اس بات میں تفصیلی گفتگو سے بالکل منع فرما دیا اور اگر کسی کا اس باب میں تفصیلی گفتگو کر کے یہ خیال ہو کہ میرے کلام سے کسی نبی کی تنقیص لازم نہیں آتی تو میں اس کے سامنے ایک

معیار بیان کرتا ہوں اس پر اپنی تقریر کو پرکھ لیا جاوے وہ یہ کہ تفاضل انبیاء پر تقریر کرنے کے قبل یہ سوچ لے کہ اس مجلس میں سارے انبیاء علیہم السلام مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہیں اور میں سب کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ظاہر کر رہا ہوں اس وقت معلوم ہو جاوے گا کہ کس مضمون کے بیان کی جرأت ہوتی ہے اور کس کی نہیں ہوتی اس معیار سے اپنی اکثر تقریروں کا حدود سے تجاوز ہونا معلوم ہو جاویگا اور اس کی فکر ہوگی کہ کسی لفظ سے ایہاماً بھی کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم نہ آ جائے ورنہ وہ حضرات تو شائد خفا نہ ہوں مگر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو جائیں گے حدیث میں ہے الانبیاء اخوۃ من علات وامہاتہم شتی ودینہم واحد یعنی انبیاء میں باہم علاتی بھائیوں جیسا تعلق ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات کیسے بھائی ہیں دنیا داروں کی طرح نہیں بلکہ ان میں باہم پورا اتحاد و اتفاق و محبت ہے تو ایسے بھائیوں میں ہر ایک کو اپنے دوسرے بھائی کی تنقیص کب گوارا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں حضرت اس معیار کو پیش نظر رکھ کر تم اپنی تمام تقریروں اور تحریروں کو جو باب تفاضل میں لکھی ہوں یا کی ہوں جانچو کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی ہے جس کو بے تکلف تمام انبیاء کے سامنے پڑھ کرتا سکو یقیناً ایسی تقریریں بہت کم ملیں گی زیادہ حصہ وہی ہوگا جس کو سب کے سامنے پڑھنے کی تم کبھی جرأت نہیں کر سکتے (یہ بہت سچی ترازو ہے جو ایک رتی پر بھی جھک جائے گی اس کی قدر کرو) ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں فتوے دیتے ہوئے یہ مراقبہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دے رہا ہوں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اگر میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو میں فتویٰ نہیں دیتا حضرت یہ وہ باتیں ہیں جن میں صوفیہ دوسروں سے ممتاز ہیں گو اس مضمون کا عقیدہ تو سب کو ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے خدا کے سامنے کرتا ہے مگر اس کا مراقبہ اور استحضار دوسرا اثر رکھتا ہے بس اسی مراقبہ سے تم تفاضل انبیاء کے وقت کام لو۔ ان شاء اللہ تعالے کلام میں اعتدال پیدا ہو جائے گا۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ سلاسل صوفیہ میں بھی ایک سلسلہ والوں کو دوسرے سلسلہ پر اپنی فضیلت ثابت نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہر سلسلہ والے کے لئے دوسرے سلسلہ کے بزرگ چچا ہیں اور چچا بمنزلہ باپ کے ہے حدیث میں

بھی ہے عم الرجل صنو ابیہ یعنی عظمت و ادب میں دونوں برابر ہیں گو بعض حقوق میں باپ مقدم ہیں۔ لیکن تمھارا باپ یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ تم اپنے چچا کی یعنی باپ کے بھائی کی تنقیص و توہین کرو جب سلاسل ولایت میں بھی تفاضل سے اکابر نے منع کیا ہے تو تفاضل انبیا تو یقیناً اشد ہے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کر لے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے جو اپنے فضائل احادیث میں بیان فرمائے ہیں اس سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ ان کے معلوم ہو جانے سے متبعین کو تسلی ہو گی کہ اللہ تعالے نے ہم کو ایسا متبوع دیا اور اتباع پر زیادہ رغبت ہو گی گو یہ علوم خود بھی مقصود ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ترغیب اتباع ہی معلوم ہوتا ہے (ویحتمل ان یکون امتثالا لامرہ تعالیٰ واما بنعمۃ ربک فحدث ۱۲) کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق یہ تھا کہ آپ کو اتباع احکام کا سب سے بڑھ کر اہتمام تھا اور جس چیز کو اس میں دخل ہوتا آپ اس کو اختیار کرنے کی کوشش فرماتے اس کے متعلق کہ آپ کو اتباع کا زیادہ اہتمام ہے بہ نسبت بیان فضائل کے ایک مرد صالح کا خواب بھی ہے جو بعض رسائل میں طبع بھی کرا دیا ہے ان کو مولود وغیرہ کا بہت شوق تھا محض غلبۂ محبت نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے تو انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں ہم زیادہ تعریف سے خوش نہیں بلکہ ہم اس سے خوش ہوتے ہیں کہ جو ہمارے احکام کا اتباع کرے مگر آجکل حالت یہ ہے کہ شعرا ایک نعتیہ دیوان لکھ کر اپنے کو سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ عمل کی یہ حالت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل خلاف ہے یقیناً ایسی تعریف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش نہیں ہو سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاق پر نظر کرنے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل کو زیادہ تر ترغیب اتباع کی نیت سے بیان فرمایا ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ فضائل تو عقائد کی قبیل سے ہیں جو خود مقصود ہوتے ہیں اور تم ان کو مقصود لغیرہ بتاتے ہو میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ حرج نہیں کہ ایک شی مقصود بالذات بھی ہو اور دوسری مقصود میں معین بھی ہو آپ کو خبر نہیں مقاصد شرعیہ کی سب کی ایسی حالت ہے جیسے مقناطیس کی حالت ہے کہ ہر مقصود دوسرے کا جاذب اور اس میں معین ہے پس عقائد کا مقصود بالذات ہونا ان کے مقصود للاعمال ہونے کے منافی نہیں اور میں نے اس

مسئلہ کو قرآن سے سمجھاہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذلک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم۔ بتلایئے اس آیت میں لام غایت کا متعلق کون ہے مذکور تو ہے نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی جزو اس کا صالح نہیں لامحالہ مقدر ماننا پڑے گا اب یہ بھی سمجھ لو کہ مقدر کیا ہے تو اس لام سے اوپر اللہ تعالیٰ کے مسئلہ تقدیر بیان فرمایا ہے یعنی تم کو جو مصیبت بھی پہونچتی ہے خواہ آفاقی ہو یا نفسی وہ ایک کتاب میں اپنے ظہور سے پہلے لکھی ہوئی تھی چونکہ یہ عجیب بات تھی اس لئے فرماتے ہیں کہ تعجب نہ کرو اللہ کو یہ سب آسان ہے اب اس مسئلہ کے بتلانے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو یہ مسئلہ اس لئے کیوں بتلایا تاکہ تم فائت پر غم نہ کرو اور عطا کی ہوئی چیز پر اتراؤ نہیں پس وہ مقدر اخبرناکم بہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کو اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن وبطر رفع ہوجاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر وبطر اصل ہے تعطل باطن کی یعنی غمگین وپریشان آدمی ظاہر میں تمام دین ودنیا میں کاموں سے معطل ہوجاتا ہے اور متکبر آدمی کا دل خدا کے تعلق سے معطل ہوجاتا ہے جبتک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کو لگاؤ نہیں ہوسکتا یہ تو تقدیر کو دخل تھا اعمال میں۔ اب میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ توحید جو اعظم العقائد واساس العقائد ہے اس کو بھی اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے۔ چنانچہ سعدی فرماتے ہیں ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس ۔۔۔ ہمیں ست بنیاد توحید و بس

(توحید کا مقام والا ایمان کامل سے مشرف ہوتا ہے اگر اس کے پاؤں پر سونے کا ڈھیر ہو یا اس کی گردن پر تلوار ہندی ہو تو ان دونوں حالتوں میں نہ تو اس کو کسی سے امید وطمع ہوگی اور نہ کسی سے خوف ہوگا اور یہی حالت توحید کی بنیاد ہے)

یعنی توحید سے مخلوق کا خوف وطمع زائل ہوجاتا ہے۔ جب اتنا بڑا عقیدہ بھی اصلاح اعمال میں دخیل ہے تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخیل مانا جاوے تو کیا اشکال ہے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصود ہے (گو وہ فضائل ایک درجہ میں مقصود بالذات بھی ہیں)

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں زیادہ کاوش سے منع فرما دیا کیونکہ جو مقصود ہے اس اعتقاد فضیلت سے وہ بدون تفصیل کے بھی صرف اجمالی اعتقاد سے حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر نے اولیاء مجتہدین میں بھی تفاضل سے منع فرمایا ہے غرض متقدمین کو فقہ اور تعمق نظر کی وجہ سے متاخرین پر فضیلت ضرور ہے لیکن باہم متقدمین[له] میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے اس سے بحث نہ کرنا چاہیئے یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ لوگوں نے حدیث تضاعف ثواب فی رمضان کے باب میں شارع کا مقصد نہیں سمجھا اور فقیہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر یہ عمل کیا کہ تفاضل حسنات کے لئے طاعات کو مؤخر کرنے لگے کہ اگر کسی کی زکوٰۃ کا سال ۲۸ شعبان کو پورا ہوتا ہے تو وہ ۲۸ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا بلکہ رمضان کے لئے اس کو ملتوی کرتا ہے چاہے غریب مسکینوں کا (جن کا یہ مال زکوٰۃ شرعی حق ہے) خاتمہ ہی ہو جائے ارے تم کو کیا خبر ہے کہ مساکین پر کیا گذر رہی ہے تم کو یکم رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کی روح کو ایک ایک گھڑی کا انتظار ہے بس وہ حال ہوگا تا تو بمن می رسی من بخدا می رسم (جب تک تو مجھ تک پہونچے گا میں خدا تک پہونچ جاؤں گا یعنی موت ہی آجاوے گی) صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں جو آپ نے سمجھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ نہیں کہ رمضان تک طاعات کو مؤخر کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رمضان میں طاعات کے اندر جلدی کی جائے یعنی جس طاعات کی ہمت ہو سکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہو سکے اس کو جلدی رمضان ہی میں کر دو رمضان کے بعد کیلئے مؤخر نہ کرو کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے پس تضاعف حسنات کا مقصود تو تعجیل اعمال فی رمضان تھا لوگوں نے اس سے تاخیر اعمال الی رمضان سمجھ لیا۔ ؏ یہ ہمیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ (غور کرو کہ راستہ کا فرق کہاں سے کہاں تک جا پہنچا)

[له] میں کہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہؒ فقہ کے موجد ہیں کما قال الامام الشافعی الناس کلہم عیال علی ابی حنیفۃ.. فی الفقہ نیز وہ تابعی ہیں کما اثبت الذہبی والحافظ ابن حجر والدارقطنی وغیرہم رویۃ الانس بن مالک وفی الحدیث خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم ولیس احد من المجتہدین المقلدین تابعیا سوا الامام پس امام ابو حنیفہؒ کا تمام ائمہ مجتہدین سے افضل ہونا تو نص سے بھی ثابت ہے اور موجد فقہ ہونے سے بھی ۱۲ مگر اس سے علی الاطلاق فضیلت سب پر ثابت نہیں ہوتی ۱۲ اشرف

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ جس شخص کا سال زکوٰۃ ۲۸ر شعبان کو پورا ہو تو کیا وہ شعبان ہی میں صدقہ کردے اس کے جواب میں میں تو یہی کہونگا کہ ہاں دیر نہ کرے رمضان کا انتظار نہ کرے رہا یہ سوال کہ کیا شعبان میں وہی ثواب ہوگا جو رمضان میں ہوتا تم اس کا ٹھیکہ لیتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میں ٹھیکہ دار تو نہیں ہوں ہاں ٹیکہ دار ہوں کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ قواعد پر ٹیک لگا کر کہتا ہوں کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تاخیر طاعات مطلوب نہیں بلکہ تسارع و تسابق الی الخیر مقصود ہے چنانچہ جا بجا فاستبقوا الخیرات۔ یسارعون فی الخیرات نص میں وارد ہے۔ اس لئے میں جزم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تاخیر فی الخیر شارع کو ہرگز مطلوب نہیں اور میں قواعد سے کہتا ہوں کہ جس کو شعبان میں صرف کا موقعہ ملے وہ ہرگز تاخیر نہ کرے اس کو شعبان ہی میں اتنا ثواب ملے گا جو شاید رمضان کے ثواب سے بھی بڑھ جائے کیونکہ انفاق فی رمضان سے کمیۃً ثواب بڑھنا ہے اور تعجیل و سبقت فی الخیر سے کیفیۃ ثواب زیادہ ہوتا ہے اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبیۃ ہے۔ صاحبو! میں اس کی نظیر علما کے کلام سے اپنے پاس رکھتا ہوں حدیث میں ہے کہ مسجد محلہ میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں ۵۰۰ نمازوں کا مگر محلہ والوں یہ جائز نہیں کہ محلہ کی مسجد چھوڑ چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنے جایا کریں اگر ایسا کروگے تو گناہ ہوگا۔ اس مقام پر علماء نے لکھا ہے کہ جامع مسجد کی نماز اس شخص کے حق میں کمیۃ زیادہ ہے اور مسجد محلہ کی نماز کیفیۃ زیادہ ہے (کیونکہ اس کے ذمہ اس مسجد کی آبادی واجب ہے تو یہ شخص مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا کیونکہ اس کے ذمہ اس کی عمارت و آبادی واجب نہیں بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلہ والوں کے ذمہ ہے ۱۲) ہاں اگر کوئی جامع مسجد کے محلہ میں جا بسے تو اور بات ہے پھر اس کو کیفیت و کمیت دونوں میں ترقی ہو جائے گی گو قرب سے بعد اقدام کا بھی خسارہ ہو جائیگا بس تم اپنے حساب اور قواعد کو رہنے دو اس میں پانچ کو جانے دو جو حکم ہو جائے اس کو مان لو اپنی طرف سے حساب نہ لگاؤ کہ اس وقت خرچ کرنے میں ثواب کم ہوگا رمضان میں زیادہ ہوگا صاحبو! یہ تسلیم کہ رمضان میں زیادہ ہوگا مگر یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ اس وقت کم ہوگا، ممکن ہے اس وقت ہی زیادہ مل جائے کیونکہ اس وقت خرچ کردگے تو ادا ہوگا اور رمضان تک

تاخیر کروگے تو قضا ہوجائے گا اور ادا میں جو لطف ہے وہ بات قضا میں کہاں تم کو آخرت کے حقائق وخواص کی کیا خبر۔ تم ان کے متعلق قیاس سے کام نہ لو۔ اہلِ سائنس کو اقرار ہے کہ ابتک خواص اشیا کا ان کو اتنا بھی علم نہیں ہوا جتنا سمندر میں سے ایک قطرہ حالانکہ حیرت در حیرت انگیز ایجادات ہورہی ہیں اخبار میں دیکھا ہے کہ امریکہ نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے کہ اس کو پرانے کھنڈروں اور ویرانوں میں لگا یا جلائے تو پہلے زمانہ کی تمام باتیں جو اس گھر کے آدمیوں نے اس گھر میں کی تھیں اس آلہ کے ذریعہ سے سنائی دیں گی اب بعض لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ یہ آوازیں کرۂ ہوا میں اب تک موجود ہیں مگر ان کے ادراک کے لئے لطیف آلہ کی ضرورت تھی وہ اب ایجاد ہوگیا پہلے ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے کوئی ان باتوں کو نہ سن سکا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ روحوں کی آوازیں ہیں ارواح بولتی ہیں۔ اب میں اس خبر کو بیان کرکے کہتا ہوں کہ قرآن نے کہا تھا کہ قیامت کو زمین بولے گی یومئذ تحدث اخبارھا تو اس کا سب نے انکار کیا اور کہا بھلا یہ کس طرح ہوگا زمین کیونکر بولے گی کیا اس کے بھی زبان ہے۔ قرآن نے اس کا بڑا زبردست جواب دیا ہے بان ربک اوحٰی لھا یعنی زمین اس لئے بولے گی کہ خدا کا اس کو یہی حکم ہوگا۔ اس جواب نے سب سائنس والوں کی گردنیں توڑ دیں کیونکہ اسباب ظاہرہ میں تو وہ شبہات نکال سکتے تھے اس میں کیا شبہ نکال سکتے ہیں کیونکہ یہ تو حقیقی سبب ہے اگر اس میں کلام کریں گے کہ کیا زمین کے زبان ہے تو ہم سوال کریں گے تو اچھا بتلاؤ یہ زبان کیونکر بولتی ہے کیا اس کے بھی زبان ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب عالم اسباب کی حقائق کا ابتک احاطہ نہیں ہوسکا تو عالم آخرت کی حقائق کا تو کون احاطہ کرسکتا ہے پھر آپ وہاں کے ثواب وغیرہ کے بارے میں اپنا حساب اور قاعدہ رہنے دیجئے چنانچہ بعض لوگوں نے حقوق العباد کے بارہ میں ایک حساب لگایا ہے کہ زید کا ہمارے ذمہ حق ہے اور عمرو کے ذمہ ہمارا حق ہے تو اب ہمکو زید کے حق کی فکر کرنا کیا ضرور۔ قیامت میں اگر زید ہم سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا تو ہم عمرو پر حوالہ کردیں گے کہ اس کے ذمہ ہمارا حق ہے اس سے وصول کرلو اس طرح مقاصہ ہوجائے گا مگر اول تو کیا ضرور ہے کہ دوسروں کے ذمہ آپ کے حقوق اتنے ہی ہوں جتنے دوسروں کے آپ کے ذمہ ہیں دوسرے فرض کرلیا جائے کہ برابر ہی ہوگئے مگر ممکن ہے کہ پھر بھی مقاشہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ

دوسرا تو تمہارے حقوق کی ادائیگی کی فکر میں عمر بھر لگا رہا ہو مگر افلاس یا اور کسی عذر کی وجہ سے مجبور رہا ہو (اور اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم خود حقوق کو ادا کر دیں گے اور اس شخص پر اصلاً مواخذہ نہ ہوگا ۱۲) اور تم اس مقاصہ کے حساب سے بے فکر ہو گئے ہو تمنے ابھی سے دوسرے کا حق مارنے کی ٹھان لی ہے تو تم اور وہ برابر کہاں ہوئے تم پر ظلم وغصب وخیانت وغیرہ متعدد دفعات قائم ہیں اور اس پر صرف ایک دفعہ تھی کہ قرض لیکر ادا نہیں کیا۔ تیسرے ممکن ہے کہ حقوق کے مکافات مکسوب اعمال سے ہو سکے اور موروث اعمال سے نہ ہو سکے اس لئے دوسرے شخص کی جو نیکیاں تم کو ملی ہیں وہ معاوضہ ان حقوق کا نہ ہو سکیں جو تمہارے ذمہ ہیں تو یہ حساب محض لغو ہے خدا سے ڈرنا چاہیئے کہیں بنئے کے حساب کی طرح نہ ہو جائے کہ لیکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ جس عورت کے کئی نکاح ہوئے ہوں وہ کس کو ملے گی یہ سوال بھی محض فضول ہے کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ وہاں کسی کو قلق نہ ہوگا سب کے سب خوش وخرم رہیں گے یہ نہ ہوگا کہ شوہروں میں باہم لڑائی جھگڑا ہو وہ کہے میں لوں، وہ کہے میں لوں ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کے پہلے خاوند کو دنیا ہی کی عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی ہی حسین یا اس سے بہتر دیدے کیونکہ دنیا میں بہت لڑکیاں بغیر شادی کے بھی تو مر جاتی ہیں یا حوریں زیادہ دیدیں۔ غرض اللہ تعالیٰ سب کو خوش کر دیں گے جنت میں کوئی غمگین نہ ہوگا اس لئے یہ سوال محض فضول۔ غرض یہ کہ تم خدا کے ساتھ حساب نہ لگاؤ حساب وہاں کیا کرتے ہیں جہاں مساوات ہو۔ دیکھو دوکاندار ہم سے اور آپ سے تو حساب کرتے ہیں اور بادشاہوں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتے وہاں تجارتی مال کو بھی ہدیہ کہکر پیش کرتے ہیں اور جب وہاں سے قیمت پوچھی جاتی ہے تو قیمت نہیں بتلاتے بس یہی کہتے ہیں کہ اس کی کچھ قیمت نہیں صرف حضور کی خوشنودی ہی سب کچھ قیمت ہے۔ اس کے بعد ان کو قیمت سے بھی بہت زیادہ مل جاتا ہے پھر غضب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ساتھ حساب کتاب کرتے ہو جن کا حق یہ ہے کہ ؎

نیاوردم ازخانہ چیزے نخست　　تودادی ہمہ چیز ومن چیز تست

(اے خدا ہم اپنے گھر سے کوئی چیز بھی تو نہ لائے تھے آپ ہی نے ہر چیز ہم کو عطا فرمایا اور ہم خود بھی آپ ہی کے ہیں)

کیونکہ سب چیزیں تو اُن ہی کی ملک ہیں اور حساب وہاں ہوتا ہے ایک عوض ایک عاقد کا ہو دوسرا عوض دوسرے عاقد کا اور یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ان اللہ اشتری من المومنین انفسهم واموالهم بان لهم الجنة کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جنت کے بدلہ میں ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے جس سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جان و مال ہماری ملک ہے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے تم بچہ کو بلا تملیک پیسہ دیدیتے ہو اور انفاق کی عادت ڈالنے کے لئے اس کے ہاتھ سے مدرسہ میں دلواتے ہو اب مدرسہ کی کارروائی میں بچہ کا نام چھپے گا کہ فلاں بچہ نے مدرسہ میں چندہ دیا تھا کارروائی میں اپنا نام دیکھ کر بچہ خوش ہوتا ہے تو کیا حقیقت میں چندہ دینے والا وہ بچہ ہے یا آپ ہیں اس کو خود سمجھ لیجئے اور یہاں استطراداً اس کے متعلق چند باتیں یاد آگئیں وہ بھی بتلادوں ایک یہ کہ باپ کو مناسب ہے کہ بچہ کے ہاتھ سے بھی کبھی کبھی خرچ کرایا کرے کبھی اس کے ہاتھ سے فقیر کو دلوادیا کبھی مدرسہ میں دلوادیا تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے اور مال کی حرص نہ پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ جب بچوں کے ہاتھ سے کسی دوسرے کو رقم دلواؤ خواہ فقیر کو خواہ مدرسہ کو تو اس وقت یہ رقم بچہ کو ہبہ نہ کرو بلکہ اباحت کے طور پر دو ورنہ وہ اس کی ملک ہو جائے گی پھر ہبہ صبی حرام ہوگا اور اگر غلطی سے ایسا ہو جائے تو فقیر سے یا مدرسہ والوں سے رقم واپس نہ لو بلکہ خود بچہ کو اس کے عوض اور رقم دیدو جس میں نیت عوض کی قید ضروری ہے ورنہ یہ مستقل ہبہ ہوگا پہلے کا عوض نہ ہوگا اور مدرسہ والوں کو چندہ کرنے والوں کو بھی چندہ لیتے ہوئے ان مسائل کا لحاظ رکھنا چاہیئے یہ چندہ جمع کرنے والے ہر شخص کی رقم لے لیتے ہیں خواہ کوئی بچہ دے یا عورت اور ان مسائل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ چنانچہ پانی پت میں ایک مدرسہ کے سفیر جو واعظ النساء تھے کہ ہمیشہ عورتوں ہی میں وعظ کہا کرتے تھے تشریف لائے اور چندہ کا وعظ کہا ان کو ایک ہی حدیث یاد تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے عورتوں میں نے تم کو جہنم میں سب سے زیادہ دیکھا ہے بس صدقہ کر کے اپنے کو جہنم سے بچاؤ اگرچہ زیور ہی میں سے ہو اسی حدیث کا ہمیشہ بیان کرتے تھے۔ عورتیں مردوں کے اعتبار سے زیادہ مالدار ہیں کیونکہ تھوڑا بہت زیور ہر عورت کے ہاتھ کان میں ہر وقت ہوتا ہے۔ نیز یہ مردوں سے زیادہ سخی بھی ہیں

کیونکہ زیور میں ان کو کونسی مشقت پڑی تھی یا تو شوہر نے کما کر بنایا یا ماں باپ نے جوڑ جاڑ کر چڑھا دیا ان کو تو ہر حال میں مفت ہی پڑتا ہے اس لئے چندہ کے وعظ میں ان کے ہاتھ کان سے بہت جلدی زیور نکلنے لگتا ہے۔ وہ سفیر صاحب غالباً اسی لئے عورتوں میں زیادہ وعظ کہتے تھے کہ یہ مالدار بھی ہیں سخی بھی ہیں اور عقل سے کوری بھی ہیں ہر شخص کی باتوں سے متاثر ہو جاتی ہیں ان سے چندہ خوب ملے گا۔ چنانچہ ہر وعظ کے بعد ان کے پاس بہت سا زیور جمع ہو جاتا تھا۔ ایک دن کسی عورت نے اپنے کان کی سونے کی بالیاں چندہ میں دیدیں سفیر صاحب بڑے خوش ہوئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ان کی خوشی کرکری ہوگئی کیونکہ اس عورت کا خاوند جو گھر میں آیا اس نے بیوی کے کان ننگے دیکھے، پوچھا بالیاں کیا ہوئیں کہا مدرسہ کے مدرسہ چندہ میں دیدی کہا بیوقوف تو تو ان کی دینے والی تجھے پہننے کو دی تھی یا تیری ملکیت بنادی تھی۔ اس کے بعد وہ سفیر صاحب کے پاس آیا اور کہا آپ کو میری بیوی نے سونے کی بالیاں چندہ میں دی تھی وہ واپس کر دیجئے کیونکہ وہ اس کی ملک نہیں ہیں میری ملک ہیں اور اس نے میری بغیر اجازت دی ہیں۔ سیدھی اور معقول بات تھی مگر سفیر صاحب کسی طرح واپس دینے کو تیار نہ ہوں اور اس سے جھگڑنے لگے۔ ان دنوں میں بھی وہاں گیا ہوا تھا سفیر صاحب میرے پاس آئے میں نے ان سے کہا کہ آپ معقول بات کو کیوں نہیں مانتے اور بالیاں واپس کیوں نہیں دیتے تو انھوں نے بڑا عذر یہ کیا کہ میں تو سو روپے کی رسید کاٹ کر دے چکا ہوں۔ اب اگر بالیاں واپس دیدوں تو مدرسہ والے تو مجھ سے روپے وصول کرلیں گے کیونکہ رسید کٹی ہوئی ہے۔ میں نے کہا اس کی تدبیر یوں کیجئے کہ ان سے وہ رسید منگوا لیجئے۔ اور اس پر ان کے قلم سے لکھوا لیجئے کہ ہم نے یہ چندہ واپس لے لیا اور دستخط کرا کے ایک دو گواہیاں بھی کرا لیجئے اسی طرح مثنیٰ رسید پر جو آپ کی بہی میں ہے واپسی مع دستخط اور گواہوں کے لکھوا لیجئے۔ پھر مدرسہ والے آپ سے کچھ نہ کہیں گے۔ یہ تدبیر سن کر مولوی صاحب کے حواس درست ہوئے ان کا بال بال بچا اور اس غریب کی بالی بچی۔ پس عورتوں سے چندہ لینے والوں کو بڑی احتیاط کرنا چاہیے کیونکہ یہ اکثر بدون شوہر سے پوچھے شوہر ہی کے مال میں سخاوت کیا کرتی ہیں۔ یہ مسائل درمیان میں

استطراداً مذکور ہو گئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس طرح آپ بچہ کے ہاتھ رقم دلوا کر بچہ کا نام کر دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ آپ کا نام کر رہے ہیں ورنہ بتلایئے کہ جان آپ کی کدھر سے ہو گئی مال آپ کا کدھر سے ہو گیا یہ تو سب کچھ حق تعالیٰ کا ہے آپ کا نام برائے نام ہے اب بتلاؤ اس کے عوض میں کچھ جنت کی نعمتیں ملیں گی وہ عوض ہے ہر گز نہیں بلکہ سراسر فضل و رحمت ہے مگر اس برائے نام ملک کا شریعت نے اعتبار کیا ہے اور اس کو ملک حقیقی ہی کے احکام دیئے ہیں یہ شریعت کا بڑا احسان ہے ورنہ اگر یہ نہ ہوا درحقیقت کا مسئلہ عملاً بھی مان لیا جائے کہ ؎

درحقیقت مالک ہر شے خدا ست ایں امانت چند روزہ نزد ما ست

(درحقیقت ہر شے کا مالک خدا ہے اور بطور امانت چند روز کے لئے ہمارے پاس ہے)

تو عالم میں فساد برپا ہو جائے۔ کوئی کسی کی بیوی کو لے بھاگے کوئی کسی کی نقدی اور زیور پر قبضہ کر لے اور جب مالک کہے کہ یہ تو میری چیز ہے اس کو یہی کہکر دھمکا دے کہ تیری کہاں سے آئی تھی سب چیزیں خدا کی ہیں ہم بھی خدا کے ہیں آج تک تو نے برتا اب ہم برتیں گے اس مسئلہ پر عمل ہونے لگے تو پھر شیخ صاحب بھی پٹھانوں جیسا کام کرنے لگیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

سر پنہان ست اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(راز پوشیدہ ہے نظام توحید میں اگر ظاہر کر دوں تو تمام عالم میں تعطل پیدا ہو جائے)

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر توحید کو ظاہر کر دوں تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اس کی وجہ یہی ہے کہ توحید کا تو یہی مقتضا ہے کہ خدا تعالیٰ کے رد برو کسی کی ملک ملک نہیں ایک مقام پر مولانا نے اس کے مناسب ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ ایک ایسا ہی شخص کے باغ میں گھس کر انگور کھانے لگا۔ باغبان آ گیا تو اس کو دیکھ کر بھی آپ ڈرے نہیں بے تکلف کھاتے رہے۔ اس نے دھمکایا کہ نامعقول یہ کیا کر رہا ہے کہ بدون اجازت کے میرا پھل کھا رہا ہے تو وہ صاحب حقیقت بولے بس خاموش رہ بک بک نہ لگا۔ باغ بھی خدا کا پھل بھی خدا کا ہاتھ بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر تو روکنے والا کون ہے۔ اس نے نوکر کو آواز دی کہ ایک رسا اور ڈنڈا لانا اور اس میں اسکو جکڑ کر ڈنڈے سے مارنا شروع کیا اب وہ لگا چلانے تو باغ والا کہتا ہے کہ بس خاموش رہو

رستا بھی خدا کا مُتکا بھی خدا کا میں بھی خدا کا پھر چلانے کی کیا بات ہے غرض خوب مارا آخر اس لئے اس عقیدہ سے توبہ کی اور کہا ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار   اختیار ست اختیار ست اغنیار ست

(اس نے کہا میں توبہ کرتا ہوں اس عقیدۂ جبر سے بے شک اختیار ہمکو دیا گیا ہے ہر خیر و شر کا)

اہل جبر وہی لوگ ہیں جو حقیقت کے قائل ہیں اور اختیار کے انکار سے شریعت کے منکر ہیں انھوں نے ؎

درحقیقت مالک ہر شئی خداست میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ فاعل ہر شئی نیز خدا است کہ ہر کام کرنے والا بھی انسان نہیں بلکہ خدا ہی ہے اور صفت اختیار سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے انکار کر بیٹھے ہیں میں کہتا ہوں بہت اچھا اگر انسان کو اختیار کچھ نہیں ہے تو پھر سب کو اعمال صالحہ کے بعد بھی جہنم کے لئے تیار رہنا چاہیئے کیونکہ آپ نے یہ اعمال تھوڑا ہی کئے ہیں آپ تو مجبور تھے جیسے یہاں مجبور رہو آخرت میں بھی مجبور رہو اللہ تعالیٰ جہاں بھیجدیں چلے جانا صاحبو! انسان میں صفت اختیار کا ہونا دلیل کا محتاج نہیں بلکہ یہ وجدانی امر ہے ہر شخص وجدان سے اس کو محسوس کرتا ہے کہ ہاں میرے اندر اختیار ہے۔ دیکھئے مرتعش (جس کے ہاتھ میں رعشہ ہو) اور کاتب کی حرکت ید میں فرق بیّن ہے پہلا شخص حرکت میں مجبور ہے دوسرا مجبور نہیں (ایک شخص کو ڈھا کر زبردستی اس کا مُنھ کھول کر کسی نے شراب پلادی اور ایک نے روپیہ ہاتھ میں لیا اور شراب کی بھٹی پر گیا بھاؤ تاؤ کیا اور بوتل خرید کر پی لی کیا دونوں برابر ہیں ہرگز نہیں بلکہ مجبور پہلا شخص ہے دوسرے کو مجبور کوئی نہیں کہہ سکتا ۱۲) اور یہ ایسا فرق ہے جس کو حیوانات بھی جانتے ہیں اگر آپ کتے یا بھیڑیے کے ڈھیلا یا لاٹھی ماریں تو وہ لاٹھی ڈھیلے پر حملہ نہ کرے گا بلکہ آپ پر حملہ کریگا وہ بھی جانتا ہے کہ لاٹھی اور ڈھیلے کی خطا نہیں وہ تو مجبور ہے خطا آدمی کی ہے جو اختیار سے ہم کو ستا رہا ہے۔ بہرحال اگر شریعت نہ ہو تو حقیقت سے تو سارے عالم میں فساد ہو جائے لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ شریعت نے جو انسان کے برائے نام ملک اور اختیار کو تسلیم کر کے اس کے احکام مقرر کئے ہیں اس سے یہ تو مقصود نہیں کہ تم حق تعالیٰ کے سامنے بھی اپنی ملک

جتلایا کرو۔ بس انسان کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو حقیقت پر نظر رکھے کہ اپنی جان کو اپنی جان نہ سمجھے نہ مال کو اپنا مال سمجھے نہ اپنے کمالات کو اپنے کمالات سمجھے بلکہ سب کو عطایائے حق سمجھتا رہے اور بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے شریعت پر نظر رکھے یہ ایک اشکال تھا جس کو میں نے درمیان میں حل کر دیا اب اصل بات کی طرف عود کرتا ہوں کہ تم حق تعالیٰ سے حساب نہ کرو اور شعبان ورمضان میں تفاوت نہ کرو جب موقع ہو فوراً خرچ کر دو تم کو کیا خبر کہ اس وقت کتنا ثواب ملا رمضان سے کم ملا یا زیادہ کیا عجب ہے کہ اس وقت ضرورت کے وقت جو مسکین کو سہارا مل گیا ہے اس کی دعا عرش سے کتنی اوپر گئی ہوگی اور اس دعا سے تم کو کیا کچھ ملا ہوگا اور مان لو کہ اس وقت رمضان سے کم ہی ثواب ملا تو تم کو یہ کیا خبر ہے کہ رمضان تک تم زندہ رہو یا نہ رہو اور یوں امید تو پہلے زمانہ میں بھی کسی کو نہ تھی کہ ایک دن یقیناً زندہ رہیں گے مگر پہلے زندگی کی ایسی نا امیدی بھی نہ تھی جیسی آجکل ہوگئی ہے کیونکہ آئے دن نئی نئی وبائیں قسم قسم کی بلائیں آتی رہتی ہیں اب تو ایک دن کا بھی کسی کو بھروسہ نہیں اگر کہو کہ ہم وصیت کر جائیں گے کہ رمضان میں اتنی رقم دیدی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وصیت کا ثواب اپنے ہاتھ سے دینے کے برابر نہیں دوسرے کیا بھروسہ ہے کہ ورثہ ادا کریں گے یا نہیں یہ غلطی تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جو راغب الی الخیر ہیں اور جو راغب الی الخیر نہیں ہیں ان کے یہاں تو رمضان کا مہینہ آتا ہی نہیں جیسا ایک جنٹلمین کا قصہ ہے کہ رمضان میں ایک دوست اُن سے ملنے گئے تو دیکھا وہ بے تکلف ناشتہ کر رہے سگرٹ پی رہے ہیں کہا کیا آپ رمضان میں ایسا کرتے ہیں کہنے لگے رمضان کیا ہوتا ہے کہا ایک مہینہ کا نام ہے تو جنٹلمین نے مہینوں کی گنتی شروع کی جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی۔ الخ کہا ان میں تو رمضان کا نام کہیں بھی نہیں یہ تو نمبر اول کے جنٹلمین تھے اور جو نمبر دوم کے جنٹلمین ہیں ان کے یہاں رمضان آتا تو ہے مگر بلائے بے درماں کی طرح آتا ہے کیونکہ وہ سارے سال تو مشغول رہتے ہیں۔ جنوری فروری ہیں رمضان کی خبر ان کو ایک دم ہو جاتی ہے کہ آج رمضان آگیا تو وہ گھبرا کر کہتے ہیں کہ ابھی ابھی تو گیا تھا ابھی پھر آگیا۔ صاحبو! مسلمانوں کو تو شمسی حساب میں ایسا غلو نہ چاہیئے

کہ سال بھر بھی اسلامی مہینوں کی خبر نہ ہو یہ میں نے مانا کہ تجارتی ضرورتیں شمسی حساب پر مجبور کرتی ہیں تو میں اس سے منع نہیں کرتا آپ تجارتی کاغذات میں اسی سے حساب رکھئے مگر نجی معاملات میں کونسی مجبوری ہے دوستوں کو جو رات دن خطوط لکھے جاتے ہیں ان میں شمسی حساب کی کیا ضرورت ہے اس کو چھوڑو اور اپنی نجی خط وکتابت میں قمری حساب کو استعمال کرو۔ غرض اس میں شک نہیں کہ رمضان میں تضاعف حسنات ہوتا ہے اور اس لئے تمام سال میں رمضان کا مہینہ سب مہینوں سے افضل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے کہ اس کی وجہ سے طاعات کو دوسرے مہینوں پر ملتوی رکھتے ہیں کہ رمضان میں کریں گے یاد رکھو کہ شارع کا یہ مطلب ہرگز نہیں ایک تو یہ غلطی تھی ایک دوسری غلطی پر اور متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ لوگوں نے رمضان کے فضائل میں سے بس یہی یاد کر لیا ہے کہ اس میں حسنات کا تضاعف ہوتا ہے اور یہ نہیں یاد رکھا کہ گناہ کا بھی تضاعف ہوتا ہے کیونکہ مبارک مکان ومبارک زمان میں جس طرح نیکی بڑھتی ہے گناہ بھی بڑھتا ہے جیسا کہ زنا کرنا ہر جگہ بُرا ہے مگر مسجد میں کرنا بہت ہی بُرا ہے۔ اسی طرح رمضان کا گناہ اور دنوں کے گناہ سے سخت ہوگا پس رمضان میں جبکہ طاعات وحسنات کا اہتمام ضروری ہے ایسا ہی سیئات سے اجتناب بھی سخت ضروری ہے مگر یار لوگوں نے گناہوں میں بھی وہی خانہ ساز حساب لگایا ہے جو حسنات میں لگایا تھا یعنی اللہ تعالیٰ سے ضابطہ کرنا چاہتے ہیں چنانچہ علماء سے پوچھتے ہیں کہ یہ کام کرنا کیسا ہے وہ بتلاتے ہیں کہ گناہ ہے تو اس کے بعد سوال ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا ہی گناہ ہے یا بڑا گناہ ہے میں ایسے نامعقولوں کو یہ جواب دیتا ہوں کہ کیوں صاحب اگر چھوٹا گناہ ہوا تو آپ کا ارادہ کرنے کا ہے اگر کہے ہاں تو میں کہتا ہوں کہ پھر مجھے بھی اجازت دو کہ تمہارے گھر کے چھپر میں ایک چھوٹی سی چنگاری رکھ دوں اور اگر کوئی ایسا کرے اور یہ کہے کہ یہ تو ذرا سی چنگاری ہے اس کا کیا حرج ہے تو تم گوارا کر لوگے اس کا جواب سب یہی دیتے ہیں کہ نہیں کیونکہ ذرا سی چنگاری کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے خدا بری گھڑی نہ لائے تو حضرت ایسی ہی ہر چیز کا بڑھ جانا کیا مشکل ہے خصوصاً گناہ کا اور ایک گناہ تو ایسا ہے جس کا بڑھنا بڑے ہی غضب کا ہے اور اسی سے لوگ بہت بیفکر ہیں یعنی نگاہ بد۔ کان پور میں ایک شخص بوڑھے ثقہ پابند صوم وصلوٰۃ تہجد گزار تھے مگر اس بدنظری کی بدولت ایک یہودن کے عشق میں گرفتار تھے اور یہ حال ہوا کہ ایک دن میرے سامنے

روتے لگے اور کہا کہ اس عشق نے تو میرا ایمان بھی برباد کر دیا نہ میرا اسلام کچھ رہا نہ ایمان پس اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں اور وہ مسلمان ہے تو میں مسلمان ہوں۔ میں تے کہا توبہ توبہ کرو یہ کیا بکتے ہو مگر وہ ایسے بیخود تھے کہ باوجود میرا ادب کرنے کے میرے سامنے بھی ایسے کلمات کفر کہہ گئے۔ حضرت یہ نظر بد سخت خطرناک ہے۔ حدیث میں ہے النظر سھم من سہام ابلیس (روی الحاکم عن ابی حذیفۃ و صح اسنادہ کذا فی تخریج المراقی) کہ یہ شیطان کا تیر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے ؎

درون سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ بحیرتم چہ عجب تیر بے کماں زدۂ

(میرے سینے میں ایسا زخم مارا کہ اسکا نام ونشان بھی نہیں ہے میں حیرت زدہ ہوں کہ بدون کمان کے عجب تیر مارا ہے) واقعی یہ تیر بے کمان ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے رمضان میں تمام گناہوں سے عموماً اور نظر بد سے خصوصاً نہایت اہتمام کیساتھ بچنا چاہیئے یہ مضمون صرف استطراداً بیان ہو گیا کیونکہ اس وقت جو آیت میں تے پڑھی ہے اور اس سے جو مضمون بیان کرنے کا ارادہ ہے اس کو رمضان سے صرف اسی وجہ سے تعلق نہیں ہے کہ آیت میں انفاق کا ذکر ہے اور رمضان میں انفاق کی فضیلت وارد ہے بلکہ زیادہ تعلق دوسری وجہ سے ہے مگر استطراداً کچھ مضمون انفاق کے متعلق بھی بیان کر دیا گیا کیونکہ آیت میں تو انفاق کا بھی ذکر ہے گو مجھ کو مقصود بالذات دوسرا مضمون ہے اب میں اصل مقصود کو شروع کرنا چاہتا ہوں جس کے لئے اول ترجمہ آیت کا سننا ضروری ہے تاکہ ترجمہ نہ جاننے والوں کو بھی ربط کا عجیب ہونا معلوم ہو جائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں (تاکہ آئندہ انفاق بھی اور دوسرے اعمال صالحہ بھی سہولت سے صادر ہوا کریں) ان لوگوں کے صدقات ونفقات کی حالت مثل ایک باغ کی حالت کے ہے جو بلند زمین پر ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جاتے کہ زمین تو نشیب کی اچھی ہوتی ہے جس میں پانی ٹھیرے بلند زمین میں پانی کیونکر ٹھرے گا۔ جواب یہ ہے کہ زمین بلند سے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ وہ گنبد ہے بلکہ بلند بھی ہے اور مسطح بھی ہے کیونکہ بلندی پر ہوا لطیف ہوتی ہے اس کے بعد ارشاد ہے اصابھا وابل اس کو موسلا دھار بارش نصیب ہو گئی تو وہ اپنا پھل دو چند لایا یا چار چند۔ دو باتیں اس لئے کہی کہ ضعف کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ضعف کہتے ہیں مجموعہ مثلین کو تو ضعفین تثنیہ ہے اس کے معنی چار مثل یعنی چار چند کے ہو گئے اور بعض نے کہا ہے

کہ ان مثلین میں سے ہر مثل کو ضعف کہتے ہیں ان کے نزدیک ضعفین کا ترجمہ دوچند ہوگا جیسے زوج کبھی ہر فرد کو کہتے ہیں جس کا تثنیہ زوجین بمعنی صنفین آتا ہے اور کبھی مجموعہ فردین کو کہتے ہیں جیسے دو کے عدد کو زوج کہتے ہیں بمعنی مجموعہ عددین آگے فرماتے ہیں فان لم یصبہا وابل فطل اور اگر اس کو موسلا دھار بارش نہ پہونچے تو پھوار بھی کافی ہے ای فطل یکفیہ او یکفیہ طل یا تو طل مبتدا ہے خبر محذوف ہے یا فاعل ہے جس کا فعل مقدر ہے اور نکرہ کا مبتدا ہونا جو ممنوع ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ مفید نہیں ہوتا اور اگر مفید ہو تو مبتدا ہونا جائز ہے اور یہاں مفید ہے وجہ افادہ کی یہ ہے کہ یہ صورۃً نکرہ ہے اور معنیً نکرہ موصوفہ ہے کیونکہ طل سے مراد مطلق طل نہیں بلکہ وہ طل ہے جو اس باغ سے لگے اس کو پہونچے اس کے بعد ارشاد ہے واللہ بما تعملون بصیر ؕ اس کا ربط آیت کے اجزاء کی تحلیل سے معلوم ہوگا بدون اس کے معلوم نہ ہوگا اور تحلیل اجزاء میں طول ہے اس لئے اس کو ترک کرتا ہوں اگر موقع ہوا تو اخیر میں اس پر بھی تنبیہ کردوں گا خدا کرے یاد رہے۔ اب میں اپنا مقصود جو اس آیت سے مجھے استنباط کرنا ہے بیان کرتا ہوں اور وہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو میں اپنے احباب سے اکثر خاص خطاب سے عرض کیا کرتا ہوں اور آج عام خطاب سے سب کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ پس مسئلہ تو جدید نہیں مگر شاید تقریر میں کچھ جدّت آجائے اور قدیم بھی ہو تو ہر قدیم فرسودہ نہیں ہوتا . . . آسمان کتنا پرانا ہے مگر حالت یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فارجع البصر هل ترىٰ من فطور ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر خاسئا وهو حسيره کہ ذرا دیکھو تو کہیں سے کچھ پھٹا ہوا نظر آتا ہے پھر بار بار دیکھو تو نگاہ تھک کر لوٹ آئے گی (اور کوئی شقاق یا فطور نظر نہ آئے گا) شمس و قمر کتنے پرانے ہیں مگر دیکھو ویسے ہی آب و تاب کی ساتھ اب تک موجود ہیں اور بعضے پرانے نئے بڈھوں سے اچھے ہیں۔ بہرحال مضمون کا جدید ہونا کچھ ضرور نہیں مگر آج کل لوگوں کو جدت کا ہیضہ ہے، ہیضہ مردوں کو بھی

ہوتا ہے گو حیض عورتوں ہی کو ہوتا ہے مگر ہیضہ اور حیض قریب ہی قریب ہے۔ تجوید و قرأت سے کون بولتا ہے عام تکلم و تلفظ میں تو حیض ہیضہ برابر ہے۔ قرأت پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک قاری صاحب نے اپنے شاگردوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ہر بات قرأت سے کیا کرو تو ایک دفعہ حقہ پیتے ہوئے قاری صاحب کے عمامہ پر چنگاری گر پڑی شاگرد نے قاری صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم قرأت کے ساتھ پڑھ کر نہایت ترتیل سے کہا جناب قاری صاحب جناب قاری صاحب آپ کے عمامہ شریف پر آگ کی ایک چنگاری گر پڑی ہے اور ہر جگہ خوب مد کھینچا اتنی دیر میں عمامہ کئی انگل جل گیا وہ مسئلہ یہ ہے کہ آج کل بعض سالکین کو سہولت کی بہت تلاش ہے جس کی وجہ صرف راحت طلبی ہے جیسے ایک طبیب ماہر کہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی ہوتی کہ سارا کھانا ایک دم سے پیٹ میں اتر جایا کرے لقمہ لقمہ نہ کھانا پڑے تاکہ تداخل طعام نہ ہو خیر اس شخص کی اس رائے کی بنا تو ایک مصلحت بھی ہے لیکن آجکل تو ایسا ممکن بھی ہوتا تو اس کی بنا راحت طلبی ہی ہوتی۔ افسوس آجکل سالکین بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے خود بخود سارا کام ایک دن میں ہو جائے یہ سخت غلطی ہے۔ صاحبو! راحت کی جگہ تو عالمِ آخرت ہے اور وہاں بھی جو راحت حاصل ہو گی وہ بھی دنیا کی جہد کا ثمرہ ہے۔

ع چند روزے جہد کن باقی بخند

(چند دن مجاہدہ کر لو پھر تعلق مع اللہ کی دولت پانے کے بعد تمام زندگی بہار دائمی سے ہمکنار رہیگی) بدون مشقت و مجاہدہ کے راحت نصیب نہیں ہو سکتی ہاں اگر حق تعالیٰ خود ہی دنیا میں راحت دیدیں تو اور بات ہے تمکو طلب راحت کا کیا حق ہے تمہارا مذاق تو یہ ہونا چاہیے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر میری جان فدا و قربان ہے دل تو آپ پر قربان ہے جو چاہیں آپ ہمارے ساتھ معاملہ فرمائیں)

مولانا ایسے ہی لوگوں کی بابت فرماتے ہیں ؎

پس زبون وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا

(اے دل اگر تو راہِ عشق کی کلفتوں کو عیش سمجھنے کے بجائے بلا سمجھے گا تو نامراد ہو کر

بُرے وسوسوں میں مبتلا رہے گا)

اور فرماتے ہیں ؎

توبیک زخمی گریزانی زعشق   تو بجز نامی چہ می دانی زعشق

(تو ایک ہی زخم سے اپنے دعویٰ عشق سے بھاگ نکلا پھر تو سوائے نام عشق سن لینے کے اور عشق کا مفہوم تو کچھ نہیں جانتا)

پس آجکل سالکین کی محبت و طلب کی یہ حالت ہے جیسے ایک شخص ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کہا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ کسی ظریف نے سُن لیا اس نے اُس کے ساتھ دل لگی کی کہ اگلے دن اندھیرے سے اس درخت پر ایک رسی ساتھ لیکر جا بیٹھا جب رات کو وہ شخص آیا اور وہی دعا شروع کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ لے تو اس ظریف نے دبی زبان سے کہا کہ اے میرے بندے آج میں تجھے کھینچتا ہوں یہ رسی اپنے گلے میں ڈال لے وہ بڑا خوش ہوا کہ اب مجھے معراج ہو گی رسی کا پھندا فوراً گلے میں ڈال لیا اور ظریف نے کھینچنا شروع کیا جب ایک بالشت زمین سے اٹھا اور پھندے سے گلا گھٹنے لگا تو فوراً کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا اس نے رسی چھوڑ دی اور اس نے فوراً پھندا گلے سے نکالکر اپنے گھر کا رستہ لیا پھر ساری عمر اس درخت کے نیچے جانے کا نام نہیں لیا بس یہی حالت آجکل کے طالبوں کی ہے کہ جبتک تکلیف نہ ہو حتیٰ کہ عمل میں بھی کچھ مشقت نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالےٰ کے ساتھ محبت و عشق کا دعویٰ ہے اور جہاں کچھ تکلیف یا مشقت ہوئی سارا عشق رخصت ہوا حالانکہ ان کو تو جان دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے۔

متاع جان جاناں دینے پر بھی سستی ہے الیٰ آخرہ

مگر اب سالک سالک نہیں ہونا چاہتے بلکہ مالک ہونا چاہتے ہیں اسی لئے سہولت کے طالب ہیں چنانچہ میرے پاس کثرت سے خطوط میں یہ فرمائش آتی ہے کہ کوئی سہل طریقہ آسان سا عمل کوئی سہل سا نسخہ بتلا دیجئے ایسی درخواست کا جواب ایک بزرگ نے خوب دیا ان سے ایک پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر نے یہی درخواست کی تھی کہ کوئی سہل سا طریق بتلا دیجئے

جس سے بہت جلدی کامیابی ہو جائے بزرگ نے ابھی اس کا جواب نہیں دیا بلکہ باتوں میں لگایا اور باتوں باتوں میں ان سے دریافت کیا کہ ڈپٹی صاحب ذرا اپنی سوانح عمری تو بیان فرمائیے کہ آپ نے کیا کیا پڑھا اور کس طرح ڈپٹی کلکٹر ہوئے ۔ انھوں نے اپنی سرگذشت بیان کی کہ بارہ سال تک انگریزی پڑھی بی ۔ اے کا امتحان دیا پھر قانون کا امتحان دیا پھر سال بھر تک ملازمت کے لئے سفارشیں حاصل کیں درخواستیں دیں تو نائب تحصیلدار ہوا پھر کئی سال کے بعد تحصیلدار ہوا پھر ڈپٹی کلکٹر ہوا اور سالہا سال کی ملازمت کے بعد اب پنشن ملی ہے ۔ جب یہ اپنی سرگذشت بیان کر چکے تو بزرگ نے فرمایا کہ آپ کو شرم تو نہیں آتی کہ دنیا مردار کیلئے تو اتنی عمر برباد کی اور مشقتیں برداشت کیں اور طلب خدا کے لئے یہ درخواست ہے کہ تھوڑی سی مدت میں کامیابی ہو جائے ۔ ڈپٹی صاحب کم از کم طلب خدا کے لئے اس سے دگنی مدت تو صرف کرو کیونکہ آخرت دنیا سے افضل ہے ۔ تو افضل کے لئے مفضول سے دگنی مدت تو چاہئے ورنہ مساوی تو ضرور چاہئے ۔ واقعی عقل کا مقتضیٰ تو یہی ہے جو ان بزرگ نے فرمایا ۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جو لوگ طلب خدا میں سہولت کے طالب ہیں وہ کیسی سخت غلطی میں مبتلا ہیں ہم کو تو وہ کام کرنا چاہیئے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے ۔ وصول وحصول کا تقاضا نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہماری برائے نام کوشش پر وصول وحصول کا مرتب ہو جانا خود خلاف قاعدہ ہے تو اس برائے نام کوشش پر حصول ثمرات کا اپنے کو مستحق سمجھنا اور عدم حصول پر شکایت کرنا سخت ناانصافی ہے اور وہ کام کیا ہے جس کا ہم کو حکم ہوا ہے وہ تحصیل عمل بالاختیار ہے کہ اپنے اختیار کو صرف کر کے اعمال کو بجالائیں اور اسی استعمال اختیار کا دوسرا لقب امانت ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان ط کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین وجبال پر پیش کی کہ اس کا تحمل کرتے ہو تو سب نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا ۔ اس امانت سے مراد کیا ہے ۔ محققین علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تکلیف تشریعی مراد ہے اور تکلیف کے معنی تحصیل عمل بالاختیار کیونکہ مطلق عبادت واطاعت سے تو کوئی شے خالی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم استوی الی السماء

وھی دخان فقال لہا وللارض ائتیا طوعا او کرھًا قالتا اتینا طائعین ط کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہمارے احکام (تکوینیہ) کے لئے تیار ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے تیار ہیں اور لفظ طائعین سے صاف رد ہو رہا ہے ان لوگوں کا جو سموات و ارض و جمادات کی عبادت کو حالیہ یا قسریہ کہتے ہیں میں کہتا ہوں کیا قسر و حال میں طوع بھی ہوا کرتا ہے ہرگز نہیں۔ بہر حال عادل و مطیع تو تمام مخلوقات ہیں لیکن مکلف سب نہیں بجز انسان کے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف و اطاعت میں فرق ہے اور جس امانت سے تمام عالم گھبرا گیا وہ تکلیف ہی ہے جس سے مراد عمل مع الاختیار ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے کچھ احکام تشریعیہ ہیں ان کا مکلف بالاختیار کون ہوتا ہے یعنی جو شخص ان کا تحمل کریگا اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کی جاوے گی یعنی اس کی قوت ارادیہ ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ ہوگی بلکہ عمل و عدم عمل دونوں پر قدرت دیجائے گی پھر جو اپنے اختیار سے احکام کو بجالائے گا اسکو مقرب بنالیا جائے گا اور جو اپنے اختیار سے احکام میں کوتاہی کریگا اس کو مطرود کر دیا جائے گا۔ اس سے سموات و ارض و جبال اور تمام مخلوق ڈر گئی۔ انسان اس کے لئے تیار ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مکلف بنا دیا یعنی اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کر دی گئی۔ باقی مخلوقات میں یہ صفت اختیار اور عقل نہیں ہے (وہ جن احکام تکوینیہ کو یا عبادت کو بجالاتے ہیں وہ ان کیلئے طبعی ہیں یعنی ان کی قوت ارادیہ اس کے خلاف کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی بخلاف انسان کے کہ جن احکام کلیہ مکلف ہے وہ اس کے لئے طبعی نہیں بلکہ اس کی قوت ارادیہ عمل و عدم عمل دونوں کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اب اس کی تکلیف کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ اپنے اختیار سے ایک جانب کو ترجیح دے یعنی جانب عمل کو مامورات اور جانب عدم عمل کو منہیات میں اسی کا نام تحصیل عمل ہے) اور اس سے یہ لازم نہیں کہ غیر انسان عاقل نہ ہو ممکن ہے کہ دوسری مخلوقات بھی عاقل ہوں مگر عاقل کامل نہیں یعنی ان کو عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں جو تکلیف احکام کے لئے کافی ہو۔ آخر صبی مراہق بھی تو عاقل ہے مگر باوجود عقل کے مکلف نہیں کیونکہ اس کی عقل کامل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو اور چونکہ اس پر کوئی شرعی اشکال لازم نہیں آتا اس لئے میں اسکا قائل ہوں کہ تمام

مخلوقات، حیوانات و نباتات حتیٰ کہ جمادات بھی عاقل ہیں یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ انسان کے سوا سب غیر عاقل ہے ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو پس وہ مثل مراہق کے عاقل ہو سکتے ہیں اس کی کسی نص سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے۔ آخر ہدہد کی گفتگو حضرت سلیمانؑ کی ساتھ جو قرآن میں مذکور ہے کیا یہ سب طبعی کلام ہے ہرگز نہیں بلکہ عاقلانہ کلام ہے اور اگر اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ قرار دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کے لئے بعض حیوانات کو عقل دیدی تھی تو میں کہوں گا کہ اب بھی بعض حیوانات کی حرکات ایسی ہوتی ہیں جن کو خالی از عقل کہنا دشوار ہے چنانچہ جس کی حکایت میں اب بیان کرتا ہوں وہ مرحوم[1] مر گیا یعنی ہمارے گھر میں ایک طوطا تھا اس نے ایک دن بیبیوں کو پان کھاتے دیکھ کر خود بھی پنجرہ سے نکلکر اس ترتیب سے پان کھایا کہ اول تو پان کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا پھر چونہ کی ڈبیہ میں سے چونچ پر ذرا سا چونہ لیا پھر کتھ کی ڈبیہ میں سے کتھ لیا اور دو دانہ چھالیہ کے اٹھائے اور سب کو ملا کر کھا گیا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں ہی تمباکو کی ڈبیہ بھی مگر تمباکو کو نہیں کھایا سب کو اس حرکت پر حیرت ہو گئی کہ اس نے کیونکر باقاعدہ سارا کام کیا اور جب حیوانات میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو سکتا ہے اور اس کے بعد بھی وہ مکلف نہیں تو یہاں سے سمجھ لو کہ اگر مجاذیب میں بھی ایک درجہ عقل کا ہو تو کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے اور یہ نہ کہنا چاہئے کہ ان کو تو کھانے پینے کا پورا ہوش ہے پھر یہ مجذوب کدھر سے ہوئے اسی لئے شیخ ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ مجاذیب پر اعتراض نہ کرو گو ظاہر میں وہ صحیح الحواس معلوم ہوں کیونکہ صحت حواس تو بہائم میں بھی ہے جانور بھی اپنے نفع و نقصان کو سمجھتا ہے مگر اتنے ادراک سے وہ مکلف نہیں ہوا تو مجذوب بھی باوجود عقل قلیل کے غیر مکلف ہو سکتا ہے جس کی مثال واضح وہی ہے صبی مراہق کی مگر اس کے لئے ایک معیار بھی ہے کہیں تم کافروں کو بھی مجذوب نہ کہنے لگو وہ معیار یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ دانایاں ہمیں گفتہ ہمیں ہست دانا رحمۃ للعالمیں

(جملہ اہل عقل کا مقولہ ہے اور واقعی دین کا محقق تمام کائنات کے لئے اپنے دور حیات میں رحمت ہوتا ہے)

---

[1] ظرافت سے مرحوم کہدیا ۱۲

یہ دوسرا مصرعہ جملہ معترضہ ہے جو بطور مدح کے درمیان میں لایا گیا ہے کہ واقعی محقق بھی عالم کے لئے سراپا رحمت ہے یہ گفت کا مقولہ نہیں اس کا مقولہ اگلے شعر میں ہے ؎

گر انارے می خری خنداں بخر   کہ دہد خندہ اش ز دانہ او خبر

(شعر اول میں جملہ اہل عقل کا مقولہ یہ ہے کہ جب انار خریدنے کا ارادہ ہو تو کھلا ہوا خریدنا کیونکہ انار کا کھلنا اس کے اندر کے دانوں کی حالت سے آگاہ کرتا ہے)

کہ اگر ایک انار خریدو تو کھلا ہوا خریدو کیونکہ کھلے ہوئے انار کا اندرونی حال ظاہر ہو جاتا ہے بند انار مت لو کہیں اندر سے کچا اور خراب نہ نکلے ؎

نامبارک خندۂ آن لالہ بود   کہ خنداں او سواد دل نمود

(گل لالہ کا کھلنا اس کے لئے نامبارک ہے کیونکہ اس سے اس کے اندر کا عیب (سیاہی) ظاہر ہو جاتا ہے)

مطلب یہ ہے کہ جس شخص کی صحبت اختیار کرو اور اس سے فیض لینا چاہو تو پہلے علامات و آثار کو دیکھ کر اسے جانچ لو اگر وہ سالک ہو تو آثار سلوک کو دیکھو اور اگر مجذوب ہو تو یہ دیکھو کہ اس زمانہ کے صلحاء اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں اگر وہ اس کو مجذوب کہیں اچھا سمجھیں تو وہ اچھا ہے گو نماز روزہ کا پابند نہ ہو۔ اگر صلحاء زمانہ اس کو مجذوب نہ سمجھیں اور ظاہری حالت اس کی خلاف شرع ہو تو اس کے پاس نہ جاؤ تو امانت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات سے فرمایا کہ یہ صفت اختیار ہے اور یہ عقل ہے ان کو کون لیتا ہے جو ان کو لے گا وہ مکلف احکام بنایا جائیگا اس سے سب ڈر گئے اور انسان تیار ہو گیا پس مکلف بجز انسان و جنات کے کوئی نہیں اور شمس و قمر و احجار جو جہنم میں جائیں گے تو معذب ہو کر نہ جائیں گے تاکہ تکلیف کا شبہ ہو بلکہ آلۂ تعذیب ہو کر جائیں گے تاکہ کفار کو ان کو دیکھ کر حسرت ہو کہ افسوس ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا جو ہماری تو کیا اپنی بھی امداد نہیں کر سکتے اور گو امداد امداد کا علم غیبت میں بھی ہو سکتا تھا مگر اس صورت میں کفار کو یہ وسوسہ ہوتا کہ نہ معلوم خدا تعالیٰ نے ہمارے معبودوں کو کہاں مقید کر دیا جو ہماری امداد نہ کر سکے اس لئے سب کو پاس پاس کر دیں گے کہ لو یہ تمہارے معبود ہیں اگر ان میں کچھ طاقت ہے تو ان سے امداد طلب کر لو اس صورت میں ان کو حسرت زیادہ ہوگی اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کو

کیا سوجھی تھی جو اس امانت کے لئے تیار ہو گیا کیا یہی سب سے بڑا تیس مارخاں تھا اس کا جواب یہ ہے کہ انسان میں عشق کا مادہ بہت زیادہ ہے اسی لئے میں ابتداء طالب علمی میں کہا کرتا تھا کہ انسان کی حقیقت حیوان عاشق ہے اس کی فصل عاشق ہے کیونکہ ناطق تو جنات و ملائکہ بھی ہیں عاشق انسان کے سوا کوئی نہیں (اور عشق و محبت میں فرق ہے اس لئے محبت کا وجود ملائکہ و جنات میں بھی ہو سکتا ہے میں محبت کی ان سے نفی نہیں کرتا عشق کی نفی کرتا ہوں جس کے لئے جوش اور شوق اور ہیجان و ولولہ لازم ہے ۱۲) غرض انسان میں عشق بہت زیادہ تھا اور اس وقت بھی تھا جبکہ اسکو عقل کامل بھی عطا نہ ہوئی تھی (کیونکہ عقل کامل تو بعد حمل امانت کے عطا ہوئی) اور غلبۂ عشق تو قلت عقل ہی میں زیادہ ہوتا ہے اسی لئے کیفیات باطنہ کا غلبہ قلیل العقل پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ غلبۂ کیفیات کے لئے یکسوئی شرط ہے جو غیر عاقل کو زیادہ میسر ہوتی ہے اور عاقل کو تو یکسوئی کے برابر بھی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دماغ برابر کام کرتا رہتا ہے اور یہ گفتگو قاعدہ کی بنا پر ہے ورنہ باب جذب الٰہی ہر شخص پر مفتوح ہو سکتا ہے وہ کسی قاعدہ سے مقید نہیں۔ بہر حال انسان کے عمل امانت کا منشا عشق تھا اور اس کو میں نے عارف شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　　قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان نے شریعت کے بار کو اٹھانے سے عاجزی ظاہر کی اور ہم دیوانوں کے نام قرعۂ فال نکل آیا یعنی انسان نے سر پر یہ بار اٹھالیا۔)

اس میں لفظ دیوانہ سے منشاء حمل امانت پر اشارہ ہے (اور اسی سے معلوم ہو گیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے جو محبت کے علاوہ درجہ ہے ۱) جب یہ معلوم ہو گیا کہ امانت اختیار و عقل کا نام ہے تو جو لوگ تسہیل کے طالب ہیں وہ اس امانت اختیار کو برباد کرنا چاہتے ہیں کہ بس ہم کو اپنے ارادہ اور اختیار سے کچھ نہ کرنا پڑے مفت سہولت سے کام ہو جایا کرے کوئی ایسا حال غالب ہو جائے کہ گناہ خود بخود چھوٹ جائیں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے ایسا استغراق ہو جائے کہ نماز میں خود بخود دل لگنے لگے ہمکو احضار قلب کی ضرورت نہ ہو گویا یہ شخص صفت اختیار کو معطل کرنا چاہتا ہے اور جو شخص امانت الٰہیہ کو اور ایسی بڑی نعمت کو ضائع کرے جس میں انسان تمام مخلوق سے

ممتاز ہے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا بزرگوں نے تو اللہ تعالٰی کے تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے کہ ایک بزرگ نے کسی صوفی کے متعلق سنا کہ وہ کھانا کھاتے ہوئے لذیذ شوربے میں پانی کا پیالہ بھر کر ڈالدیتا ہے تاکہ نفس کو لذت نہ آئے فرمایا طفل طریقت ہے یہ اس تجلی الٰہی کو ردّ کرتا ہے جو لذیذ طعام کے ساتھ متعلق ہے اور اس حکمت کو برباد کرتا ہے جو لذائذ دنیا میں رکھی گئی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ یہ نمونہ ہوں لذائذ آخرت کا مگر اس تجلی کا انکشاف اور اس حکمت کی معرفت محض نیت کرنے اور تو بیت ان اکل اللذیذ لیکون انمودجا للاخرۃ کہنے سے حاصل نہیں ہوتی کہیں آپ آج ہی سے نفس پرستی اور لذات میں انہماک شروع کردیں بلکہ اس کی معرفت بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(صوفی کے نفس کی صفائی نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اللہ تعالٰی کی محبت کا جام نہ پیئے بہت مجاہدات کے بعد خامی پختگی سے تبدیل ہوتی ہے) اس لئے بسیار سفر کی ضرورت ہے اور بسیار سفر کو تو آپ کیا سمجھیں گے میں اس وقت دو سفر بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سالک کا ایک سفر تو الی الاحوال ہے کہ اس پر حالات طاری ہوتے ہیں اور ایک دوسرا سفر من الاحوال ہے جس میں وہ سب احوال سلب ہوجاتے ہیں پھر اس کے بعد دوسرے نوع کے احوال عطا ہوتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے باغ میں درختوں پر دو قسم کے پھول آتے ہیں ایک جھوٹا پھول ہوتا ہے وہ چند روز کے بعد جھڑ جاتا ہے اس وقت ناواقف روتا ہے کہ ہائے میرا باغ برباد ہوگیا مگر محقق خوش ہے کہ الحمد للہ سفر اول ختم ہوکر سفر ثانی شروع ہوا (اول عروج ہے۔ دوسرا نزول ہے ۱۲ ظ) پھر سچا[ه] پھول آتا ہے وہ باقی رہتا ہے اب اس پر پھل لگنے شروع ہوتے ہیں یا جیسے صبح دو ہوتی ہیں کاذب جس کا نور جلدی ہی زائل ہو جاتا ہے۔ دوسری صادق جس کا نور بڑھتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

اے شدہ تو صبح کاذب را رہین   صبح صادق را ز کاذب ہم ببین

(اے شخص تو صبح کاذب کے فتنے میں پڑ گیا اور دھوکہ سے اسی کو صبح صادق سمجھ گیا حالانکہ صبح صادق کی تحقیق تجھ پر لازم تھی تاکہ کاذب اور صادق کا فرق معلوم کرسکے)

[ه] اور عجیب بات ہے کہ پہلا پھول زیادہ بھڑک دار ہوتا ہے۔ دوسرا بھڑک دار نہیں ہوتا یہی کیفیت حالات تلوین تمکین کی ہے ۱۲ ظ

مولانا نے سفر اول کو صبح کاذب سے تشبیہ دی اور سفر ثانی کو صبح صادق سے کہ جیسے اول صبح کاذب کی روشنی آتی ہے جس کی روشنی بڑھتی چلی جاتی ہے اسی طرح سالک پر دو حالتیں گذرتی ہیں ایک میں احوال ناقصہ عطا ہوتے ہیں اور دوسری منزل میں احوال ناقصہ سلب ہو کر احوال کاملہ عطا ہوتے ہیں۔ اب یہ شخص پختہ ہوگیا اس کو حق ہے کہ لذائذ بھی کھائے اور عمدہ لباس بھی پہنے کیونکہ اب یہ ہر شے میں تجلی حق کا مشاہدہ کرتا اور اس کا حق ادا کرتا ہے۔ صوفی خام کو حق نہیں کہ مرغ مسلم کھایا کرے لیکن اگر بلا تکلف مل جائے تو انکار بھی نہ کرے کھالے بشرطیکہ حلال ہو اور حلال بھی خالص ہونا ضرور نہیں بلکہ نخالص بھی کافی ہے یعنی جو فتوی سے حلال ہو بس وہ حلال ہے زیادہ کاوش اور تقوی بھگارنے کی ضرورت نہیں جیسے ایک شخص کی ہمارے قصبہ کے افسر پولیس نے دعوت کی تھی آپ نے دعوت قبول کر کے عین وقت پر کھود کرید شروع کی کہ یہ دودھ کہاں سے آیا گوشت کس طرح آیا غلہ کیسے داموں سے آیا تنخواہ کے روپیہ سے یا رشوت سے غرض بھرے مجمع میں داعی کو ذلیل کیا یہ تقوی کا ہیضہ ہے اگر کسی شخص پر اطمینان نہ ہو تو یا تو اس کی دعوت ہی منظور نہ کرے لطیف پیرایہ سے عذر کر دے یہ نہ کہے کہ آپ کی آمدنی حرام ہے اس لئے دعوت قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس عنوان سے اس کی دل شکنی ہوگی باقی امر بالمعروف کے لئے اور بھی بہت دقت ہے اسیوقت امر بالمعروف ضرور نہیں کیونکہ امر بالمعروف میں یہ بھی شرط ہے کہ ایسا وقت اور موقعہ تجویز کرے جس میں مخاطب کے قبول کی امید ہو بس یا تو عذر کر دے یا یہ کر دے جیسا میں نے ایک تھانہ دار سے معاملہ کیا انھوں نے میری دعوت کی میں نے مجمع کے سامنے تو بلا شرط قبول کر لی پھر تنہائی میں لیجا کر ان سے کہدیا کہ ذرا کھانے میں اس کی رعایت رکھی جائے کہ تمام سامان تنخواہ کی رقم سے کیا جائے۔ وہ کہنے لگے صاحب بھلا یہ کب ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی ناپاک مال کھلاؤں۔ اس طرح اپنا بھی بچاؤ ہوگیا اور داعی کی دل شکنی بھی نہ ہوئی غرض یہ کہ جو مال فتوی سے حلال ہو اس میں تامل نہ کرو۔ مولانا فضل الرحمٰن خاں صاحب گنج مرادآبادی کے ایک خلیفہ تھے جو حاضر خدمت رہتے تھے ایک بار مولانا کے یہاں کہیں سے کھانا آیا حضرت

نے ان کے پاس بھیج دیا وہ کہنے لگے کہ آپ نے کچھ تفتیش بھی کرلیا ہے کہ حلال ہے یا حرام تو مولانا نے فرمایا ارے کھالے بڑا حلال کھانے والا آیا زیادہ تحقیق کرے گا تو بھوکوں مرجائے گا۔ مولانا کا مطلب بھی یہی تھا کہ جو مال فتوی سے حلال ہو وہی کافی ہے گو اہل ورع کے نزدیک حلال نہ ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اہل اللہ کو تو عطائے حق کی اتنی قدر ہے کہ ان بزرگ نے شوربہ میں پانی ملانے والے صوفی کو طفل طریقت فرمایا کہ تجلی الٰہی کو برباد کرتا ہے اور وہ تجلی مذکور ہے نعماء آخرت کی اور اس کو فقہا نے بھی سمجھا ہے میں ان کو بھی حکماء امت سمجھتا ہوں جیسا کہ صوفیہ کو سمجھتا ہوں اور حیرت ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں بڑا جھگڑا ہے مگر یہ جھگڑا غیر محققین میں ہے محقق دونوں کا جامع ہوتا ہے تو ہدایہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ چار انگشت تک ریشم مردوں کو بھی جائز ہے وہاں ایک دلیل تو نقلی لکھی ہے اور ایک دلیل عقلی لکھی ہے لتکون انموذجا لحریر الجنة یعنی تھوڑا سا ریشم مردوں کے لئے اس واسطے جائز کر دیا گیا تاکہ حریر جنت کا نمونہ سامنے ہو جائے پھر یہ حکمت دیگر لذائذ ونعم کو بھی عام ہے اس لئے اس کے ابطال کو محقق نے ناپسند کیا اور مبطل کو طفل طریقت کہا اسی طرح جو شخص سہولت کا طالب ہے وہ امانت الٰہیہ اختیار کو باطل کر رہا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے اہل اللہ نے بہت سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

چنانچہ ایک بار حضرت غوث اعظم رح وعظ فرما رہے تھے کہ درمیان میں دفعۃً ساکت ہوگئے اور کچھ دیر تک ساکت رہ کر پھر بیان شروع فرمایا اور کہا کہ اس وقت میرے سکوت کی یہ وجہ ہوئی کہ ایک بزرگ ابھی شام سے بغداد ایک قدم میں بطور کرامت کے آئے تھے میں نے ان کو متنبہ کیا ہے کہ اس تصرف میں حکمت عطائے قدم کا ابطال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قدم اس لئے دیئے ہیں تاکہ ان سے مشی کا کام لیا جائے جب بطور کرامت کے راستہ طے کیا جائے گا تو اس میں یہ حکمت باطل ہوگی وہ بزرگ اس سے توبہ کرکے واپس ہوگئے (مطلب یہ ہے کہ از خود ایسا تصرف نہ کرنا چاہیئے اور اگر بلا قصد کے کبھی حق تعالیٰ طویل راستہ کو قصیر کر دیں تو وہ کرامت غیر اختیاریہ ہے

جو نعمت سے ہے نیز طے طریق کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں جیسا حدیث میں ہے اللھم اطو عنا البعد صرف تعرف بالقصد کی ممانعت ہے ۱۲) اسی طرح ایک بار ہمارے حضرت حاجی صاحب کے یہاں بے وقت بہت سے مہمان آگئے گھر والوں کو فکر ہوئی تو حضرت نے اپنا رومال گھر میں بھیجدیا کہ اس کو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کرو ان شاء اللہ تعالےٰ برکت ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایسی برکت ہوئی کہ سب مہمانوں نے فراغت سے کھانا کھالیا اور بہت بچ رہا۔ اس کی اطلاع حضرت حافظ محمد ضامن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کو ہوئی تو آپ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کرامت مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا تعرف عطا فرمایا۔ بس آپ کا رومال سلامت رہے۔ پھر دنیا میں قحط تو کیوں آئے گا۔ اور قحط میں جو حکمتیں ہیں وہ کیوں باقی رہیں گی۔ حضرت حاجی صاحب کو تنبیہ ہوا اور فرمایا حافظ صاحب میں اس سے توبہ کرتا ہوں ان شاء اللہ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔ تو حضرت جب اہل اللہ نے حق تعالےٰ کی ذرا ذرا سی تجلیات کی اس قدر عظمت کی ہے اور ان کی حکمتوں کے ابطال کی ممنوع قرار دیا ہے تو بتلایئے اتنی بڑی امانت کا ابطال جس پر تکلیف کا مدار ہے کیونکر ممنوع ہوگا۔ اب میں ان لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں جو طریق میں سہولت کے طالب ہیں کہ وہ اس بے ادبی سے توبہ کریں جس کا بے ادبی ہونا بھی شاید ان کو اب تک معلوم نہ ہوا ہوگا بلکہ وہ اب تک اس طلب سہولت کو دینداری سمجھتے ہوں گے مگر وہ کان کھول کر سن لیں کہ اس طلب میں وہ امانت الٰہیہ کا ابطال کر رہے ہیں بس سہل یہ ہے کہ وہ بجائے تسہیل کے اسہال لے لیں جس سے ضعف ہو جائے گا تو پھر یہ معذور ہو جائیں گے۔ اس وقت مولانا ان کے لئے عذر کا فتویٰ دیدیں گے، پھر وضو کی جگہ تیمم ہو جائے گا اور زیادہ ضعف ہوا تو بجائے قیام کے قعود رہ جائے گا اور اس سے بھی زیادہ ضعف ہوا تو صوم و صلوٰۃ سب ساقط ہو جائیں گے جو کامل سہولت ہے اور جب تک معذور نہیں ہوئے اس وقت تک سہولت کی طلب کے کیا معنی جو کہ معذورین کے لئے خاص ہے بلکہ غور کیا جائے تو وہاں بھی ان کو سہولت مزعومہ نہیں ہے کیونکہ اس عذر کے

سبب وہ سہل عمل بھی ان کو دشوار ہو گا۔ خلاصہ یہ کہ تم تحصیل عمل کے مکلف ہو کر اپنے اختیار کو صرف کر کے عمل کرو تم کو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں۔ ہاں صرف اتنا حق ہے کہ عمل تمہارے اختیار و قدرت سے خارج نہ ہو سو اس کا شریعت میں پورا لحاظ ہے کہ امور غیر اختیاریہ کا تم کو مکلف نہیں کیا بلکہ اختیارات کا مکلف بنایا ہے اب تم یہ چاہتے ہو کہ اختیارات میں ارادہ واختیار و قدرت کے استعمال کی بھی ضرورت نہ رہے اس کا تم کو کیا حق ہے بلکہ اس میں سراسر ابطال امانت اختیار ہے جس کا جرم ہونا اوپر واضح ہو گیا پس تم کو تو طلب تسہیل کا کوئی حق نہیں ہاں اگر شریعت کسی جگہ خود تسہیل کا لحاظ کرے تو یہ اس کی عنایت ہے مگر تم کو اس کے مطالبہ کا حق نہیں۔ اور نصوص میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے بعض مقامات پر تحصیل و تسہیل دونوں کو جمع بھی کر دیا ہے مگر اس کا التزام نہیں کیا بعض جگہ محض تحصیل عمل کا امر ہے تحصیل میحوث عنہ کی رعایت نہیں کی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شریعت میں کہیں تو صرف امر و نہی ہے کہ اس کام کو کرو اور اس کو نہ کرو یہ تو تحصیل کا عنوان ہے اور کہیں امر و نہی کی ساتھ سہولت عمل کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے جس میں تکلیف و عنایت دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ مگر اس سے یہ سمجھ لینا کہ شارع کے ذمہ تسہیل بھی ہے سخت نادانی ہے۔ شارع کو حق ہے کہ امور اختیاریہ کی تحصیل کا امر کرے اور سہولت عمل کا طریقہ نہ بتلائے اور اگر چاہے تو بتلا بھی دے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھ کر اب سنئے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے انفاق کا امر فرمایا ہے یہ تو تحصیل ہے مگر اس میں تکلیف کی ساتھ عنایت کو بھی جمع کر دیا ہے بعبارت دیگر یوں کہئے کہ طلب تحصیل کی ساتھ تسہیل کی بھی رعایت کی ہے بیان اس کا یہ ہے کہ انفاق فعل اختیاری ہے اور فعل اختیاری کے لئے عادۃً تصور غایت ضروری ہے جس کے بغیر صدور نہیں ہو سکتا پس صدور فعل کے لئے تصور غایت کا شرط عادی ہونا ضروری ہے اور وہ بھی اکثری لیکن اس میں مجھ کو کلام ہے کہ تصور غایت عقلاً بھی لازم ہے یا نہیں حکماء اس کو عقلاً لازم کہتے ہیں اسی لئے تصور غایت کو علت شمار کیا ہے جس کو علت غائیہ سے موسوم کرتے ہیں مگر اس کے لزوم عقلی میں

کلام ہے۔ آپ مدرسہ میں جاکر طلباء سے پوچھئے کہ وہ کس لئے پڑھ رہے ہیں سو میں سے ساٹھ بھی غایت نہ بتلا سکیں گے اور جو بتلائیں گے بھی ان میں بہت سے اسی وقت گھڑیں گے اور لیجئے کھانا تو سب کھاتے ہیں اور یہ فعل اختیاری ہے ذرا بتلا دو کہ کھانے کے وقت کیا غایت ذہن میں ہوتی ہے اور کیا سوچ کر کھاتے ہو یقیناً بہت سے آدمی کچھ بھی نہیں سوچتے اور کوئی غایت ان کے ذہن میں نہیں ہوتی ہاں جو ان پڑھ ہیں ان کی تو البتہ اس میں ایک غایۃ ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ خائط (پاخانہ ۱۲) کہ کھائیں اور ہگیں۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ بھی لازم التصور نہیں بلکہ لازم الترتب آپ تعجب کریں کہ یہ کیسی غایت ہے ایک بڑے فلسفی نے یعنی صاحب شمس بازغہ نے بھی شمس بازغہ میں غایت کی یہ بھی ایک قسم لکھی ہے کالتغوط للاکل بندہ خدا کو مثال بھی ایسی ہی ملی مگر اعتراض کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہر شخص کا اپنا اپنا مذاق ہے ان فلسفیوں کی طبیعت ایسی ہی ہوگی۔ جیسے ایک بادشاہ نے چار سمت کی چار عورتیں جمع کی تھیں ایک دفعہ اس نے سب کی طبائع کا امتحان کرنا چاہا اور رات کے اخیر حصہ میں سب سے پوچھا کہ اب کیا وقت ہے سب نے باتفاق کہا کہ صبح ہوگئی اس نے دلیل پوچھی تو ایک نے کہا کہ میری نتھ کا موتی ٹھنڈا ہو گیا ہے یہ بہت لطیف وجہ بیان کی کیونکہ صبح کی ہوا میں خنکی زیادہ ہوتی ہے اس نے موتی کی ٹھنڈک سے اس پر استدلال کیا۔ دوسری نے کہا کہ پان کا مزہ منہ میں بدل گیا ہے۔ تیسری نے کہا کہ شمع کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے یہ دلائل تو لطافت ادراک پر مبنی تھے۔ چوتھی نے کہا کہ میرا گوہ آ رہا ہے بادشاہ نے اس بیوی کو الگ کر دیا کیونکہ اس کے جواب سے کثافت فہم مترشح تھی تو جیسے ان جوابات کی بناء اختلاف مذاق پر تھی ایسے ہی شمس بازغہ کی مثال ان فلسفیوں کے مذاق کی خبر دے رہی ہے۔ غرض مجھے افعال اختیاریہ میں تصور غایۃ کا لزوم عقلی مسلم نہیں ورنہ تخالف نہ ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعادۃ اکثریہ بدون تصور غایۃ کے افعال اختیاریہ کا صدور دشوار ہے خصوصاً افعال شاقہ کا اور انفاق فعل شاق ہے تو اس کے قبل اس کی غایت کا تصور ضروری ہوگا سو یہاں دو غائتیں مذکور ہیں۔ اول غایت کو یہ بیان فرمائی ابتغاء مرضات اللہ کہ وہ لوگ

اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لئے اس غایۃ کا اثر تو تحصیل ہے کہ اس کے تصور کے بغیر اس فعل اختیاری کا صدور عادۃً دشوار تھا اس کے بعد ایک اور غایۃ بیان فرماتے ہیں وتثبیتا من انفسھم مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں من بمعنی لام ہے ای تثبیتا لانفسھم یعنی دوسری غرض انفاق میں یہ ہوتی ہے کہ اپنے نفسوں میں (اعمال کے اندر) پختگی پیدا کریں اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض بخیلوں کو انفاق میں بہت دشواری ہوتی ہے جن کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   در زر طلبی سخن درایں است

(اگر جان طلب کرو تو کوئی حرج نہیں مگر مال اگر طلب کروگے تو اس میں اعتراض ہوگا)

جیسا مولانا نے ایک بدوی کا قصہ لکھا ہے کہ سفر میں ایک کتا اس کا رفیق تھا وہ مرنے لگا تو بدوی اس کی مفارقت کے غم میں رونے لگا۔ کسی مسافر نے پوچھا کہ تو کیوں روتا ہے کہا یہ کتا میرا رفیق سفر تھا اب یہ مر رہا ہے میں اس کے غم میں رو رہا ہوں پوچھا اس کو تکلیف کیا ہے کہا بھوکا ہے فاقہ سے مر رہا ہے اس نے دیکھا کہ ایک طرف ایک پوٹلا بندھا ہوا رکھا ہے بدوی سے پوچھا کہ اس پوٹلہ میں کیا ہے کہا سوکھی ہوئی روٹیاں ہیں کہا ظالم جب تجھے اپنے کتے سے اس قدر محبت ہے کہ اس کے غم میں رو رہا ہے تو اس میں سے ایک روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا تو وہ کہتا ہے ؎

گفت ناید بے درم در راہ ناں   لیک ہست آب دو دیدہ رائگاں

(اس نے کہا کہ روٹی تو بغیر مال کے نہیں ملتی اور آنسو تو مفت کے نکل آتے ہیں)

کہ مجھے اتنی محبت نہیں جو اسے روٹیاں کھلا دوں روٹی کو تو دام لگے ہیں اور آنسو مفت کے ہیں بس میں اتنی ہی محبت رکھتا ہوں کہ اس کو رو لوں تو حق تعالےٰ وتثبیتا من انفسھم میں ایسے بخیلوں کے لئے انفاق کی دشواری اور تنگی رفع کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم انفاق اسی نیت سے کرو کہ اس سے نفس میں قوت پیدا ہوگی اور انفاق سہل ہو جائیگا۔ بار بار اسی نیت سے انفاق کرو تو یہ مادہ راسخ ہو جائیگا اس غایت کا اثر تسہیل ہے اور جو طریقہ سہولت انفاق کا یہاں بتلایا گیا ہے یہ تمام اعمال

میں جاری ہے کہ تکرار عمل سے ہر عمل صعب سہل ہو جاتا ہے گو فطری خلق کی برابر سہولت نہ ہو یعنی جیسے فطری سخی کو انفاق میں سہولت ہوتی ہے ویسی آسانی گو نہ ہو مگر تکرار سے بھی بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے خصوصاً جبکہ تکرار اسی غرض سے ہو تاکہ عمل سہل ہو جائے اور یہ غرض گو بالذات مقصود نہیں بلکہ غرض اول اصل ہے مگر چونکہ اس بخیل کو انفاق دشوار تھا اس لئے دوسری غرض کو تسہیل کے لئے. بیان فرما دیا اسی طرح ایک حدیث میں ہے یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء متفق علیہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ایک غرض بیان فرما دی کہ اس سے عفت فرج وحفاظت نگاہ سہل ہو جاتی ہے. اصل مطلوب تو تحصین فرج وغض بصر ہے جو کہ بدون نکاح بھی قدرت و اختیار میں ہے. مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا بھی امر فرما دیا کیونکہ وہ اس مطلوب کی تسہیل کا وسیلہ ہے اسی لئے اغض واحصن صیغہ تفضیل سے فرمایا یعنی یہ غض وتحصین میں زیادہ معین ہے اور اسی لئے نکاح کو غض بصر وحصن فرج کی غایۃ تسہیل کہا ہے کیونکہ نگاہ وشرمگاہ کی حفاظت بدون نکاح کے بھی ممکن ہے کیونکہ نگاہ کا اٹھانا امر اختیاری ہے کوئی دوسرا تو سر نہیں اٹھا دیتا اور یہ امر مشاہد ہے لیکن اس شخص کو اس میں دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نظر میں مضطر ہوں اور دھوکہ اضطرار کا اس لئے ہوتا ہے کہ آجکل لوگ عموماً نگاہ نیچی رکھنے کے عادی نہیں. اونٹ کی طرح سر اٹھا کر ہی چلنے کے عادی ہیں اس لئے نگاہ میں اپنے کو مضطر سمجھتے ہیں پھر نگاہ ڈال کر ہٹانے میں اس کو نفس کی ساتھ کشاکشی سخت ہوتی ہے جس کی مقاومت دشوار ہوتی ہے اس دشواری کو وہ اضطرار سمجھنے لگتا ہے حالانکہ وہ اضطرار نہیں ہے کیونکہ وہ اس حالت میں بھی غض بصر پر قادر رہتا ہے پس وہ مختار ہے اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ جس اضطرار میں میتۃ حلال ہو جاتا ہے اضطرار تو وہ بھی نہیں کیونکہ عدم تناول پھر بھی اختیار میں رہتا ہے پھر بھی سخت تکلیف کو شریعت نے اضطرار قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فمن اضطر فی مخمصۃ تو معلوم ہوا کہ سخت تکلیف بھی اضطرار میں داخل ہے تو غض بصر میں بھی جب سخت بے چینی ہونے لگے وہ اضطرار کیوں نہیں اور اگر

اضطرار ہے تو وہ شخص معذور ہے تو میں کہوں گا کہ آیت میں اضطرار اصطلاحی کا ذکر نہیں بلکہ اضطرار لغوی کا ذکر ہے اور یہ اضطرار لغوی اکل میتہ میں عذر ہے اور نظر بالشہوۃ میں عذر نہیں اگر کوئی کہے کہ اس فرق کا کیا سبب اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی قسمت خدا کی یہی مرضی یہ جواب تو ضابطہ کا تھا اب میں تبرعاً دونوں میں فرق بھی بتلاتا ہوں کہ اضطرار مخمصہ میں موت کا اندیشہ ہے اور حیات کا بقاء مطلوب ہے کیونکہ وہ معراج ترقی ہے حیات ناسوتیہ ہی سے روح کو ترقی ہوتی ہے کیونکہ مدار ترقی اعمال ہیں اور روح مجرد سے صدور بعض اعمال کا نہیں ہوسکتا تھا اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو پھر جنت سے دنیا میں ہمارے بھیجے جانے کی کیا ضرورت تھی اور نظر الی الاجنبیہ سے بچنے میں موت کا خوف نہیں بلکہ عفض بصر میں زیادہ حیات ہے۔ حدیث میں وعدہ ہے کہ جو شخص تقاضائے نظر کے وقت نگاہ نیچی کرلے اس کو حلاوت ایمان نصیب ہوتی ہے۔

اور اس کی ساتھ ایک طبعی حلاوت بھی ہوئی ہے وہ یہ کہ جب غض بصر کے بعد اس کا دل یہ کہتا ہے کہ شاباش آج شیطان کو خوب زیر کیا اور یہ فخر اہل اللہ نے بھی کیا ہے مگر اشر و بطر کی ساتھ نہیں بلکہ تحدث بالنعمۃ کے طور پر اور اس قسم کا فرح محمود ہے چنانچہ نص ہے قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا۔ غرض غض بصر میں باطنی حیات بھی ہے اور حیات ظاہرہ کا ابقاء بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ یہ نگاہ بد جان و ایمان تک لے لیتی ہے ابن القیمؒ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ کوئی شخص کسی امرد پر عاشق تھا اور وہ اس سے نفور رہا یہانتک کہ یہ عشق میں گھل کر مرنے کے قریب ہوگیا اور آثار نزع شروع ہوگئے اس امرد کو اطلاع ہوئی تو اس کے دل میں رحم آیا کہ لاؤ ایک دفعہ اس سے مل لو اب تو مر ہی رہا ہے وہ اس ارادہ سے گھر سے چلا اور اس کی اطلاع کسی نے عاشق کو کی تو فوراً جسم میں قوت آگئی اور اٹھ بیٹھا پھر امرد کو اپنی بدنامی کا خیال ہوا اور راستہ ہی سے لوٹ گیا اور مومن کے قول پر عمل پیرا ہوا ؎

کہا اس بت سے مرتا ہے وہ مومن — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

اس امرد نے اس وقت اسی شعر پر عمل کیا اس کی اطلاع بھی عاشق کو ہوئی تو

پھر گر پڑا اور نزع شروع ہوگیا۔ لوگوں نے اس کو کلمہ کی تلقین شروع کی تو بجائے کلمہ کے اس نے امرد کو خطاب کر کے اشعار پڑھنا شروع کئے جس میں ایک شعر یہ تھا ؎

رضاك اشهى الى فؤادى   من رحمة الخالق الجليل

(اے معشوق تیری رضا مجھے زیادہ محبوب ہے حق تعالیٰ کی رحمت سے نعوذ باللہ تعالیٰ منہ)

نعوذ باللہ نعوذ باللہ اور اسی کلمۂ کفر پر جان دیدی۔ اور خطرہ نظر عمد میں ہے اور وہی حرام بھی ہے باقی اور نظر فجاءۃ میں یہ اثر نہیں ہوتا کیونکہ فوراً غض بصر کرنے سے وہ اثر قوی نہیں ہونے پاتا اگر اس پر کسی کو شبہ ہو کہ ممکن ہے اس میں بھی ہلاکت ہوجائے تو میں کہوں گا کہ یہ امکان ایسا ہے جیسا امام ابو یوسفؒ کے شاگرد نے مجلس امالی میں سوال کیا تھا کہ آپ نے ابھی جو یہ فرمایا ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ افطار کر لینا چاہیئے تو بھلا اگر کسی دن آفتاب ہی غروب نہ ہو تو کیا کرے اور وجہ فرق کی یہی ہے کہ نظر فجاءۃ میں بوجہ عدم التفات کے دقائق حسن کا ادراک نہیں ہوتا یوں ہی سرسری طور پر صورت سامنے ہوجاتی ہے اب اس کو حکم ہے صرف نظر کا اگر فوراً نگاہ کو ہٹا لے تو کچھ خطرہ نہیں اور اگر اس کے بعد عمداً دیکھنے لگا تو اب اس کو اس کی ساتھ تعلق ہوجانے کا احتمال ہے اور تعلق کے بعد اگر وصال نہ ہوا تو موت کا خطرہ ہے اور ایک دو بار وصال ہوگیا تو اس سے پیاس بجھے گی نہیں بلکہ زیادہ بھڑکے گی ؎

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق   مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اور اگر کسی کو ہمیشہ وصال میسر ہو سکتا ہے تو اس کمبخت کو نکاح سے کون چیز مانع ہے ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے لم یر للمتحابین مثل النکاح یعنی جن میں باہم محبت ہوجائے ان کو نکاح کر لینا چاہیئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر اس کا علاج نظر و وصال سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی طرف سے خیال کو ہٹاؤ جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی بدصورت بدشکل کا مراقبہ کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو دیکھو میں اس کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں مراقبہ موت و رویت تو سب بتلاتے ہیں میں بدشکل کافر کا مراقبہ بھی بتلاتا ہوں کیونکہ طب میں کبھی طیبات سے علاج ہوتا ہے کبھی خبیثات سے (اور اگر کوئی شکل قابل نفرت مراقبہ

کے لئے نہ ملے تو پھر اس محبوب ہی کو بدشکل تصور کرو یعنی یوں خیال کرو کہ یہ ایک دن مرے گا اور اس کا چہرہ خاک میں مل جائے گا اس میں سے خون پیپ ناک اور آنکھ کے راستہ سے بہے گا اس کے بدن میں کیڑے پڑ جائیں گے تھوڑی دیر اس کی اس حالت کا مراقبہ کرو اس سے بھی نفع ہوگا) اور خیال ہٹانے کی یہ صورت نافع نہیں کہ تم براہ راست اس کے حسن کے تصور دفع کرنے کا قصد کرو کیونکہ اس میں پھر استحضار ہوگا حسن کا سلب بھی جلب ہو جائے گا میں نے مولانا سید احمد صاحبؒ دہلوی سے ایک حکایت اسی قبیل کی سنی ہے کہ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی شادی میں دولہا کے لئے کسی کا دوشالہ مانگ کر مجلس نکاح میں اوڑھا دیا وہ اوچھا آدمی تھا اس نے دوشالہ تو دیدیا مگر اب جو شخص مجلس میں سے آکر پوچھتا کہ دولہا کہاں ہے وہ کہتا ہے کہ دولہا تو وہ ہے مگر دوشالہ میرا ہے لڑکے کے باپ نے کہا تو بڑا اوچھا آدمی ہے بھلا اس کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ دوشالہ میرا ہے اس نے کہا کہ بہت اچھا اب نہ کہوں گا۔ اس کے بعد کسی نے پوچھا کہ دولہا کونسا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ میرا نہیں ہے۔ بارات والوں نے پھر ملامت کی کہ کمبخت تجھے دوشالہ کے ذکر ہی کی کیا ضرورت ہے اس نے کہا بہت اچھا اب سے ذکر نہ کروں گا اس کے بعد کسی نے پوچھا تو کہا کہ دولہا تو وہ ہے اور دوشالہ کا ذکر ہی نہیں کہ کس کا ہے اس پر دولہا نے دوشالہ اتار کر پھینکدیا تو دیکھئے اس نے دوشالہ کی نفی کی تھی مگر وہ بھی اثبات تھا اسی طرح محبوب کے تصور کو بلا واسطہ دفع کرنا یہ بھی جلب تصور ہے بلکہ اس کا صحیح قاعدہ وہ ہے جس کو فلاسفہ اور صوفیہ نے بیان کیا ہے النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد کہ ایک آن میں دو چیزوں کی طرف نفس متوجہ نہیں ہو سکتا اور گو اس کو قاعدہ عقلیہ کہا جاتا ہے مگر میرے نزدیک یہ بھی قاعدہ عقلیہ نہیں بلکہ قاعدہ عادیہ ہے مگر عادۃً اس میں لزوم ایسا ہے جس سے لزوم عقلی کا شبہ ہو جاتا ہے اور اس قاعدہ کے استعمال کا طریقہ وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ کسی دوسری شے کی طرف توجہ کو منعطف کرو کیونکہ عشق بطالت سے ہوتا ہے اطباء نے اس کی تصریح کی ہے اسی لئے طلبہ کو عشق زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ بہت بیفکر ہیں (پہلے زمانہ کے طلبہ ایسے بے فکر تھے اس لئے ان میں مرض نہ تھا اور

آج کل بیفکری زیادہ ہے) کیونکہ جو کام ان کے ذمہ ہے مطالعہ و تکرار وغیرہ اختیاری ہے کہ جب چاہیں الگ کر دیں اور بیفکر ہو جاویں باقی جو شخص کسی فکر میں لگا ہوا ہو اس کو عشق نہیں ہوتا چنانچہ گھس کھدے مزدور کو تصور حسینان کی کہاں مہلت ہے پس تم بطالت و بیفکری کو دور کرو اور کوئی شغل اپنے ذمے لگا دُ اور کسی شے کی طرف اپنی توجہ کو منعطف کرو. حدیث میں اسی علاج کی تعلیم ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر اجنبیہ پر نظر پڑ جائے تو اسی وقت اپنی بیوی سے جا کر مشغول ہو جاؤ. اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فان الذی معہا مثل الذی معہا (کہ جو چیز اس کے پاس ہے ویسی ہی اس کے پاس ہے) ظاہر میں یہ جملہ معمولی بات ہے مگر حقیقت میں یہ ایک قاعدہ عظیمہ پر تنبیہ ہے جس کی تقریر حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے فرمائی ہے جو کسی کے کلام میں میری نظر سے نہیں گذری اس کو بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو ہماری اکابر کے کمال علوم کا اندازہ ہوگا. مولانا نے فرمایا کہ متناولات میں چار قسم کی چیزیں ہیں بعض میں محض لذت مقصود ہے جیسے فواکہ بعض میں دفع حاجت مقصود ہے بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب حاجت ہے جیسے اغذیہ یومیہ بعض میں دونوں مقصود ہیں مگر غالب لذت ہے اور عادۃً قرب نساء ایسی ہی چیز ہے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ میں ہم کو اس امر کی تعلیم فرمائی ہے کہ تم اس میں بھی حاجت ہی کو غالب رکھو اور دفع حاجت میں اجنبیہ اور منکوحہ دونوں مساوی ہیں یہ مطلب ہے ان الذی معہا مثل الذی معہا (ای انہما مساویان فی قضاء الحاجۃ) سبحان اللہ بے نظیر علم ہے. بہرحال شارع نے اس حدیث معشر الشباب تزوجوا الخ میں نکاح کی ترغیب اس لئے دی ہے تاکہ غض بصر سہل ہو جاوے اور یہ شارع کے ذمہ نہ تھا بلکہ محض عنایت تسہیل کی وجہ سے ارشاد فرمایا کہ جس کو غض بصر دشوار ہو وہ نکاح کر لے گو شارع کو یہ بھی حق تھا کہ بدون اس کے بھی غض بصر کا امر فرما دیں کیونکہ نظر اختیاری ہے جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا اور اس سے معلوم ہوا کہ کبھی شارع بھی تسہیل کا لحاظ فرماتے ہیں پس صوفیہ اہل بدعت نہیں جو اعمال شرعیہ میں سہولت کا طریق بتلاتے ہیں اور اسی میں مشائخ علماء ظاہر سے ممتاز ہیں کیونکہ علماء اس کو نہیں جانتے پس صوفیہ پہ یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے یہ بدعت کہاں سے نکالی کہ اعمال شرعیہ کی تسہیل کے طرق

بتلاتے ہیں۔ میں نے بتلا دیا کہ شارع نے بھی کبھی اس کا لحاظ فرمایا ہے۔ چنانچہ اول تو شارع نے تسہیل غض بصر کے لئے نکاح کو تجویز کیا اور جو نکاح پر قادر نہ ہو اس کے لئے اسی تسہیل کے لئے ارشاد ہے ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء کہ جو نکاح نہ کر سکے وہ روزے رکھا کرے کیونکہ روزہ بمنزلہ اختصار کے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ اختصار کے بعد بھی بعض دفعہ شہوت کم نہیں ہوتی چنانچہ تجربہ ہے کہ ایسے لوگ باندیاں خریدتے ہیں اور ان سے مجامعت کرتے ہیں ہاں ان کو انزال نہیں ہوتا اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع عضو کے بعد بھی شہوت باقی رہتی ہے ایسا مرد مساحقہ کا طالب ہوتا ہے ایک بزرگ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو شہوت باقی رہتی ہے۔ وہ حکایت یہ ہے۔ ایک شخص کو خضر علیہ السلام سے ملاقات کی تمنا رہتی تھی چنانچہ ایک بار ملاقات ہوئی اور حضرت خضرؑ نے دریافت فرمایا کہ بتلاؤ مجھ سے کیا کام ہے کہا میرے لئے دعا کر دیجئے کہ بے فکری کی زندگی نصیب ہو۔ فرمایا دنیا میں بیفکری دشوار ہے کیونکہ یہ دار ابتلاء ہے یہاں چین نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ تم دنیا میں مختلف لوگوں کی حالت دیکھ کر کسی ایک کو تجویز کر لو میں دعا کروں گا کہ تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ اس نے کہا بہت اچھا یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں کوئی تو بیفکر ملے گا۔ چنانچہ اس نے سیاحت شروع کی اور امراء و سلاطین کا امتحان شروع کیا معلوم ہوا کہ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی فکر ضرور ہے بیفکر کوئی نہیں۔ پھر ایک جوہری کو دیکھا کہ وہ بڑا بے فکر ہے صبح کو دکان کھولتا ہے دس بارہ لڑکے جوان اس کے پاس دکان میں رہتے ہیں جو اس کے بیٹے معلوم ہوتے تھے اور نوکر چاکران کے علاوہ تھے۔ وہ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھتا اور خوب خیرات کرتا اور تجارت بھی کرتا ظاہر میں اس کو کوئی فکر معلوم نہ ہوتا تھا یہ اس کے پاس تین دن ٹھہرا اور اس کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا کہ بس میں بھی اسی کے مثل ہونے کی دعا کراؤں گا پھر خیال ہوا کہ اس سے بھی دریافت تو کرنا چاہیئے مبادا اس کو کوئی ایسا فکر ہو جس کی مجھے اطلاع نہ ہو چنانچہ اس سے دریافت کیا اور وجہ بھی بتلا دی کہ میں نے حضرت خضرؑ سے یہ درخواست کی تھی انھوں نے یہ جواب دیا اور اب تجھ کو دیکھ کر مجھے خیال ہوتا ہے کہ تیری جیسی زندگی کی دعا کراؤں یہ سن کر وہ جوہری سانس بھر کر آبدیدہ ہوا اور کہا خدا

میری جیسی مصیبت تو کسی دشمن کو بھی نہ دے پھر قصہ بیان کیا کہ میری بیوی بہت حسین ہے ایک دفعہ وہ بیمار ہوئی اور مرنے کے قریب ہو گئی میں رونے لگا تو اس نے کہا کیوں روتے ہو تم تو چار دن کے بعد دوسرا نکاح کر لوگے پھر مجھے بھول بھال جاؤگے میں نے کہا یہ ہرگز مجھ سے نہ ہوگا کہا سب یوں ہی کہا کرتے ہیں تو میں نے استرہ نکال کر اپنا عضو کاٹ ڈالا کہ اب تو اطمینان ہو گیا اس نے کہا ہاں اب واقعی اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کمبخت اچھی ہو گئی۔ در میں بیکار ہو چکا تھا تو اس نے نوکروں سے تعلق پیدا کر لیا اور یہ جتنے لڑکے آپ کے سامنے ہیں سب انہی نوکروں کی عنایت ہیں مگر میں خاموش ہوں کیا کہوں کیونکہ یہ بلا میں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہے اب یہ شخص اپنے گھر واپس آیا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی پوچھا کہو تم نے کسی کو تجویز کیا کہا واقعی دنیا میں کوئی بھی فکر سے خالی نہیں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا بس تم یہ خیال چھوڑ دو اور اس کی درخواست کرو کہ حق تعالیٰ تم کو اپنی محبت عطا فرمائیں اور آخرت کی بیفکری نصیب ہو کہا ہاں بس اسی کی دعا کر دیجئے واقعی یہی بات ہے پھر اگر کچھ بیفکری ہے تو تعلق مع اللہ ہی میں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دود بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست
(کوئی گوشہ بغیر پریشانی اور جال کے نہیں مگر ہاں تنہائی میں حق تعالیٰ کی یاد ہی سے چین و آرام)

خلوت گاہ حق سے مراد تعلق مع اللہ ہی ہے تو اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اس شخص کو اپنی حالت پر حسرت تھی اس حسرت میں خواہش کو بھی دخل تھا کہ تمتع کی خواہش موجود مگر فقدان اسباب و آلات سے معذور اس لئے غمزدہ تھا اور روزہ ان سب سے بڑھ کر ہے کہ شہوت بھی کم ہو جاتی ہے اور انسان بھی بیکار نہیں ہوتا۔ مگر ایک بات سمجھ لینا چاہیئے کہ بعض دفعہ روزہ سے ابتداء صوم میں شہوت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے اس سے دھوکہ نہ کھایا جائے کہ شریعت نے یہ کیسا علاج تجویز کیا بات یہ ہے کہ بعض دفعہ قلت شہوت کا منشا کثافتِ اخلاط ہوتا ہے ایسی حالت میں چونکہ روزہ سے اخلاط میں لطافت پیدا ہوگی تو اول اول شہوت بڑھے گی مگر یہ برابر روزہ رکھتا ہے تو کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہوگا اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ قلت شہوت کا منشا کبھی کثافت اخلاط ہوتا ہے اس کو میں بہت دعوے کیسا تھ کہتا ہوں

اور بیانگ دہل کہتا ہوں کہ جس پر شہوت کا زیادہ غلبہ ہو وہ اس وقت خوب پیٹ بھر کر کھانا کھالے تو شہوت افسردہ ہو جائے گی مگر شارع نے یہ علاج اس لئے تجویز نہیں کیا کہ اس سے لحوق امراض کا اندیشہ ہے بہرحال کثرت صوم کا انجام ضعف شہوت ہی ہے گو ابتداء میں ضعف کا احساس نہ ہو چنانچہ اخیر حصہ رمضان میں ہر شخص کو ضعف معلوم ہوتا ہے گو افطار وسحر میں اس نے کتنا ہی پیٹ بھر کر کھایا ہو کیونکہ میرے نزدیک سبب ضعف تبدیل وقت ہے، تقلیل غذا سے ضعف نہیں ہوتا پس جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح صوم تقلیل غذا ہے جب افطار وسحر میں خوب پیٹ بھر کر کھا لیا تو اس روزہ سے فائدہ ہی کیا ہوا ان کا قول میرے نزدیک صحیح نہیں بلکہ صرف تبدیل وقت ہی ضعف بہیمیت کے لئے کافی ہے۔ غرض یہ حدیث[1] صاف بتلا رہی ہے کہ شارع نے جس طرح تحصیل اعمال کا اہتمام کیا ہے اسی طرح تسہیل اعمال کا بھی کہیں کہیں لحاظ فرمایا ہے چنانچہ یہ حدیث تو رعایت تسہیل میں صریح تھی اب آیت میں غور کیجئے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے اول ایک غایت تحصیل عمل کے لئے بیان فرمائی اس کے بعد دوسری غایت تحصیل عمل کے لئے ذکر فرمائی کہ تکرار انفاق سے انفاق سہل ہو جاتا ہے پس انفاق میں یہ غرض بھی ملحوظ رکھنا چاہئے اور یہ طریقہ تمام اعمال کی تسہیل میں مفید ہے تکرار عمل سے ہر عمل شاق سہل ہو جاتا ہے جیسا اوپر بھی مذکور ہو چکا ہے مگر طرق تسہیل کا بتلانا شارع کے ذمہ نہیں یہی وجہ ہے کہ تمام احکام میں اس کی رعایت نہیں کی گئی اور ہر عمل کی سہولت کا طریقہ شارع نے نہیں بتلایا نیز علماء کے ذمہ بھی طرق سہولت بتلانا لازم نہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ علماء کے ذمہ یہ بھی نہیں کہ سائل کے جواب میں ایسی تقریر کریں کہ مخاطب کی سمجھ ہی میں آجائے جبکہ وہ مسئلہ ان کے فہم سے عالی ہو ہاں مسئلہ کی تقریر کر دینا جبکہ وہ ضروری سمجھیں ان کے ذمہ ہے خواہ مخاطب سمجھے یا نہ سمجھے اور اگر مخاطب سے فہم کی امید نہ ہو تو علماء کے ذمہ تقریر کرنا بھی لازم نہیں ان کو یہ کہہ دینے کا حق ہے کہ تم اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ رامپور میں ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ معراج کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آیا مجھے اس پر کچھ اشکالات ہیں میں نے کہا بیان کیجئے کہا یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان زمین سے آسمان پر پہونچ جائے کیونکہ درمیان میں کرۂ زمہریر ہے کرۂ نار ہے۔ نیز حکماء کا

---

[1] جس مقام پر حدیث یا معشر الشباب کا ذکر شروع ہوا ہے اس مقام سے ذرا پہلے اس کا بیان آیا ہے ۱۲ منہ

قول ہے کہ چند میل اوپر ہوا نہیں ہے وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ سانس کیلئے ہوا کی ضرورت ہے پھر معراج کیونکر ہوئی میں نے کہا بدون تنفس کے زندہ رہنا محال ہے یا مستبعد ہے اسی طرح زمہریر و نار میں زندہ رہنا محال یا مستبعد ہے گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ حضرت محال و مستبعد میں فرق ہی نہ سمجھتے تھے میں نے ان دونوں میں فرق ظاہر کیا اور کہا اب آپ کے اشکالات کا حاصل یہ ہوا کہ معراج کا واقعہ مستبعد ہے سو اس سے ہم کو انکار نہیں معجزات مستبعد تو ہوتے ہی ہیں ورنہ معجزہ ہی کیوں کہا جاوے لیکن محال ہرگز نہیں کیونکہ اس میں عقلی استحالہ کچھ نہیں وہ کہنے لگے کہ یہ دقائق میں نہیں سمجھتا مجھے اس کی کوئی نظیر مشاہدات میں بتلایئے میں نے کہا کہ نظیر پر ثبوت دعویٰ موقوف نہیں ہوتا کیونکہ نظیر بھی تو ایک واقعہ ہے اگر ہر واقعہ کو دوسرے واقعہ کے واسطہ سے مانا جائیگا تو یا تو تسلسل لازم آئیگا اور وہ محال ہے یا کہیں سلسلہ کو قطع کرو گے تو یہ آخیر کا واقعہ بدون نظیر کے مانا گیا پھر واقعہ معراج ہی کو اولاً بدون نظیر کے کیوں نہیں مانا جاتا مگر وہ پھر بھی وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتے رہے کہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا بس اتنی کسر رہ گئی کہ میں آپ کے سامنے آسمان پر اڑوں کہ دیکھو معراج یوں ہوا کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تنفس کی ضرورت مکث طویل میں ہوتی ہے اور مکث طویل ہی سے حر و برد کا اثر بھی لازم آتا ہے سرعت سیر میں نہ تنفس کی ضرورت ہے نہ مرور فی النار سے احتراق لازم آتا ہے چنانچہ چراغ کی لو میں جلدی جلدی انگلی چلائی جائے تو آگ کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا پس اگر مان لیا جائے کہ اوپر ہوا نہیں ہے تو اس واقعہ معراج پر کیا اشکال ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طیقہ کو جو نہایت سرعت سے طے کیا ہے جس میں آپ کو تنفس کی ضرورت ہی نہیں ہوئی اور ضرورت ہوئی بھی تو پندرہ بیس منٹ حبس دم کرنے سے ہلاکت نہیں ہوتی اور اسی سرعت کی وجہ سے آپ کے جسم پر نار و زمہریر کا اثر نہیں ہوا مجھے یہ جواب پسند آیا اور خیال ہوا کہ اس وقت یہ بات معلوم ہو جاتی تو سائل کی تسلی ہو جاتی مگر مجھے زیادہ خیال نہیں ہوا کیونکہ تسلی کرنا ہمارے ذمہ نہیں ہے۔ علیگڈھ میں ایک پروفیسر میرے پاس آئے جو علوم عربیہ کے استاد وہاں مشہور تھے۔ انھوں نے ایک حدیث[ھ] حاکم کا متن پڑھا وَ لَا ظہرت الفحشۃ

[ھ] کذا فی اتہ غیب ۱۲

فی قوم الاسلط علیہم الموت یعنی وبا اور طاعون کثرت زنا سے ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا طاعون و زنا میں اتباط سمجھ میں نہیں آیا۔ کہا ارتباط نہیں سمجھ میں آیا میں نے کہا پھر اس کے نہ سمجھنے سے ضرر ہی کیا ہوا کہنے لگے ضرر تو کچھ نہیں ہوا لیکن معلوم ہونے سے نفع ہوتا۔ میں نے کہا وہ نفع کیا ہے کہنے لگے اطمینان میں نے کہا اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل کہا اگر یہ مطلوب نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کو طلب نہ فرماتے۔ میں نے کہا کہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز حضرت ابراہیمؑ کے لئے نافع ہو وہ آپ کے لئے بھی نافع ہو۔ بس وہ اس پر خاموش ہو گئے۔ میں نے اس کے بعد ان سے کہا کہ مولانا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملانوں کو اس کا ارتباط معلوم نہیں۔ الحمد للہ کہ ہم کو بعض اسرار کا علم بھی بزرگوں کے طفیل سے حاصل ہے مگر ہم بتلانا مصلحت نہیں سمجھتے اور میں نے یہ شعر پڑھا ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز   ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(اہل اللہ اسرار شریعت کو ظاہر کرنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ ان حضرات کو اسرار کا علم نہیں ہے) ہمیں خبر ہے مگر آپ کو نہیں بتلاتے کیونکہ اسرار کا بتلانا ہمارا ذمہ نہیں صرف احکام کا بتلانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر میں نے احباب کے جلسہ خاص میں اس ارتباط کی تقریر کر دی۔ غرض اسی طرح طرق تسہیل کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں بلکہ مشائخ کے بھی ذمہ نہیں گو مشائخ بنے اسی سے ہیں مگر وہ فن تسہیل سے واقف ہیں مگر یہ ان کے ذمہ نہیں محض ان کی عنایت و رحمت ہے مخلوق پر کہ وہ طرق تسہیل بتلا دیتے ہیں اور وہ بھی اس طریق کو اس شخص کے لئے استعمال کرتے ہیں جو تحصیل میں ساعی ہو اور جو شخص تحصیل اعمال میں کوتاہی کر کے تسہیل کا طالب ہو وہ اس کی ساتھ تسہیل کا معاملہ نہیں کرتے بلکہ تکلیف کا معاملہ کرتے ہیں (یہاں پہونچکر اذان عصر ہو گئی تو فرمایا کہ بس میں اب ختم ہی کرنے والا ہوں یہ فرما کر خاموش ہو گئے اور اذان کے بعد فرمایا) اب میں مقصود کی توضیح کر کے چند باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کر کے ختم کرتا ہوں میرا مقصود اس آیت کی تلاوت سے یہ تھا کہ شارع نے اصل میں ہم کو اعمال اختیاریہ کی تحصیل کا مکلف کیا ہے اور شارع کے ذمہ تسہیل کی رعایت نہیں مگر محض عنایت کی وجہ سے بعض دفعہ تسہیل کی بھی رعایت فرما لیتے ہیں۔

جیساکہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ پس سالکین کی یہ بڑی غلطی ہے کہ وہ سہولت کے طالب ہیں اور طلب تحصیل میں کوتاہی کرتے ہیں اس میں مقصود بالذات کو تابع اور مقصود بالعرض کو اصل قرار دینا ہے نیز صفت اختیار کا ابطال ہے جو امانت الٰہیہ ہے۔ اب میں مختصراً تشبیہ کے متعلق جو اس آیت میں مذکور ہے کچھ عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ نے یہاں نفقات کو جنات سے تشبیہ دی ہے وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح باغ میں پھل کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح نفقات میں زیادت ہوتی ہے اور وابل سے اخلاص کی تشبیہ مقصود ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ اوپر ریاء فی الانفاق کی مذمت ہے کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر الاٰیہ اس کے بعد انفاق کی فضیلت بیان فرمائی گئی اور جب وابل سے مراد اخلاص ہے اور اس کے مقابلہ میں طل مذکور ہے اور وابل کہتے ہیں موسلا دھار بارش کو طل کہتے ہیں پھوار کو تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وابلٌ سے اخلاص کامل مراد ہے اور طلٌ سے اخلاص قلیل مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر اخلاص کامل ہوا تو نفقات میں ترقی زیادہ ہوگئی اور اگر اخلاص قلیل ہوا تو وہ بھی ترقی کے لئے کافی ہے گو زیادہ ترقی نہ ہو اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے بلکہ اس سے وہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل ہی کا مطلوب ہوتا ان کے ذہن نشین ہوجائے تو ان سے کوئی عمل نہ ہو سکے گا کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہوسکتا جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے سامنے ایک جنازہ کی نماز شروع ہوئی اور وہ شریک نہ ہوئے۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی فرمایا کہ میں نیت کی تصحیح میں مشغول رہا یہی سوچتا رہا کہ اس وقت اس میت کی نماز پڑھنے میں کیا نیت ہے کیونکہ نماز جنازہ میں مختلف نیتیں ہوتی ہیں کبھی اعزہ واقربار کی خاطر سے پڑھی جاتی ہے۔ کبھی میت کی وجاہت کا اثر ہوتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ میت محلہ دار ہے اگر نماز نہ پڑھیں گے تو اہل محلہ ملامت کریں گے یہی وجہ ہے کہ رئیس یا عالم کے جنازہ کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے غریبوں کے جنازہ کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا اگر اخلاص منشا ہوتا تو یہ فرق کیوں ہوتا۔ اسی طرح حافظ اگر تراویح میں سوچتا رہے کہ میں تراویح میں جو بنا سنوار کر قرآن پڑھ رہا ہوں اس میں کیا نیت ہے۔ کیونکہ تنہا نماز پڑھتے ہوئے ایسا اہتمام نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ تراویح ہرگز نہ پڑھا سکے گا

پس اس وہم کا علاج کر دیا گیا کہ تم کس وہم میں پڑے ہمارے یہاں اخلاص قلیل بھی کافی ہے بس تم اپنی طرف سے برا قصد نہ کرو اس کے بعد بےفکر ہو کر کام میں لگو اور اخلاص کامل کے لئے سعی کرتے رہو اسی طرح سے ایک دن اخلاص کامل بھی میسر ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی دن اخلاص کامل پر عمل کو موقوف رکھا تو تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا یہ مطلب ہے فان لم یصبہا وابل فطل کا کہ ابتدا میں اخلاص قلیل ہی کو کافی سمجھو اور عمل شروع کر دو یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل ہی مطلوب ہے بلکہ مطلوب تو اخلاص کامل ہے مگر اس کے حصول کا طریقہ یہی ہے کہ اول قلیل ہی سے عمل شروع کر دو طل پر مجھے ایک لطیفہ ہارون رشید کی باندی کا یاد آ گیا گو مضمون سے اس کو تعلق نہیں مگر لفظ طل سے تعلق ہے۔ ہارون رشید نے اپنی ایک جاریہ کو کسی غلام سے ہنستے بولتے دیکھ لیا جس کا نام تھا طل (غلام لونڈیوں کے ایسے ہی نام ہمارے عرف میں رکھتے ہیں جیسے بہار وغیرہ) ہارون الرشید نے اس جاریہ کو ڈانٹا اور کہا خبردار جو کبھی اس سے بات کی بلکہ کبھی زبان سے اس کا نام بھی مت لینا ایک بار وہ لونڈی قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی یہی آیت آئی اس کو معلوم ہوا کہ امیرالمومنین ایسے موقع پر موجود ہیں جہاں اس کی آواز جا رہی تھی تو اس نے کیا مزہ کیا کہ آیت کو اس طرح پڑھا فان لم یصبہا وابل فالذی نہانی عنہ امیرالمومنین امیرالمومنین ہنسنے لگے اور خطا معاف کر دی اور نام لینے کی اجازت دیدی پس اصل مقصود تو اخلاص کامل ہے اور اسی کا امر ہے وہی مطلوب ہے اور اس سے تکمیل عمل کی مقصودیت پر دلالت ہو گئی مگر چونکہ اس میں بعض وہمیوں کو غلو ہو جاتا ہے اس لئے فطل میں اس کی تعدیل کر دی گئی گویا فاصابہا وابل میں تکمیل کی تعلیم تھی اور فطل میں تعدیل کر دی گئی تو اس آیت میں چار چیزیں مذکور ہوئیں تحصیل، تسہیل، تکمیل، تعدیل اور اسی مناسبت سے میں اس بیان کا نام التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل تجویز کرتا ہوں اور اس مضمون کو خاص رمضان سے یہ تعلق ہے کہ طاعات رمضان کو بھی مثل تکرار انفاق کے تسہیل اعمال میں بڑا دخل ہے یعنی رمضان میں یہ خاصیت ہے کہ اس ماہ میں جن طاعات پر مداومت کر لے سال بھر ان پر مداومت سہل رہتی ہے اور جن گناہوں سے بچنے کا اہتمام کر لے سال بھر ان سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ ابن حبان نے ایک حدیث مرفوع روایت کی ہے من سلم لہ الجمعۃ سلم لہ مابینہ وبین الجمعۃ الاخری ومن سلم لہ رمضان سلم لہ السنۃ کلہا و قلت اخرجہ

السیوطی فی الجامع الصغیر واعزاہ الی الدارقطنی وابن عدی واحمد عن عائشۃ بلفظ اذا سلمت الجمعۃ سلمت الایام واذا سلم رمضان سلمت السنۃ وقال العزیزی و ھو حدیث ضعیف ص ۱۳۵ ج ۱۲)

رہا یہ کہ رمضان میں یہ خاصیت بالکیفیت ہے یا بالخاصہ ہے دونوں احتمال ہیں اگر بالخاصہ ہے تو تب تو وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں اور بالکیفیت ہے تو یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ مہینہ بھر کسی عمل سے رکنے میں اس سے اجتناب کی عادت ہوجاتی ہے اب سال بھر اس سے بچنا سہل ہوجاتا ہے اسی طرح کسی عمل کے کرلے میں بھی ایسا ہی سمجھو مگر سہولت کے معنے یہ ہیں کہ اگر اب اس عادت سے کام لو تو سہولت ہوجائے گی یہ معنی نہیں کہ عادت سے کام لینے کی بھی ضرورت نہ رہیگی جیسے کسی شخص کی آنکھیں بنائی گئیں اور ان میں روشنی آگئی تو آنکھ کے درست ہوجانے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ اس سے کام لیگا آنکھیں کھولیگا تو نظر آئیگا اگر کوئی احمق یہ کہے کہ میں تو آنکھ نہ کھولوں گا کھولنے سے نظر آیا تو فائدہ ہی کیا ہوا آنکھ بننے کے تو یہ معنی ہیں کہ بدون کھولے بھی نظر آئے تو ایسی تیسی اس احمق کی پس یہ مطلب نہیں کہ رمضان لاٹھی لے کر تم کو گناہوں سے روکے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ . . . . اس کی ایسی برکت ہے کہ اس میں گناہوں کو اہتمام سے چھوڑ کر بعد میں اس برکت سے کام لینا چاہو تو گناہوں کا چھوڑنا آسان ہوگا ورنہ پھر یہ عالم ابتلا ہی کیا ہوا اگر جبراً تم سے گناہ چھڑا دیئے جائیں۔ پس اب بقیہ رمضان میں اہتمام کے ساتھ گناہوں سے بچو خصوصاً لغو بد اور غیبت سے اور اعمال صالحہ کا اہتمام کرو تلاوت قرآن و نماز و ذکر میں مشغول رہو اور دوسرے دنوں سے آجکل کچھ کام بڑھا دو اور ایک عمل جس کو رمضان سے خصوصیت ہے ابھی باقی ہے یعنی شب قدر کی تلاش کرنا اس کا بھی خاص اہتمام کرو ابھی کچھ لیالی قدر باقی ہیں ان کو غنیمت سمجھو دو راتیں تو گذر گئیں ہیں اگر ان میں اہتمام نہ کیا ہو تو بقیہ ہی کا اہتمام کرلو تاکہ فان لم یصبہا وابل فطل ہی کا مصداق ہوجائے اور کل رات میں نہ جاگ سکو تو زیادہ حصہ جاگ لو یہ بھی نہ ہوسکے تو دوسری راتوں سے کچھ زیادہ جاگ لو یہ بھی فان لم یصبہا وابل فطل میں داخل ہے غرض نہ سب راتیں ضروری ہیں نہ پوری رات ضروری ہے جتنا ہوجائے غنیمت ہے اس سے دریغ نہ کرو ؎

مرا از زلف تو موئے بسند ست ؛ ہوس را رہ مدہ بوئے بسند ست

(مجھے اے محبوب آپ کے زلف ہی کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس کو راہ مت دو)

زلف محبوب کی خوشبو ہی کافی ہے یہ شعر شیخ عبدالحق نے اس موقعہ پر لکھا ہے جہاں حدیث میں یہ قصہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع میں حلق راس کے بعد اپنے موئے مبارک تقسیم فرمائے تھے شیخ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال دنیا میں موجود ہیں گو سند صحیح کے ساتھ ہم کو نہ ملیں مگر ہم کو یہ خبر ہی کافی ہے شیخ میں عشق کا غلبہ ہے اشعار محبت بڑے موقعہ سے ذکر کرتے ہیں چنانچہ اس حدیث کی شرح میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کے وصال کا واقعہ مذکور ہے کہ ایک دن صحابہؓ جماعت کی ساتھ نماز پڑھ رہے تھے حضرت صدیق اکبرؓ امام تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرہ کا پردہ اٹھا کر صحابہؓ کی جماعت کو دیکھا اور تبسم فرمایا صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم کو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک دیکھ کر ایسی حالت ہوئی کہ قریب تھے کہ نماز توڑ دیں شیخ اس وقت کو بیان کر کے یہ شعر لکھتے ہیں ؎

در نماز خم ابروئے تو چوں یاد آمد　　حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

(نماز میں جب آپ آپ کے ابرو کا خم یاد آتا ہے تو ایسی حالت ہوتی ہے کہ محراب نے بھی فریاد کیا)

خیر یہ تو استطراداً ذکر ہو گیا اصل مقصود پہلا شعر تھا کہ ؎

مرا[مہ] از زلف تو موئے بسندست　　ہوس را رہ بوئے بسندست

تو اگر ساری رات نہ جاگ سکو تو جتنا ہو سکے اور دنوں سے کچھ زیادہ شب قدر میں جاگ لو۔

ہمارے حاجی صاحب کا شعر ہے ؎

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہونچے وہاں　　گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

میں عالی ہمتوں کی ہمت کم نہیں کرتا بلکہ کم ہمتوں کی ہمت بڑھا رہا ہوں کہ وہ زیادہ نہ کر سکیں تو قلیل ہی سے دریغ نہ کریں اور جو زیادہ کر سکتے ہیں وہ زیادہ میں کمی نہ کریں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرماویں اور عمل کی توفیق ہو۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ

وبارک وسلم واٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین ؕ

قابل مطالعہ کتب | معلم الحجاج۔ حج عمرہ و زیارت۔ تاریخ الخلفاء۔ بنیان المشید۔ فضائل والاحکام للشہور والایام۔ شرعی پردہ۔ ثبات الستور۔ ملفوظات کمالات اشرفیہ۔ شریعت اور طریقت حیات اشرف۔ زاد السعید۔ مصیبت کے بعد راحت عقد انامل۔ وہابی کی پہچان۔ اعمال قرآنی طب روحانی
ملنے کا پتہ مکتبہ تھانوی۔ بندر روڈ۔ کراچی ملا

[مہ] ترجمہ گذشتہ صفحہ پر ہو چکا ہے۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

المعرق والرحیق
للمحرق والغریق

حکیم الامّت مجدد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبۂ تھانوی —— دفتر الابقا
مسافرخانہ بندر روڈ / ایم۔اے جناح روڈ کراچی ۱

وعظ مسمّٰی بہ

المعرق والرحیق للمحرق والغریق

این	متی	کم	کیف	لم	ماذا	من (ای شان من)	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیوں ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون	۱۲ رجب ۱۳۴۳ھ بروز شنبہ بوقت صبح	سہ ۳ گھنٹے ۴۵ منٹ	مونڈھے پر بیٹھ کر	بعض اہل خانقاہ کی درخواست پر	انسان پر دو کیفیتیں طاری ہوا کرتی ہیں کبھی شوق کبھی سکون دونوں میں حکمتیں ہیں اپنے لئے کوئی خاص صورت تجویز نہ کرنا چاہیئے۔ وصول دونوں سے ہوجاتا ہے اور جنت میں جزا بھی ہر کیفیت کے مناسب ہوگی۔	سالکین کو بالخصوص اور سب مسلمانوں کو بالعموم	احقر ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ وکان لہ	تقریباً ۵۰	الحمد للہ اس وعظ کی تسوید تفصیلی کا جلد ہی موقع آگیا اللہ تعالیٰ تسوید مواعظ کا اہتمام کرنیوالیکو جزائے خیر عطا فرماویں اس کی تسوید تفصیلی ۲۰ رجب ۱۳۴۳ھ یکشنبہ کو شروع ہوکر ۲ شعبان ۱۳۴۳ھ کو اختتام کو پہونچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہٗ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط ان الابرار یشربون من کاس کان مزاجھا کافورا ۝ عینا یشرب بھا عباد اللہ یفجرونھا تفجیرا ۝ یوفون بالنذر ویخافون

سہ مگر ضابطے نے بعد ختم وعظ بھی ۱۵ منٹ تک کچھ باقی ماندہ مضامین نوٹ کئے لہذا وقت ضبط ۴ گھنٹہ ہے ۱۲ جامع

یوماً کان شرہ مستطیرا ۝ ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا ۝ انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکورا ۝ انا نخاف من ربنا یوماً عبوسا قمطریرا ۝ فوقھم اللہ شر ذلك الیوم ولقھم نضرۃ وسرورا ۝ وجزاھم بما صبروا جنۃ وحریرا متکئین فیھا علی الارائك لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا ۝ ودانیۃ علیھم ظللھا وذللت قطوفھا تذلیلا ۝ ویطاف علیھم بآنیۃ من فضۃ واکواب کانت قواریرا ۝ قواریر من فضۃ قدروھا تقدیرا ۝ ویسقون فیھا کأسا کان مزاجھا زنجبیلا ۝ عینا فیھا تسمی سلسبیلا۔

اس وقت مجھ کو جس مضمون کا بیان کرنا ہے وہ ان آیات کا مدلول نہیں ہے مگر علم اعتبار کے طور پر ان آیات کو اس مضمون سے ایک مناسبت لطیفہ ہے اور اسی لطافت کی وجہ سے اُن کو پڑھا گیا ہے ہر چند کہ ان آیات کی دلالت قواعد شرعیہ سے اس مضمون پر کافی نہیں ہے مگر وہ مضمون دیگر نصوص صریحہ میں منصوص ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس وقت میں انھیں آیات کی تلاوت کرتا جن آیات کی دلالت اس مضمون پر صریح ہے مگر اس کو تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کوئی نئی بات نہ معلوم ہوتی اور جی یہ چاہا کرتا ہے کہ بیان میں افادۂ جدیدہ ہو اس لئے میں نے ان آیات کو جدید فائدہ کے لئے تلاوت کیا ہے تاکہ ان سے اس مضمون پر ایک لطیف استشہاد ہو سکے اس لطافت کی غرض سے میں نے ان آیات کو بیان کے لئے اختیار کیا۔ اب وہ مضمون سننا چاہیئے جو کہ بہت ضروری ہے گو اس وقت کا بیان محض اس مضمون کی ضرورت کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ بعض طالبین کی استدعا کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر بات یہ ہے کہ محض استدعا بیان کے لئے محرک کافی نہیں بلکہ استدعا کے بعد جب کوئی ضروری مضمون بھی ذہن میں آجاتا ہے اس وقت بیان ہوتا ہے پس مضمون کی ضرورت کو بھی بیان میں دخل ضرور ہے اور اس مضمون کا اصل خطاب اہل ذکر کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس کی ضرورت سالکین کو جو اللہ کا نام لیتے والے ہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کے بیان کے لئے یہ مجلس جس میں سالکین کثرت سے ہیں اختیار کی ہے گو استدعا پرسوں (جمعرات کو) ہوئی تھی اور شاید مستدعی نے قرب جمعہ کی وجہ سے یہ خیال کیا ہو گا کہ بیان جمعہ میں ہو گا۔

اور شاید اسی خیال سے استدعا بھی جمعہ کے قریب کی گئی کیونکہ وہ دن بھی ایسا ہے جس میں اہل علم کی عادت بیان کرنے کی ہے مگر میں نے چند وجوہ سے کل بیان نہیں کیا۔ ایک تو کچھ طبیعت اچھی نہ تھی اور میں نے وعدہ اسی شرط پر کیا تھا کہ اگر طبیعت میں نشاط ہوا تو بیان کردوں گا گو نشاط کا پیدا ہونا جی کے سمجھانے پر ہے جب آدمی کسی کام کا ارادہ کرلیتا ہے تو نشاط بھی پیدا ہو ہی جاتا ہے پس یہ کوئی مانع قوی نہ تھا۔ مگر وعدہ نشاط ہی پر معلق تھا اور اصل وجہ کل نہ بیان کرنے کی یہ تھی کہ جمعہ کے دن مجمع عام ہوتا ہے اور اس مضمون کا تعلق زیادہ تر خاص جماعت سے ہے وہی مقصود بالخطاب ہیں۔ دوسرے جمعہ میں اجتماع ایک دعوت عامہ للصلوٰۃ کی بنا پر ہوتا ہے لوگ نماز کی غرض سے آتے ہیں اس کے بعد اگر بیان کیا جاتا ہے تو بعض لوگوں کو شرما شرمی بیٹھنا پڑتا ہے آزادی نہیں رہتی اور جمعہ کے علاوہ کسی دن میں بیان کیا جائے تو دعوت عامہ کی وجہ سے اجتماع نہ ہوگا بلکہ دعوت خاصہ سبب ہوگی اور یہاں تو دعوت خاصہ بھی نہیں ہوئی بلکہ اتفاقاً یا خود کسی سے سن سنا کر سب لوگ جمع ہوگئے ہیں تو اس صورت میں جو کوئی سنے گا آزادی سے سنے گا۔ کیونکہ وہ خاص اسی غرض کے لئے آیا ہے بہرحال چونکہ اس مضمون کی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے اس لئے یہ خاص وقت اس کے لئے مقرر کیا گیا۔ عام وقت اور عام مجمع اختیار نہیں کیا گیا اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کی ضرورت اہل ذکر ہی کو محسوس ہوتی ہے۔ سب کو محسوس نہیں ہوتی ورنہ درحقیقت مضمون عام ضرورت کا ہے سب مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہے مگر کیا کیا جائے آجکل مسلمانوں نے عموماً ذکر اللہ کو چھوڑ رکھا ہے ایک خاص جماعت ہی ذاکر رہ گئی ہے ورنہ کیا ذکر اللہ بھی ایسی چیز ہے جو کسی خاص جماعت سے مخصوص ہو اس کی تو ہر مسلمان کو ضرورت ہے اگر سب ذاکر ہوتے تو اس مضمون کے مخاطب بھی سب ہی ہوتے مگر افسوس کہ آجکل عموماً مسلمان ذکر سے غافل ہیں رات دن دنیا ہی کے قصہ میں لگے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کو وقت نہیں ملتا اے صاحب وقت تو اتنا ملتا ہے کہ اس کو ادھر ادھر کاٹتے پھرتے ہیں مگر یہ کہئے کہ وقت کی قدر ہی نہیں اور ذکر کی طلب ہی نہیں طلب وہ چیز ہے کہ

اپنا وقت خود نکال لیتی ہے اور عام لوگوں کی میں کیا شکایت کروں ستم یہ ہے کہ سمجھ دار لوگ بھی اس سے غافل ہیں اور سمجھ دار لوگوں سے میری مراد اہل علم ہیں کہ ان کو بھی پڑھنے پڑھانے اور تصنیف و وعظ گوئی ہی میں مزا آتا ہے ذکر سے جان چراتے ہیں پرسوں میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا جو اہل علم ہی میں سے ہیں گو مشاہیر و ممتازین میں سے نہیں وہ لکھتے ہیں کہ اوراد سے میرا بڑا جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا کہ روز صبح کو سورۂ یٰسین پڑھو ظہر کے بعد ہر روز انا فتحنا پڑھو بعد عشا کے سورۂ ملک پڑھو اور روزانہ چکی کی طرح کئی ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرو۔ ہاں مطالعہ کتب میں بہت جی لگتا ہے مگر انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس وسوسہ کو دفع کرتا ہوں اور ہمت کر کے سب اوراد پورے کرتا ہوں یہ علم کا اثر تھا کہ وسوسہ کی غلطی پر متنبہ ہو گئے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ وسوسہ ہی کیوں آیا کبھی روٹی کھانے کے متعلق وسوسہ نہ آیا کہ یہ روز گیہوں کی روٹی کھانا کہاں کا جنم روگ لگا کبھی بیوی کے پاس لیٹنے میں یہ خیال نہ ہوا کہ یہ کہاں کا جنم روگ پیچھے لگ گئی اور اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوق اس کے پاس روزانہ آیا کرے تو کیا اس کو کبھی یہ خیال ہو گا کہ یہ کہاں کا جنم روگ پیچھے لگا کمبخت روز ہی آتا ہے ہرگز نہیں بلکہ وہ تو یہ بہانا ڈھونڈھے گا کہ اور تھوڑی دیر بیٹھے عاشق محبوب کے ساتھ مجالست اور محادثت میں کبھی اختصار کا طالب نہیں ہوتا بلکہ خدا سے یہ چاہتا ہے کہ وصل کی رات کبھی تمام ہی نہ ہو پھر وہ اس کی روزانہ آمد و رفت سے کیونکر گھبرا سکتا ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا "وما تلک بیمینک یا موسیٰ" تو آپ جواب میں عرض کرتے ہیں ھی عصای اتوکو علیھا و اھش بھا علیٰ غنمی ولی فیھا مآرب اخریٰ یہاں آپ نے ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب سے کام لیا مگر اطناب مہمل نہیں جس کو اسہاب کہا جائے بلکہ اطناب مفید جو کہ بلاغت کی ایک نوع ہے اور مفید کس کو موسیٰ علیہ السلام کو کیونکہ اس اطناب سے ان کو اپنے شوق کا اظہار مقصود تھا کہ جب محبوب کے ساتھ بات کا موقعہ مل گیا تو جہاں تک دائرہ بلاغت میں رہ کر کلام میں وسعت ہو سکے اس کو وسعت دینا چاہیئے۔ اس لیے آپ نے عصا کے متعلق جتنی باتیں بیان میں آسکتی تھیں سب بیان کر دیں

یہ بھی اہل طریق کا ایک معمول ہے کہ وہ سوال کا جواب مقام ادب میں بھی پورا دیتے ہیں گو اس میں اطناب ہی ہو جائے البتہ ایسا اطناب نہ ہو جو بے کار و فضول ہو بلکہ جواب پورا ہو اور اطناب مفید ہو۔ آجکل یہ عجیب ادب نکلا ہے کہ بزرگوں کے سامنے گفتگو ادھوری کرتے ہیں آدھی بات زبان پر ہوتی ہے آدھی پیٹ میں کبھی جواب پورا ہی نہیں دیتے کیونکہ پوری بات کہنا خلاف ادب ہے سبحان اللہ اور تکلیف دینا بڑا ادب ہے ارے بھائی اگر ان کے سامنے بولنا بے ادبی ہو بھی تو امر کے بعد تو بے ادبی نہ رہے گی کیونکہ مشہور مسئلہ ہے "الامر فوق الادب" اول تو جواب پورا دینا بے ادبی ہے ہی نہیں اور اگر فرضاً ہو بھی تب بھی امر کے وقت تو امر کا بجالانا ہی ادب ہے۔ یہاں محض اہل حال کی ایک غلطی معلوم ہو گئی وہ یہ کہ بعض اہل حال بیماری اور مصیبت وغیرہ میں دعا نہیں کرتے اور اس کو خلاف ادب سمجھتے اور یوں کہتے ہیں ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن
کہ حال خستہ دلاں را تو خوب می دانی

(آپ کے سامنے حال دل کہنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ آپ تو حالِ دل خستہ کو خوب جانتے ہیں) کہ حق تعالیٰ کو تو سب کچھ معلوم ہے پھر دعا کی کیا حاجت ہے۔ وہ سن لیں کہ گو بظاہر تمہاری دلیل صحیح ہے اور اس کے لحاظ سے دعا کی ضرورت نہیں مگر ایک دوسری وجہ سے ضرورت ہے وہ کیا وہ ضرورت یہ ہے کہ محبوب کا امر ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم بے ضرورت ہی ان سے مانگو اور اپنی احتیاج ظاہر کرو۔ گو وہ سب کچھ جانتے ہیں اسی کو مولنا فرماتے ہیں ؎

از دعا نبود مرادِ عاشقاں   جز سخن گفتن باں شیریں دہاں

(دعا سے عاشقوں کی مرادِ صرف یہ ہوتی ہے کہ اسی بہانے سے اس محبوب حقیقی سے خوب دیر تک لذت کلام و مناجات حاصل ہوتی ہے۔)

یعنی دعا سے عاشقوں کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ محبوب کے ساتھ کچھ دیر باتیں ہی کر لیں کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو گی کہ وہ خود دعا کا امر فرماتے ہیں تو وہ عاشق بڑا محروم ہے جس کو محبوب اجازت دے کہ ہم سے باتیں کرو اور وہ منہ بند کر لے کہ آپ کو

توسب معلوم ہے پھر میں کیوں کہوں یہ تو خامی عشق کی دلیل ہے اگر عاشق ہوتے تو اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے کہ جب وہ بولنے کی اجازت دے رہے ہیں تو مجھ کو خوب بولنا چاہیئے۔ اسی لئے امر کے بعد وہ خوب بولتے ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ دوسرے اس کو بے ادب سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

بے ادب تر نیست زوکس درجہاں   باادب تر نیست زوکس درنہاں

(مولانا رومیؒ عاشقان حق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بظاہر بے ادب ان سے جہان میں کوئی نہیں ہے لیکن ان سے باادب بھی باطن میں جہان کے اندر کوئی نہ ہوگا اور بظاہر بے ادب جوش عشق میں معلوم ہوتے ہیں۔)

جہاں سے مراد علانیہ ہے اور نہاں سے مراد باطن ہے یعنی عاشق سے بڑھ کر ظاہر میں کوئی بے ادب نہیں ہوتا (کیونکہ وہ ایسا سر ہو کر دعا کرتا ہے جیسے کسی سے لڑ رہا ہو) اور باطن میں اس سے بڑھ کر باادب کوئی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے زیادہ بولنے کا منشا محبت ہے اور اس طریق میں محبت ہی بڑا ادب ہے (وہ دلیلہ قولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء) مگر اتنا فرق ہے کہ محبت میں عارف تو حدود کا خیال رکھتا ہے اور مجذوبین و مسلوب العقل لوگوں سے بعض کلمات حدود سے باہر بھی نکل جاتے ہیں مگر چونکہ منشا اس کا بھی محبت ہی ہے اس لئے وہ ظاہر میں بے ادب معلوم ہوتے ہیں مگر باطن میں ادب سے بھرے ہوئے ہیں ان پر ملامت کا حق نہیں گو تقلید بھی جائز نہیں بہرحال امر کے بعد عاشق کو سکوت جائز نہیں جب وہ بولنے کا حکم کرے تو بولنا چاہیئے۔ اس لئے یہ کسی ناقص کا کلام ہے ؎

چہ حاجت است بہ پیش تو حال دل گفتن الخ محقق کا کلام یہ ہے کہ ؎

از دعا نہ بود مراد عاشقاں   جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

(دعا سے مراد عاشقوں کی صرف یہی ہوتی ہے کہ اس بہانے سے حق تعالیٰ کے ساتھ شرف ہمکلامی نصیب ہو جاتی ہے) اور

گفتگوئے عاشقاں درکار رب   جوشش عشق است نے ترک ادب

(عاشقوں کی گفتگو حق تعالیٰ کی محبت میں جوش عشق سے ہوتا ہے نہ کہ ترک ادب سے جیسا کہ اہل

ظاہر ان کے ظاہر کلام سے بدگمانی کرتے ہیں)

اس وقت بولنا ہی ادب ہے اور پوری بات کہنا ہی محبت کی علامت ہے اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام پر ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب کے ساتھ جواب دیا کیونکہ وما تلک بیمینک یا موسیٰ کے جواب میں اتنے لمبے جواب کی ضرورت نہ تھی صرف ھی عصا کہدینا کافی تھا بلکہ صرف "عصا" بھی کافی تھا "ہی" کا بڑھانا بھی اطناب ہے بلکہ یائے متکلم کی بھی ضرورت نہ تھی صرف "عصا" ہی کافی تھا اور خیر اس کو اگر کوئی اطناب نہ مانے تو آگے "اتوکؤ علیها واهش بها علی غنمی تو یقیناً اطناب ہے کہ یہ میری لاٹھی ہے جس پر میں سہارا لیا کرتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑا کرتا ہوں پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اتنا اور بڑھاتے ہیں ولی فیہا مآرب اخریٰ کہ اس سے میرے اور بھی کام نکلتے ہیں۔ اس میں تفصیل کا موقع رکھ لیا کہ ایسی بات کہی جس سے پھر سلسلہ کلام کا تازہ ہوسکے کہ وہ پوچھیں ہاں صاحب وہ دوسرے کام کیا ہیں تو پھر اور باتیں بیان کروں یا بے پوچھے عرض کرسکیں کہ اس وقت جو عرض کیا تھا ولی فیہا مآرب اخریٰ اس وقت اس کی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تو اس وقت اطناب کا منشاء صرف یہی تھا کہ عاشق محبوب کے ساتھ گفتگو میں اختصار نہیں کیا کرتا بلکہ یہ چاہا کرتا ہے کہ ایک منٹ کی بات ہو تو چار منٹ لگ جائیں کیونکہ اس کو محبوب کے ساتھ گفتگو کرنے میں لطف آتا ہے جان میں جان آتی ہے تو وہ ایسے موقعہ میں تطویل کلام کے لئے موقعہ ڈھونڈا کرتا ہے۔

اسی طرح عارفین دعا ضرور کرتے ہیں جس میں مقصود محض حق تعالےٰ سے مناجات اور نیازمندی کی چپکے چپکے باتیں کرنا ہوتا ہے عارف کو تو دعا میں ثواب کا قصد بھی نہیں ہوتا گو اہل ظاہر کو اس سے وحشت ہوگی مگر میں سچ کہتا ہوں کہ عاشق کو محبوب سے باتیں کرتے ہوئے بجز لذت خطاب کے اور کسی طرف التفات نہیں ہوا کرتا۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو اس مقام پر تطویل کی ہے تو اس سے ان کو ثواب کا قصد تھا۔ صاحب اس پر تو ان کو التفات بھی نہ ہوگا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عارفین کو ثواب سے استغنا ہوتا ہے ہرگز نہیں ان کا تو کوئی فعل بھی طلب

ثواب سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ طلب ثواب کے معنے طلب رضا ہی تو ہیں اور طلب جنت اور طلب رضا واحد ہے اور ظاہر ہے کہ عاشق کا کوئی فعل طلب رضا، محبوب سے خالی نہیں ہوتا پس عشاق کا دعا کے وقت محض خدا تعالیٰ سے بات چیت کا قصد کرنا یہ بھی حقیقت میں طلب ثواب ہی ہے پس یوں کہنا چاہیئے کہ ان کو ثواب کا قصد ہوتا ہے مگر ادھر خیال والتفات نہیں ہوتا جب محبوب عاشق سے کوئی بات کہتا ہے تو اس کا جواب دیتے ہوئے عاشق کو ثواب کی طرف التفات نہیں ہو سکتا گو فی نفسہ مقصود ضرور ہے اور اتنی بات تو ہم کو بھی حاصل ہے کہ گو ہماری نماز کچھ چیز نہیں ہے مگر نماز کے وقت ہم کو بھی ثواب پر التفات نہیں ہوتا گو اگر کوئی پوچھے کہ تم نماز کیوں پڑھتے ہو تو سوال کے بعد جواب میں یہی کہیں گے کہ ثواب کے لئے پڑھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ثواب کا قصد تو ہوتا ہے ورنہ یہ جواب کیوں دیتے مگر نماز پڑھتے ہوئے اس پر التفات بہت کم ہوتا ہے پس یہی مطلب ہے میرے اس قول کا عشاق کو دعا میں ثواب کا قصد بھی نہیں ہوتا اور بھلا ثواب سے عاشق کو استغنا کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ سید العاشقین صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ کھانے کے بعد یوں فرماتے تھے۔ "غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا" سبحان اللہ کیا عبدیت ہے کھانا کھا چکنے کے بعد اس کو اٹھا دینا چونکہ ایک قسم کے اعراض کو موہم ہو سکتا ہے تو آپ اس کو اس طرح دور کرتے ہیں کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ میرا پیٹ بھر گیا اور چونکہ اب کھانے کی گنجائش نہیں رہی اس لئے کھانے کو اٹھاتے ہیں ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتے شام کو پھر مانگیں گے اور ہم اس سے مستغنی نہیں ہوئے ہیں۔ جب دنیوی نعمتوں سے بھی عشاق کو استغنا نہیں ہے تو ثواب سے ان کو کیونکر استغنا ہو سکتا ہے۔ بعض جہلا کی عادت ہے بزرگوں کے سامنے کچھ ہدیہ پیش کرتے ہیں تو یوں کہا کرتے ہیں کہ یہ تو حقیر ہدیہ اس قابل نہیں کہ پیش کیا جاوے آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے نہ آپ کو اس کی پروا ہے مگر ہماری خاطر سے قبول کر لیجئے یہ نہایت سخت کلمہ ہے نعم الٰہیہ سے کسی کو استغنا نہیں مشائخ کی بزرگی بھی اسی وقت تک ہے جب تک اللہ تعالیٰ دونوں وقت کھانے کو دے رہے ہیں اور جو

یہ نہ ہو نہ معلوم کیا حالت ہو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا قصہ بیان فرماتے ہیں یہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بھائی ہیں مگر تقویٰ میں سب سے بڑھے ہوئے تھے گو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح زیادہ مشہور نہیں ہوئے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے ان کے سامنے دھیلہ کی کوڑیاں ہدیہ میں پیش کیں آپ کو اس کی رغبت پر رحم آیا اور غریب ہونا تو اسی سے ظاہر تھا کہ بیچارے نے دھیلے کی کوڑیاں پیش کیں تو آپ نے فرمایا بھائی ان کو تم ہی اپنے کام میں لے آؤ اس نے اصرار کیا کہ حضرت میرا تو جی چاہتا ہے کہ آپ ہی انکو قبول کر لیں میں نے آپ ہی کی نیت سے جمع کی ہیں مگر آپ نے عذر کر دیا وہ بیچارہ واپس لے گیا۔ اس پر مبتلا عتاب ہو گئے یا تو اس لئے کہ ایک مسلمان کی دل شکنی ہوئی تھی یا اس لئے کہ آپ کے نفس میں کوئی بات مخفی ہوگی ممکن ہے کچھ وسوسہ استغنار کا تحقیر ہدیہ کی بنا پر آ گیا ہو کہ میں یہ کوڑیاں لیکر کیا کروں بعض دفعہ نفس میں کچھ دقیقہ مخفی ہوتا ہے اور کسی عمل میں نفس کا کچھ شائبہ ہوتا ہے جس کی مبتلا کو خبر نہیں ہوتی اسی لئے بعض دفعہ شیخ مرید کی کسی ادنیٰ بات پر تشدد کرتا ہے جس سے مرید کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شیخ بڑے متشدد ہیں کہ ذرا ذرا سی بات پر مواخذہ کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بات مرید کی نظر میں خفیف ہوتی ہے اور شیخ کی نظر میں شدید ہوتی ہے کیونکہ اس میں نفس کا جو کید ہے وہ مرید کی نظر سے خفی ہے اور شیخ کی نظر میں جلی ہے۔ حدیث میں آیا ہے "الشرک اخفی فی امتی من دبیب النمل علی الصفا کہ شرک میری امت میں چکنے پتھر پر چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہے۔ بھلا اول تو چیونٹی کی چال ہی کیا ہوتی ہے پھر وہ بھی چکنے پتھر پر اس میں تو کچھ بھی اس کا احساس نہیں ہو سکتا تو جو مرض ایسا خفی ہو دوسرے تو اس کو کالعدم سمجھیں گے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بھی شرک فرما رہے ہیں۔ تو کیا نعوذ باللہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی متشدد تھے کہ اتنی ذرا سی بات کو شرک سے تعبیر فرماتے ہیں ہرگز نہیں پھر حق تعالیٰ کی نظر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ ہے وہ تو اس سے بھی خفی تر کو جانتے ہیں اس لئے بعض دفعہ حق تعالےٰ کسی ایسی بات پر مواخذہ فرماتے ہیں جس کا قابل مواخذہ ہونا مبتلا کو معلوم نہیں ہوتا گو

کتنا ہی بڑا عارف ہو مبتلا کو بعض دفعہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کام میں نفس کا کچھ شائبہ تھا مگر حق تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے اس لئے مواخذہ فرماتے ہیں اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے عارفین پر کہ ان کی بات بات پر مواخذہ فرمالیں۔ کیونکہ جس بچہ کو استاد روز ایک قمچی مار دیتا ہو یہ اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس پر شفقت ہے اور جس بچہ کو کبھی سزا نہ ملتی ہو اس پر خطرہ ہے کہ شاید استاد اسے اپنے مکتب سے نکالنا چاہتا ہے اس کو آزاد چھوڑ دینا اس کی دلیل ہے کہ استاد کو اس سے محبت نہیں ہے اس لئے دنیا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ مواخذہ ہوتا رہنا بھی رحمت کی دلیل ہے بلکہ اگر آخرت میں بھی مواخذہ ہو اور کسی مسلمان کو حق تعالیٰ جہنم میں بھیجدیں تو یہ بھی ان کی رحمت ہے کیونکہ قدر نعمت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید۔ نعمت کی قدر مصیبت کے بعد معلوم ہوا کرتی ہے جو شخص جہنم کا عذاب بھگت کر جنت میں جائے گا اس کو جنت کی بہت قدر ہوگی۔

ایک حدیث کے متعلق اپنے استاد علیہ الرحمۃ کا ایک مضمون یاد آگیا جو اسی اصل پر مبنی ہے۔

وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت میں جب سب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہونچ جائیں گے تو جنت میں کچھ جگہ خالی رہ جائے گی اور جہنم بھی نہ بھرے گی۔ تو جنت عرض کرے گی کہ مجھ سے بھرنے کا وعدہ تھا تو مجھے بھرا جائے اور جہنم بھی کہے گی کہ ہل من مزید۔ کچھ اور بھی ہے تو حق تعالیٰ جہنم کے لئے کسی نئی مخلوق کو پیدا نہ کریں گے بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھدیں گے یہ متشابہات میں سے ہے ہم اس کا مطلب بیان نہیں کرسکتے۔ تو حق تعالیٰ کے قدم رکھنے سے جہنم سمٹ کر بھر جائے گی اور کہے گی قط قط یعنی بس بس میں بھر گئی اور جنت کے لئے ایک نئی مخلوق پیدا کرکے اس میں آباد کردیں گے جس سے وہ بھر جائے گی جب یہ حدیث ہم نے پڑھی تو میں نے حضرت استاد سے عرض کیا کہ حضرت یہ لوگ تو ہم سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ بدون کچھ کئے بغیر مشقت کے جنت لے لیں گے کاش ہم انھیں میں سے ہو جاتے۔ تو حضرت استاد نے فرمایا خدا نہ کرے کہ ہم ان میں سے ہوتے میاں وہ ہم سے زیادہ خوش قسمت نہ ہوں گے ہم ہی ان سے اچھے ہوں گے واقعی ان حضرات کے علوم بھی عجیب ہیں جن کا دوسری جگہ کہیں پتہ نہیں فرمایا ہم دنیا کے

مصائب جھیل کر جب جنت میں جائیں گے تو جوش میں کہیں گے الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیہا نصب ولا یمسنا فیہا لغوب ٥ انھیں یہ بات کہاں نصیب کیونکہ جہاں حزن ہو وہیں اذھب عن الحزن کا بھی لطف ہے انھیں کیا لطف جن کو مشقت ہی نہیں ہوئی وہ تو یہ سمجھیں گے کہ بس یوں ہی ہوتا ہوگا کہ پیدا ہوئے اور جنت میں بس گئے ان کو جنت کی قدر ویسی نہ ہوگی جیسی ہمیں ہوگی تو اب سمجھ لو کہ جس شخص کو دنیا کی تکالیف کے ساتھ جہنم کا عذاب بھی بھگتنا پڑے اس کو دخول جنت کے وقت اذھب عنا الحزن کا لطف اوروں سے زیادہ حاصل ہوگا گناہ کی قدر اور لذت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو ڈوبنے کے بعد ساحل پر پہونچا ہو اس کے دل سے ساحل کی لذت پوچھو اور جو شخص ڈوبا ہی نہیں اس کو ساحل کی قدر اور لذت اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

اب میں یہاں اپنا ایک قصہ ایک شبہ کے واقع ہونے کا اور اس کے جواب کے منکشف ہونے کا بیان کرنا چاہتا ہوں اور گو یہ مضمون متن میں بیان کرنے کے قابل تھا تمہید میں بیان کرنے کا ارادہ نہ تھا مگر اسی وقت یاد آیا تو میں بیان کئے دیتا ہوں نہ معلوم پھر یاد رہے نہ رہے ایک دفعہ مجھ کو کچھ پریشانی سی پیش آئی تھی جیسا کہ زمانہ طلب میں عموماً اہل طریق کو پیش آیا کرتی ہے جبکہ وہ مجاہدات اور اذکار و اشغال کچھ مدت تک کر لیتے ہیں اور ثمرہ محسوس نہیں ہوتا تو دل میں وصول کے لئے اضطراب اور بے چینی اور عجلت کا مضمون پیدا ہوتا ہے یہی حالت باوجود مجاہدہ نہ کرنے کے براہ ہوس مجھ کو پیش آئی اور قلب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالےٰ کا شکر ہے گو ہم اس قابل نہیں مگر الٹی سیدھی ہم کو حق تعالےٰ کی طلب بھی ہے گو عشق سعدی تا بزانو ہی کی مثل سہی شیخ سعدی نے ایک عاشق کو دیکھا تھا جو کسی محبوب کی طلب میں کوٹھے پر سے کود پڑا تھا۔ ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ آپ نے قصہ پوچھا کہ یہ کیوں پڑا ہے کیسے ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ اپنے محبوب کو دیکھ کر کوٹھے پر سے کود پڑا اس لئے چوٹ لگ گئی۔ تو شیخ سعدی رح بھی اسی زینہ کی ایک سیڑھی پر چڑھ کر کود پڑے اور فرمایا "عشق سعدی تا بزانو" کہ بھائی ہمارا عشق اتنا ہی ہے کہ ایک گز بلندی سے

تو ایسے ہی گو ہماری طلب کامل نہیں مگر پھر بھی بحمد اللہ کچھ تو ہے۔ ادھر حق تعالیٰ قادر ہیں۔ ان کو اسباب و وسائط کی کچھ ضرورت نہیں وہ اگر چاہیں تو دفعۃً واصل کر سکتے ہیں ادھر وہ علیم بھی ہیں ہماری اس بے چینی اور اضطراب کی ان کو خبر بھی ہے پھر رحیم بھی ہیں اس حالت میں ان کو رحم بھی آتا ہوگا پھر وصول میں دیر کیوں ہے جلدی کیوں نہیں ہو جاتا واقعی سچ فرمایا خلق الانسان عجولاً انسان میں عجلت کا مادہ فطری ہے غرض ان مقدمات کے بعد وصول کی تاخیر سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کس لئے ہے جب زیادہ الجھن بڑھی تو میں نے مثنوی سے فال لی اور اس فال کا یہ مطلب نہ تھا کہ میرے اعتقاد میں مولانا رومی نے آکر ورق لوٹ دیئے ہرگز نہیں بلکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ مولانا رومی متبرک بزرگ اور محقق تھے ان کا کلام بھی متبرک اور جامع ہے۔ حق تعالیٰ اس برکت کو اس طرح ظاہر فرما دیتے ہیں کہ اس میں سے کوئی موافق مضمون نکال دیتے ہیں چنانچہ مثنوی کھولتے ہی سر ورق پر اس کا جواب موجود تھا۔ یہ بھی نہیں کہ سطریں گننے کی ضرورت پڑی ہو جس کا جی چاہے مثنوی مطبوعہ کھول کر دیکھ لے یہ اشعار سر ورق پر ملیں گے اور جواب بھی ایسا نکلا کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ خود بھی زندہ ہوتے تو یہی جواب دیتے۔ واقعی عجیب جواب ہے جس میں کمال یہ ہے کہ میرے مقدمات بھی سب تسلیم کر لئے گئے پھر جواب دیا گیا فرماتے ہیں ؎

چارہ ے جوید پئے من داد تو   می شنودم دوش آہ سرد تو

(تمہاری طرف سے سعی اور ہماری تلاش ہم کو تسلیم ہے۔ اور اے عاشق ہم نے تیری آہ بھی سن لی ہے) اس میں طلب اور علم کو تسلیم کیا گیا کہ بیشک تم کو طلب بھی ہے اور درد کے لئے چارہ کی تلاش بھی ہے اور مجھ کو اس کی خبر بھی ہے میں تمہاری آہ و فریاد کو سن رہا ہوں ؎

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار   رہ نمایم داد ہم راہ گذار

(میں اس کی قدرت رکھتا ہوں کہ بے انتظار ہی تم کو قرب تام عطا کر دوں)

تا ازیں طوفان دوراں وارہی   بر سر گنج وصالم پا نہی

(تاکہ تم اس طوفان مجاہدات سے نجات پا جاؤ اور میرے قرب کے خزانے کو پا جاؤ)

اس میں قدرت کا ذکر ہے کہ یہ بھی مسلم ہے کہ ہم بدون کسی انتظار کے بھی واصل بنا سکتے ہیں اور ہم کو رحم بھی آتا ہے کہ تم کس طوفان بلا میں گرفتار رہو۔ جلدی وصول ہو جانے میں اس طوفان سے بھی نجات ہو جائے گی۔ ان سب مقدمات کا مقتضا تو یہی ہے کہ وصول میں دیر نہ ہوتی مگر ایک مقدمہ تمھاری نظر سے رہ گیا وہ یہ کہ جیسے ہم علیم و قادر و رحیم ہیں اسی طرح ہم حکیم بھی ہیں پس تم نے یہ تو دیکھ لیا کہ طلب و رحمت و قدرت کا مقتضا تعجیل تھی یہ نہ دیکھا کہ حکمت کا مقتضا تاخیر ہے آگے تاخیر کی حکمت کا بیان ہے اور واللہ عجیب حکمت ہے فرماتے ہیں ؎

لیک شیرینی و لذاتِ مقر ہست بر اندازۂ رنج سفر

(لیکن وصل کی شیرینی اور قرب، منزل کی لذت سفر کے مشقتوں کے اعتبار سے محسوس ہوتی ہے) وہ حکمت یہ ہے کہ قرارگاہ پر پہونچنے کی شیرینی اور لذت مشقت سفر کے موافق محسوس ہوا کرتی ہے جس کو سفر میں زیادہ تعب اور مشقت ہوتی ہے اس کو منزل پر پہونچنے کے بعد اتنی ہی لذت بھی آتی ہے اور جس کو بدون تعب کے وصول ہو گیا اسے منزل پر پہونچنے کی پوری قدر نہیں ہوتی ؎

زانکہ از فرزند خویشاں برخوری کز غریبے رنج و محنت ہا بری

(جو مسافر کئی سال پر اپنے بال بچوں میں آتا ہے جس کو گھر آکر بہت لطف محسوس ہوتا ہے) جو مسافر کئی سال کے بعد اپنے گھر پر آتا ہے بیوی بچوں سے مل کر اس کو زیادہ خوشی ہوتی ہے پس یہ حکمت ہے تاخیر فی الوصول میں تاکہ تم کو وصول کی پوری قدر ہو۔ اگر رستے ہی پہنچ جایا کرتے تو وصول کی بے قدری کرتے کیوں اس لئے کہ ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص کسی چیز کو مفت پا جاتا ہے اس کو مفت میں دیدیتا ہے جس طرح نادان بچہ موتی کو روٹی کے بدلے میں دیدیتا ہے)

اور جس شخص کو مشقت اور مصیبت کے بعد وصول ہوگا اس کی تو عمر بھر یہ حالت رہیگی کہ ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

اس کو ذرا ذرا سی کوتاہی پہاڑ کی برابر گراں معلوم ہوگی اور جو آسانی سے پہنچ گیا ہے وہ اتنا پھونک پھونک کر قدم نہ رکھے گا کیونکہ عدم وصول کی بے چینی کا اندازہ ہی نہیں ہوا پس یہ جواب دیکھ کر میری تسلی ہوگئی جو بہت بڑی حکمت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے حضرات میں جو اہل تصرف بھی ہوئے ہیں وہ تصرف سے کام نہیں لیتے تھے اور کسی کو ایک توجہ سے واصل نہیں بناتے تھے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات صاحب تصرف نہ تھے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بس یہ تو محض ملا ہیں نماز روزہ کرلیتے ہیں ان میں تصرف وغیرہ کچھ نہیں یہ بالکل غلط ہے بحمد اللہ ہمارے حضرات میں بڑے بڑے صاحب تصرف بھی ہوئے ہیں جن کو تصرف کی کامل قدرت حاصل تھی مگر وہ اس سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ طالبین ہی سے چکی پسواتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ یہ خود محنت کرکے واصل بنیں تاکہ وصول کی قدر ہو اور جو تصرف سے واصل ہوگا اس کو وصول کی قدر نہ ہوگی۔ دوسرے بلا اذن تصرف کرنا کمال عبدیت کے بھی خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون صاحب تصرف ہوگا اگر آپ تصرف کرتے تو سارے عالم کو ایک دم سے ولی[ے] بنا دیتے کسی کی مجال نہ تھی جو کفر کرسکتا مگر آپ نے اس سے کام نہیں لیا۔ حضرت ابو طالب کے متعلق آپ کی خواہش بھی تھی کہ یہ ایمان لے آئیں مگر آپ نے قوت تصرف کو استعمال نہیں کیا۔ تو خدا معاف کرے

[ے] سوال :- هذا الکلام یردہ ظاهرا قوله تعالیٰ انك لاتهدی من احببت ولکن الله یهدی من یشاء فانه ینفی قدرة التصرف عنه صلی الله علیه وسلم۔ جواب :- لیس فیه نفی ذلك ولوکان کذلکان حق العبادة انك لاتهدی من شئت ولکنه قال تهدی من احببت فعلم به انه صلی الله علیه وسلم لم یرد هدایة احد نعم احبها لبعض والحب غیر الارادة ولو اراد ذلك وصرف فیه همة لهدی الله الناس جمیعا ۲ (رجا مع) ثم المشیة لم درجتان احدهما صرف القدرة فقط و ثانیها صرف الهمة مع ذلك والثابت بالایة لو ثبت هو الاول فقط والمنفی فی کلامنا هو الثانی ۱۲ (اشرف)

کہ ابوطالب کے نام کے ساتھ زبان سے حضرت ہی نکلتا ہے حالانکہ وہ ایمان نہیں لائے مگر چونکہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی اور محبت بھی ایسی کہ جان نثار تھے اور چچا بھی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے محبت تھی اس لئے زبان پر ان کے نام کے ساتھ بیساختہ حضرت نکل جاتا ہے ابوجہل کے نام کے ساتھ کبھی نہیں نکلتا کیونکہ وہ آپ کا چچا تھا اگرچہ حقیقی نہ تھا مگر اس کے ساتھ ہی موذی بھی بہت تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے بہت ایذا دی ہے اس لئے اس کے نام کے ساتھ کوئی تعظیمی لفظ نہیں نکلتا۔ ایسے ہی ابولہب کے نام کے ساتھ بھی نہیں نکلتا کہ وہ حقیقی چچا ہے مگر ایذا میں ابوجہل کے مثل تھا (بعض لوگ سورۂ تبت کے پڑھنے سے کراہت کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی مذمت ہے اس کے پڑھنے سے آپ کو ایذا ہوتی ہوگی اور اس کے متعلق ایک خواب بھی مشہور ہے۔ مگر جو خواب دلائل شرعیہ کے خلاف ہو وہ حجت نہیں ہوا کرتا) بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام الٰہی کے پڑھنے سے کبھی ایذا ہو سکتی ہے ہرگز نہیں یہ مانا کہ وہ آپ کا چچا تھا مگر ادھر یہ بھی تو دیکھو کہ حق تعالیٰ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسا علاقہ تھا پھر محبوب اگر اپنے کسی عزیز سے بغض رکھے تو کیا عاشق کو اس سے بغض نہ ہوگا ضرور ہوگا اور محبوب اگر اس عزیز کی مذمت کرے تو کیا عاشق کو اس سے ایذا ہوگی کبھی نہیں ہوگی بلکہ لذت آئیگی (ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی خاص صورت کی تعیین کر لینا مناسب نہیں کہ اس میں سورہ تبت اور اس کے غیر سب برابر ہیں۔ ممکن ہے کسی نے اسی صورت کو قرأۃ کے لئے ورد بنا لیا ہو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشرطیکہ خواب کا قصہ صحیح ہو لطیف عنوان سے خواب میں متنبہ فرمایا ہو ممکن ہے کہ اس شخص میں ادب کم ہو آپ نے بطور معالجہ کے اس کے لئے یہ تجویز فرمایا ہو ۱۲ جامع) بہرحال اگر آپ تصرف سے کام لیتے تو کم از کم اپنے عزیزوں پر تو ضرور اثر ڈال دیتے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ اسی سنت کا اتباع ہمارے حضرات کرتے ہیں وہ بھی تصرف سے کام نہیں لیتے اور اگر کبھی کسی متوسط نے ایسا کیا بھی تو اکابر نے اس کو مٹا دیا ہے۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک

دفعہ کسی بادشاہ سے گفتگو کر رہے تھے ساتھ میں حضرت شبلی بھی تھے اثناء گفتگو میں بادشاہ نے حضرت جنید کو کوئی سخت کلمہ کہا وہ تحمل سے کام لیتے رہے مگر حضرت شبلیؒ سے نہ رہا گیا وہاں کوئی قالین بچھا ہوا تھا جس پر شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی حضرت شبلیؒ نے اس تصویر پر توجہ کا اثر ڈالا تو وہ سچ مچ شیر بن گیا۔ حضرت جنیدؒ نے دیکھ لیا انھوں نے فوراً اس پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ پھر مٹ گیا اور تصویر کی تصویر رہ گئی بادشاہ نے پھر کسی بات پر کوئی سخت کلمہ کہا حضرت شبلیؒ نے پھر توجہ کی جس سے دوبارہ وہ تصویر سچ مچ شیر کی صورت بن گئی۔ حضرت جنیدؒ نے پھر ہاتھ رکھ کر اس کو مٹا دیا کئی بار ایسا ہوا حتیٰ کہ ایک دفعہ بادشاہ کی نظر بھی شیر پر پڑ گئی تو اس کا رنگ فق ہو گیا اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو حضرت جنید رحمہ نے تسلی کی کہ آپ نہ گھبرائیں اس کی مجال نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کو کچھ بھی کہہ سکے آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ آپ کو حق ہے کہ ہمیں جو چاہیں کہیں میں کبھی آپ کے مقابلہ میں تصرف نہ کروں گا۔ یہ شبلی بچہ تھا اس سے تحمل نہ ہوا اس نے تصرف سے کام لے لیا۔ مگر میں اپنے سامنے اس کے کسی تصرف کو آپ پر چلنے نہ دوں گا بالکل بے فکر رہیں۔ حضرت جنیدؒ نے تو اس کو بے فکر کر دیا مگر اس کو ان حضرات کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو کتنی قوت عطا کی ہے پس اس کے بعد سنبھل سنبھل کر باتیں کرنے لگا پھر کوئی گستاخی نہیں کی۔ سو ہمارے اکابر تو ایسے ہوئے ہیں کہ خود تو تصرف کیا کرتے اگر کسی چھوٹے نے کیا بھی تو اس کو مٹا دیا غرض وہ تصرف اس لئے نہیں کرتے کہ اول تو اس میں سالک کو نعمت کی قدر نہیں ہوتی کیونکہ قدر تو بعد مشقت ہی کے ہوتی ہے دوسرے پھر وہ ہمت توڑ دیتا ہے پس توجہ ہی کے سہارے پر چلتا ہے۔ تیسرے یہ طریقہ خلاف سنت بھی ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کبھی تصرف سے کام نہ لیتے تھے (اس مقام پر پہنچکر حضرت مولانا کو ما قبل کا ربط یاد نہ رہا تو جامع وعظ سے دریافت فرمایا تو اس نے اطلاع کی کہ یہ مضمون اس پر چلا تھا کہ خدا تعالیٰ کا مواخذہ بھی رحمت ہے خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں اس پر فرمایا کہ ۱۲ جامع) میں یہ بیان کر رہا تھا کہ

حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر کبھی گرفت ہو جانا بھی رحمت ہے۔ جیسے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ساتھ معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل ابھی آتی ہے اسی پر یہ مضمون چل پڑا تھا کہ وصول میں تاخیر ہونا بھی رحمت ہے اس میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں اور اسی حکمت کے ضمن میں اپنے اکابر کے تصرف نہ کرنے کی وجہ بھی بتلا دی تھی اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اس غریب کا ہدیہ جو دھیلہ کی کوڑیاں تھیں واپس کر دیا تو اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ اسی دن سے تمام فتوحات بند ہوگئیں اور فاقہ پر فاقہ گذرنے لگا اول تو انہوں نے اس کو حکمت خاص پر محمول کیا کہ شاید رفع درجات کے لئے یہ معاملہ ہو رہا ہے مگر پھر تنبہ ہوا کہ نہیں یہ تو عتاب ہے۔ عارف کو خدا تعالےٰ نے ایک نور دیا ہے وہ اس سے سمجھ لیتا ہے کہ کونسی مصیبت رفع درجات کے لئے آئی ہے اور کونسی عتاب کی وجہ سے آئی ہے (جس کی ایک علامت یہ ہے کہ جس مصیبت کا منشا عتاب ہوتا ہے اس سے بے چینی اور پریشانی بڑھتی ہے) غرض آثار سے وہ سمجھ گئے کہ یہ فتوحات کی بندش کسی عتاب کی وجہ سے ہے پھر سوچنے سے خیال آیا کہ فلاں دن اس غریب کی کوڑیاں واپس کر دی تھیں شاید یہ بات ناپسند ہوئی ہے۔ بس اسی وقت گھبرا کر بلایا اور خود سوال کیا کہ بھائی وہ دھیلہ کی کوڑیاں ہمیں دیدو آہ یا تو دینے سے بھی نہ لیا تھا یا خود اس سے مانگ رہے ہیں ؎

ایں چنیں شیخے گدائے کو بکو عشق آمد لا اُبالی فاتقوا

(ایسا شیخ آج گدائی گلی در گلی کر رہا ہے عشق کی یہی شان ہے یہ بڑا ہی لااُبالی ہے اس سے بچ کے رہو)

واقعی یہ عشق بھی بہت ناچ نچاتا ہے وہ بیچارہ یہ سن کر باغ باغ ہوگیا۔ اور کہا مولانا واقعی مجھے آپ کے انکار سے بہت کلفت ہوئی تھی اور میں نے اب تک وہ کوڑیاں خرچ نہیں کیں۔ دل نے گوارا ہی نہیں کیا کہ ان کو خرچ کروں اب تک ویسی ہی رکھی ہیں آپ نے کہا بس جلدی لے آؤ اب میں اس کلفت کا تحمل نہیں کر سکتا جو تم کو ایذا دینے سے

مجھے پہنچ رہی ہے چنانچہ اس نے وہ کوڑیاں دیں اور آپ نے خوش خوش لے لیں بس اسی دن سے فتوحات کا دروازہ کھل گیا صاحبو! عارفین کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ وہ دھیلہ کی کوڑیوں سے بھی مستغنی نہیں ہیں اور اگر کبھی ذرا بھی کسی ادنیٰ نعمت سے استغنا کا وسوسہ پیدا ہوجائے تو پھر خود مانگتے ہیں پھر ان کو دعا میں ثواب یا جنت سے استغنا کیونکر ہوسکتا ہے۔ اس لئے یہ مولانا نے فرمایا ہے کہ ؎

از دعا نہ بود مراد عاشقاں　　جز سخن گفتن بہ آں شیریں دہاں

(دعا سے عاشقان حق کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ سے اسی بہانہ سے ہم کلامی کی لذت نصیب ہو جاتی ہے)

اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو لذت خطاب کے سوا جنت یا ثواب کی طلب اور پروا نہیں ہوتی ہرگز نہیں پروا تو ان کو ہر چیز کی ہے ہاں غلبہ لذت وخطاب میں بعض دفعہ ثواب وغیرہ کی طرف التفات نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے نماز کی مثال سے اس کو واضح کردیا تھا اور یہ مضمون دعا کا اس پر چلا تھا کہ عاشق محبوب کے روز روز نہ آنے اور دیر تک بات چیت کرنے سے نہیں گھبرایا کرتا بلکہ وہ تو اس کا موقعہ ڈھونڈا کرتا ہے کہ کسی طرح اور دیر تک باتیں ہوں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جواب میں اسی لئے اطناب سے کام لیا تھا اس پر درمیان میں ان سالکین کی غلطی ظاہر کردی تھی جو دعا کو ترک کر دیتے ہیں اور بتلا دیا تھا کہ گو حق تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اور تمہارے بتلانے اور مانگنے کی ضرورت نہیں مگر محبت کا مقتضا یہ ہے کہ جب محبوب بولنے کی اجازت دے تو بات چیت کے موقعہ کو غنیمت سمجھے اور خوب عرض و نیاز کرے اور جو چاہے مانگے (یعنی حدود میں رہ کر ۱۲ جامع) غرض عاشق کبھی محبوب کے روز روز آنے سے نہیں گھبرایا کرتا جیسا کہ ہم روز روز دو وقت روٹی کھانے سے نہیں گھبراتے تو حیرت ہے کہ ہم لوگ روٹی سے تو مستغنی نہیں ہیں مگر ذکر سے مستغنی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اہل علم بھی خط میں لکھتے ہیں کہ اوراد سے جی گھبراتا ہے کہ یہ کہاں کا جنم روگ لگا جس کا تذکرہ ابھی کیا تھا افسوس ان لوگوں نے دنیا کے کاموں کو کبھی جنم روگ نہ سمجھا دیکھئے جو لوگ کسی کام پر ملازم ہیں وہ روز آ

اسی کام پر لگتے ہیں کوئی روز آٹے کی مشین چلاتا ہے کوئی روز تعمیر کے کام پر جاتا ہے آخر اس کو جنم روگ کیوں نہیں سمجھا گیا بس یوں چاہیئے کہ ہر دن نیا کام کیا جائے ایک ہی کام روز روز کیوں کیا جاتا ہے اس کا منشا صرف یہ ہے کہ ان کاموں کو تو مفید اور ضروری سمجھتے ہیں اس لئے عمر بھر روزانہ کرنے سے بھی نہیں گھبراتے اور ذکر کو مفید اور ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ جنم روگ معلوم ہوتا ہے حضرت یہ ہماری بدقسمتی ہے ورنہ ذکر ایسی چیز ہے کہ مسلمان کو تو اس سے کبھی غفلت نہ ہونا چاہیئے تھی، غالباً حضرت خواجہ عبید اللہؒ احرار کا ارشاد ہے کہ مجھے بہت زمانہ کے بعد معلوم ہوا کہ عالم میں اہل غفلت بھی ہیں ورنہ ابتداء سے میں یہ سمجھتا تھا کہ سب لوگ ذاکر ہیں۔ خدا سے غافل کوئی نہیں۔ خواجہ صاحب بچپن ہی سے صاحب نسبت تھے مادرزاد ولی تھے ان پر کبھی غفلت گذری ہی نہیں اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ سب ایسے ہی ہوتے ہوں گے بعد میں معلوم ہوا کہ دنیا میں اہل غفلت بھی ہیں۔ اس نمونہ کے ایک بزرگ اس زمانہ میں بھی ہوئے ہیں۔ مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب مادرزاد ولی تھے۔ ایک دفعہ کوئی گوجران کی بھینس چرا لے گیا حضرت نے تلاش کیا تو لوگوں نے اسی پر شبہ ظاہر کیا کہ حضرت فلاں شخص لے گیا ہے آپ نے اس سے فرمایا کہ بھائی ہماری بھینس اگر لی ہو تو دیدو اس نے قسم کھالی کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس نہیں لی کسی نے جھوٹ موٹ میرا نام لے دیا ہے آپ کو یقین آگیا اور لوگوں سے کہا کہ اس نے نہیں لی وہ تو قسم کھاتا ہے۔ یہاں تو وہ قسم کھا کر بری ہو گیا مگر خدا تعالیٰ سے کیونکر چھوٹتا غیب سے اس پر افتاد پڑی اور نقصان پر نقصان اموات پر اموات ہونے لگیں سمجھ گیا کہ یہ حضرت کے سامنے جھوٹی قسم کھانے اور ان کو تکلیف پہونچانے کا وبال ہے آخر جھک مار کر آیا اور اقرار کیا کہ حضرت میں نے آپ کی بھینس چرائی تھی میری خطا معاف کر دیجئے فرمایا کہ تو نے قسم کھا کر کہا تھا میں نے نہیں لی۔ کہا میں نے جھوٹی قسم کھالی تھی یہ سن کر حضرت گھبرا گئے اور فرمایا اللہ کسوں (یعنی اللہ کی قسم یہ پرانا محاورہ تھا) مجھے تو آج خبر ہوئی کہ مسلمان جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے پہلے۔ بزرگوں کے محاورات سیدھے

سادے ہوتے تھے اللہ کی قسم کی جگہ اللہ کسوں کہتے تھے تو بعض مادرزاد ولی اور صاحب استغراق آجکل بھی ہوتے ہیں بہرحال ذکر ایسی ہی چیز ہے کہ ہر مسلمان کو لازم ہونا چاہیئے مگر بدقسمتی سے آجکل لازم نہیں رہا اس کی بھی ایک خاص جماعت رہ گئی ہے سو اس مضمون کا تعلق ان ہی اہل ذکر سے ہے اس لئے اس کے لئے ایک خاص مجلس منعقد کی گئی ورنہ حقیقت میں یہ مضمون سب مسلمانوں کے لئے عام تھا۔ اب اس کو سن لیجئے وہ مضمون یہ ہے کہ "اللہ تعالےٰ کے تمام افعال میں رضا چاہیئے۔ اور اپنی تجویز کو ان میں دخل نہ دینا چاہیئے" گو یہ بات سب کو معلوم ہے اور اعتقاداً سب ذاکرین اس کو مانے ہوئے ہیں مگر حالاً کبھی اس میں کوتاہی ہو جاتی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ الوان محبت مختلف ہیں کسی میں التہاب ہے اور کسی میں خمود ہے یعنی بعض میں طلب کا لون کیفیت عشقیہ وشوقیہ کے ساتھ ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے التہاب اور اضطراب یعنی سوزش وشورش اور بعض میں انس کے ساتھ ہوتا ہے جس کا خاصہ ہے خمود اور برودت تو کبھی صاحب خمود اپنے کو التہاب واحتراق سے خالی دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں محبت سے محروم ہوں کیونکہ وہ محبت کو لون التہاب کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے پھر عجلت کی وجہ سے اپنے لئے التہاب کو تجویز کرتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ کسی طرح میرے اندر بھی التہاب پیدا ہو اور جب کسی حکمت سے حق تعالیٰ اس میں یہ کیفیت پیدا نہیں کرتے تو یہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھ کر مغموم رہتا ہے مگر یہ اس کی غلطی ہے اس نے یہ نہیں سمجھا کہ محبت کا ایک لون۔ برد خمود بھی ہے پس یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں محبت سے محروم ہوں ہرگز محروم نہیں ہو محبت سے تم بھی حصہ لئے ہوئے ہو۔ مگر اس کا رنگ دوسرا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ محبت سے اپنے کو خالی سمجھنے والا کیا کبھی ایک دن کی نماز بھی ترک کر سکتا ہے اگر کوئی اس کو ہزاروں روپیہ دے اور یہ کہے کہ آج نماز نہ پڑھو تو کیا یہ اس کو گوارا کر سکتا ہے ہرگز نہیں کوئی مسلمان اس کو گوارا نہ کرے گا ہاں شرط یہ ہے کہ صاحب طلب ہو طالب دنیا نہ ہو ورنہ وہ تو ایک پیسہ میں بھی نماز کو بیچ دے گا ہزاروں کا تو کیا ذکر چنانچہ آجکل بہت مسلمان دین فروشی کر رہے ہیں

اور بعض اہل علم بھی اس گناہ میں مبتلا ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ عوام کی دین فروشی تو بصورت دنیا ہوتی ہے وہ گناہ کو گناہ کی شکل میں کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گنہگار بھی سمجھتے ہیں۔ اور مولوی صاحب کی دین فروشی بصورت دین ہوتی ہے وہ گناہ کو طاعت بنا کر کرتے ہیں غلط فتوے دیں گے اور ٹھونس ٹھانس کسی کلیہ کے تحت میں داخل کر دیں گے۔ ان سے تو وہ عوام ہی اچھے جو گناہ کر کے ڈرتے اور اپنے کو برا سمجھتے ہیں اور یہ مولوی صاحب تو طاعت بنا کر ڈرتے بھی نہیں کیونکہ اپنے نزدیک وہ گناہ کو شریعت کے موافق بنا چکے ہیں شاید اس پر کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ تم نے عوام کی دین فروشی کو علماء کی دین فروشی سے اچھا کیونکر کہدیا۔ اور ان کو صاحب خشیت اور مولویوں کو خشیت سے خالی کیونکر بنا دیا حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت تو علماء ہی میں ہوتی ہے جہلاء میں نہیں ہوتی چنانچہ حق تعالیٰ اس کی تصریح فرماتے ہیں انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم خشیت کے لئے شرط ہے علت نہیں ہے۔ اس کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ علم کو علت خشیت سمجھتے ہیں اس لئے اس پر یہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ آیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ کوئی عالم خشیت سے خالی نہ ہو۔ اور کسی مولوی سے گناہ کا صدور نہ ہو حالانکہ اس کے خلاف مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ اشکال پہلے مجھے بھی ہوتا تھا پھر خود بخود قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ اس کا حصر کا مفہوم تو یہ ہے کہ "لا یخشی اللہ من عبادہ الا العلماء" جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ "لا خشیۃ الا بالعلم" نہ کہ "لا علم الا بالخشیۃ" پس یہ حصر ایسا ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لا صلوٰۃ الا بطہور کہ نماز بدون وضو کے نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا جہاں وجود ہوگا وضو کے ساتھ ہوگا بدون وضو کے نہ ہوگا۔ یہ تو مطلب نہیں کہ جب وضو کا وجود ہو تو اس کے ساتھ نماز کا وجود بھی لازم ہو اسی طرح یہاں پر علم شرط خشیت ہے کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے گو وہ مولوی بھی نہ ہو کیونکہ جاہل بھی خدا سے ڈرتا ہے تو اسے کم از کم عذاب ہی کا علم ہے تو خشیت بدون علم کے اس کو بھی نہیں ہوئی باقی یہ ضرور نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں

خشیت لازم ہو کیونکہ علم اس کی علت نہیں اور علت کا وجود تو معلول کے وجود سے مستلزم ہوتا ہے مگر شرط کا وجود مشروط کے وجود کو مستلزم نہیں ہوتا ہاں انتفاء شرط انتفاء مشروط کو بیشک مستلزم ہوتا ہے سو ایسی نظیر کوئی نہیں دکھا سکتا کہ کہیں خشیت کا وجود بدون علم کے ہو گیا ہو تو علم لوازم خشیت سے ہوا نہ کہ خشیت لوازم علم سے بہر حال اس آیت کی تفسیر میں بہت لوگوں نے غلطی کی ہے اس لئے میں نے متنبہ کر دیا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ علوم معقولہ سے فہم قرآن میں بہت سہولت ہو جاتی ہے چنانچہ شرط اور علت کا نام سنتے ہی طلبہ فوراً سمجھ گئے ہوں گے کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے یہ کام کی بات تھی اس لئے درمیان میں بیان کر دی گئی۔ غرض جو لوگ طالب دنیا ہوں ان کا تو ذکر نہیں مگر طالب حق جو صاحب خمود ہی ہو ہرگز کسی طرح کی وجہ سے نماز کو قضا نہیں کر سکتا پس اس کا اپنے کو محبت سے خالی سمجھنا غلط ہے اگر محبت سے محروم ہوتا تو نماز سے اتنی محبت نہ ہوتی اور طالب ہو کر بھلا محروم کیونکر ہو سکتا ہے میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا کیونکہ حق تعالے کا وعدہ ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیٰ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیٰ باعا یعنی جو میری طرف ایک بالشت بھر قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس سے قریب ہوتا ہوں اور جو ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں ایک باع یعنی دونوں کھلے ہوئے ہاتھوں کی مقدار اس سے قریب ہوتا ہوں اور یہاں چونکہ طلب موجود ہے تو قصد تقرب بھی موجود ہے اور اس پر وعدہ ہے عطاء تقرب کا تو محرومی نہیں ہو سکتی بلکہ یقیناً یہ شخص مقرب ہے۔ گو اس کا تقرب بصورت تنزل ہی ہو اور گو اس کے زعم میں خلود اور محرومی ہو کیونکہ عروج قرب حق کی یہ بھی ایک قسم ہے کہ تنزل کی صورت میں ہو مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت پیغمبر کہ معراج مرا نیست از معراج یونس اجتبا

(حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری معراج کو حضرت یونس علیہ السلام کے معراج پر ترجیح مت دو ان کا عروج بصورت نزول ہے قرب حق بصورت نزول ہے قرب

حق بصورت عروج پر منحصر نہیں ہے جیسا کہ سجدہ میں قرب بصورت نزول ہے)

قرب نز پستی ببالا رفتن است   قرب حق از قید ہستی رستن است

(قرب حق بلندی اور پستی پر جانا نہیں ہے۔ قرب حق قید ہستی سے خلاصی پانا ہے)

مولانا نے حدیث لا تفضلو لی علی یونس بن متی کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس کے عموم میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو کیونکہ جس طرح قرب حق کی ایک صورت پستی سے بلندی کی طرف جانا ہے اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہے کہ بلندی سے پستی کی طرف جائے قرب حق صورت عروج ہی میں منحصر نہیں بلکہ کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے اگر قرب ہمیشہ بصورت عروج ہی ہوا کرتا تو حق تعالےٰ واسجد واقترب نہ فرماتے بلکہ واسجد وابتعد فرماتے کیونکہ سجدہ میں تو بلندی کی طرف نہیں جاتا بلکہ بندہ پستی کی طرف جاتا ہے اگر یہ بعد ہوتا تو حق تعالےٰ اسپر واقترب کو مرتب نہ فرماتے حالانکہ نص میں صراحۃً سجدہ کو سبب قرب فرمایا گیا ہے معلوم ہوا کہ قرب کبھی بصورت نزول بھی ہوتا ہے پس تم یہی سمجھو کہ تم کو اسی صورت سے قرب عطا ہوا ہے۔ صاحب اگر تم خدا سے دور ہوتے تو وہ طاعات وذکر کی تم کو کبھی توفیق نہ دیتے اور یہ طلب تمہارے اندر پیدا نہ کرتے۔ یہ مضمون حضرت حاجی صاحبؒ نے بیان فرمایا تھا واقعی حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے شبہات کے حل کرنے کے امام تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ فرمایا کہ جو شخص حج کر کے یہ وسوسہ رکھے کہ نہ معلوم میرا حج قبول ہوا یا نہیں وہ بڑا بدگمان ہے۔ اگر حج تعالیٰ کو قبول حج منظور نہ ہوتا تو وہ تم کو اپنے دربار میں آنے بھی نہ دیتے دور ہی سے دھکے دیدیتے جیسا کہ ہزاروں کو باوجود وسعتِ دولت کے حاضری کی توفیق نہیں دی۔ جب حق تعالےٰ نے تم کو اپنے گھر تک بلا لیا تو امید قوی رکھو کہ ان شاء اللہ تعالےٰ حج قبول ہے اور حدیث میں ہے۔ "انا عند ظن عبدی بی" اس قاعدہ سے امید ہے کہ اگر تمہارا حج قابل قبول بھی نہ ہو تو اس گمان نیک کی برکت سے قبول ہو جاوے گا۔

اسی طرح ایک واقعہ ایک ذاکر نے عرض کیا کہ حضرت میں چوبیس ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کرتا ہوں مگر کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا۔ فرمایا یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو اس قدر ذکر کی توفیق ہوتی۔ سبحان اللہ اس سے زیادہ اور کیا حل ہوگا غرض جو شخص طلب میں مشغول ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ میں صرف طالب ہی ہوں اور اسی طلب سے کام کر رہا ہوں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کو بھی اس سے محبت ہے صاحب حق تعالیٰ ہی کی محبت سے آپ کام کرتے ہیں اگر ان کو محبت نہ ہوتی تو آپ کی کیا مجال تھی جو طلب میں مشغول ہوتے اور ذکر و طاعات بجالاتے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست   تا بجوشد آبت از بالا و پست

(پانی مت تلاش کرو پہلے اپنے اندر پیاس پیدا کرو پیاس کی برکت سے پانی تمہارے اندر سے جوش
یعنی پانی کی تلاش کم کرو اور اپنے اندر تشنگی پیدا کرو جہاں تشنگی ہوگی وہاں پانی خود بخود پہنچ جائے گا آگے فرماتے ہیں کہ جس طرح پیاسے پانی کے طالب ہیں اسی طرح پانی بھی ان کا طالب ہے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے لوگ اگر جہاں سے پانی ڈھونڈتے ہیں تو پانی بھی اپنے پیاسوں کو تلاش کرتا ہے)

مطلب یہ ہے کہ ہر محب محبوب بھی ہوتا ہے اور ہر طالب مطلوب بھی ہوتا ہے تم تنہا اپنے ہی کو طالب نہ سمجھو بلکہ تمہارا بھی کوئی طالب ہے اور اسی کے طلب کے اثر سے تمہارے اندر طلب پیدا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں   کیں بہ نسبت ہست ہم این و ہم آں

(جس کو عاشق دیکھو سمجھ لو کہ یہ محبوب بھی ہے اگر مطلوب اور محبوب نہ ہوتا تو اس کو طلب ہی نہ ہوتی)

بس اتنا فرق ہے کہ تمہارا عشق تو ایسا ہے کہ تم نے دنیا میں غل مچا دیا ڈھول پیٹ دیئے۔ کہ ہائے ہم مرے ہائے ہم چلے۔ تم نے تو ایک شور برپا کر دیا اور معشوق کا عشق

مخفی ہے وہ ڈھول نہیں پیٹتے ۔ فرماتے ہیں ؎

عشق معشوقاں نہاں است و ستیر   عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر
(معشوقوں کا عشق پوشیدہ ہوتا ہے اور عاشقوں کا عشق ڈھول کی طرح ظاہر ہوتا ہے)
لیک عشق عاشقاں تن زو کند   عشق معشوقاں خوش و فربہ کند
(لیکن عاشقوں کا عشق ان کو لاغر کرتا ہے اور معشوقوں کا عشق ان کو فربہ کرتا ہے)

تمہارے عشق کی شان تو یہ ہے کہ اس سے چہرہ زرد ہوگیا لبوں پر خشکی آگئی اضطراب اور بے چینی بڑھ گئی اور عشق محبوب کی شان عدم تغیر و عدم تاثر ہے۔ پس فربہ کند کہنا مجاز ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہاں تاثر اور تغیر نہیں ہے جیسا عاشق کو کیفیت عشق سے تاثر و تغیر ہوتا ہے جیسے گریہ و آہ و زاری و زردی رنگ و رخ وغیرہ۔ اور چونکہ عدم تاثر و عدم تغیر کے لئے عادةً مخلوق میں فربہی لازم ہے تو مولانا نے بطور کنایہ کے لازم بول کر ملزوم کا قصد کرلیا اور یہ کوئی جرم نہیں۔ قرآن و حدیث میں ایسے محاورات کا استعمال بکثرت موجود ہے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں حق تعالے بندہ سے فرمائیں گے۔ "مرضت فلم تعدنی واستطعمک فلم تطعمنی" کہ میں بیمار ہوا تو میری عیادت کو نہ آیا میں نے کھانا مانگا تو نے دیا نہیں۔ مومن عرض کرے گا "یا رب کیف اعودك وکیف اطعمك وانت رب العلمین" کہ الہی میں آپ کی عیادت کیسے کرتا اور آپ کو کھانا کیسے کھلاتا آپ تو رب العالمین ہیں اور ان تغیرات سے منزہ ہیں ارشاد ہوگا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور اس نے تجھ سے کھانا مانگا سو تو نے اس کی عیادت نہ کی نہ اُسے کھانا دیا اور اگر تو اس کو پوچھنے جاتا اور اس کی خدمت کرتا "لوجدتنی عندہ" تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا بتلائیے یہ مجاز کا استعمال ہے یا نہیں ورنہ کیا حق تعالے پر مرض کا حقیقی اطلاق صحیح ہوسکتا ہے ہرگز نہیں علی ہذا قرآن میں حق تعالے کے رؤف و رحیم اور غضب وغیرہ کا جو استعمال ہے کیا اس کو حقیقت پر حمل کیا جا سکتا ہے کبھی نہیں علماء نے خود تصریح کی ہے کہ ان صفات کا حمل حق تعالے پر غایات کے اعتبار سے ہوتا ہے

نہ کہ مبادی کے اعتبار سے ۱۲)

پھر صوفیہ ہی نے اگر مجاز کا استعمال کرلیا تو کیا قصور ہو گیا ان علماء خشک سے خدا بچائے کہ خواہ مخواہ صوفیہ پر دھڑا دھڑ کفر کے فتوے لگانے لگے۔ حالانکہ اس سے بڑھ بڑھ کر نصوص میں الفاظ موجود ہیں اور رات دن یہ خود اس میں تاویلیں کرتے ہیں پھر صوفیہ کے کلام میں تاویل کرلینے اور کنایہ ومجاز پر حمل کرنے سے ان کو کیا چیز مانع ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض صوفیہ سے دین کا ضرر بھی ہوا ہے مگر غیر محققین سے باقی محققین سے کبھی ضرر نہیں ہوا محقق ایک جگہ اگر مجاز کا استعمال کرتا ہے تو دوسری جگہ اس کی حقیقت کو واضح کردیتا ہے۔ چنانچہ یہاں تو مولانا نے عشق الٰہی کی ایک مثال بیان کردی اور دوسری جگہ ان تمثیلات سے برأت ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے بروں از وہم وقال وقیل من
خاک بر فرقِ من تمثیل من

(اے وہ ذات کہ ہمارے وہم اور قیل قال سے بالاتر ہے ہمارے تمثیلات پر خاک ہو اور ہمارے سر پر بھی یعنی جو بےمثل ذات ہے اس کی مثال کیسے ممکن ہوگی)

اس کے بعد تمثیل کا عذر بیان کرتے ہیں کہ جب یہ تمام تمثیلات ناقص ہیں تو پھر ان کو بیان کس لئے کیا جاتا ہے۔ تو فرماتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت
ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

(لیکن بندہ کو بدون تصور صبر نہیں آتا ہے اور تصور بدون مثال کے ممکن نہیں ہے پس ہر وقت اپنی جان کو پیش کرتا رہتا ہے)

یعنی بندہ کو بدون آپ کے تصور کے صبر نہیں آتا اور تصور بدون مثال کے ہو نہیں سکتا کیونکہ غائب کا تصور کسی نہ کسی صورت ہی سے ہوگا مگر وہ صورت عین حق نہ ہوگی بلکہ محض مثال ہوگی۔ آخر نماز میں جو تم حق تعالٰے کا تصور کرتے ہو تو کیا

یہ ذات کا تصور ہے ہرگز نہیں بلکہ مثال کا تصور ہے ورنہ وہ تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے جو بھی مثال خدا کی ہمارے ذہن میں آتی ہے حق تعالےٰ سب سے پاک ہیں۔ اسی لئے صوفیہ یوماً فیوماً ترقی کی وجہ سے روزانہ تصور سابق سے توبہ و استغفار کرتے جاتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مثال سابق ناقص تھی اسی کو ایک آزاد صوفی نے اس عنوان سے بیان کیا ہے جو ظاہر میں بہت وحشت ناک ہے واقعی بعضوں کا جی ہی چاہتا ہے کہ ان پر فتوے لگے مگر وہ محض عنوان ہی کے درجہ میں وحشت ناک ہے مطلب وحشت ناک نہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

بیزارم ازاں کہنہ خدائی کہ تو داری
ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(ہم ایسے جمود سے کہ تیرے تصور میں بے زار ہیں ہمارے تصور میں تو ہر روز ترقی ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ تم کو ترقی نہیں تم جمود پر ہو اور ہم حق تعالیٰ کی ہر روز ترقی باطنی کے سبب نئی نئی شان کا مشاہدہ کرتے ہیں)

ظاہر میں تو شرک معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہر دن نیا خدا ہے اور تمہارے پرانے خدا سے میں بے زار ہوں مگر مطلب یہ ہے کہ تم کو چونکہ ترقی نہیں ہوئی اس لئے ساری عمر ایک ہی مثال سے حق تعالےٰ کا تصور کرتے رہتے ہو اور مجھ کو روزانہ ترقی ہے اس لئے مجھے ہر دن نئی مثال سے تصور ہوتا ہے۔ غرض مجاز کا استعمال جس طرح قرآن و حدیث میں ہے یوں ہی صوفیہ کے کلام میں بھی ہے اس سے متوحش ہونا دلیل ناواقفیت ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے کو صرف طالب ہی نہ سمجھو بلکہ خدا تعالےٰ کو بھی تم سے محبت ضرور ہے اور اسی محبت کا یہ اثر ہے کہ تم کو طلب دیدی پھر اپنے کو محروم کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد سے مولانا رومیؒ کے اقوال سے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "من تقرب الی

ذراعاً تقربت الی باعاً" سے بلکہ یوں کہو کہ حق تعالےٰ سے کیونکہ یہ حدیث قدسی ہے جو حق تعالےٰ کا ہی ارشاد ہے قرآن میں اور حدیث قدسی میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ قرآن متلو ہے اور یہ متلو نہیں ہے۔ یہ ثابت کردیا ہے کہ طالب کبھی محروم نہیں ہوتا تو حیرت ہے کہ یہ شخص باوجودیکہ اس میں آثار محبت موجود ہیں (یعنی طلب اور قصد ۱۲) پھر اپنے کو محبت سے خالی سمجھتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو شراب پلائی گئی ہو مگر زیادہ تیز نہ ہو تو وہ یوں سمجھے کہ مجھے سوڈا پلایا گیا ہے۔ جیسے رڑکی میں اس کا عکس ہوا تھا کہ وہاں ایک مولوی صاحب گئے اور رات کو ایک مسجد میں وعظ کہا اگلے دن ایک تاجر نے ان کی دعوت کی تو یہ اس کی دوکان پر گئے اس وقت وہ تاجر سوڈے کی بوتل پینے کے واسطے کھول رہا تھا۔ پہلے پہل سوڈے کی بوتلوں کی ڈاٹ باہر کی طرف بڑے زور سے کھلتی تھی۔ تو اس کی تیزی سے مولوی صاحب یہ سمجھے کہ شراب پی رہا ہے۔ آپ نے اس کو نصیحت کی کہ ہم سے محبت کرتے ہو اور شراب پیتے ہو۔ اس نے کہا یہ شراب نہیں ہے بلکہ سوڈا ہے۔ ان کو یقین نہ آیا کہ بھلا ایسا جوش شراب کے سوا بھی کسی چیز میں ہو سکتا ہے۔ اس نے پھر یقین دلایا غرض بڑی مشکل سے ان کو یقین آیا کہ واقعی سوڈا ہی ہے۔ اب اس تاجر نے مولوی صاحب سے بھی کہا کہ ایک بوتل آپ بھی پی لیں اول تو انھوں نے انکار کیا مگر اصرار کے بعد ایک بوتل پی لی۔ تھوڑی دیر کے بعد تاجر نے یہ شرارت کی کہ بیٹھے بیٹھے جھومنے لگا۔ مولوی صاحب نے پوچھا کہ جھومتے کیوں ہو کہا یہ تو شراب تھی مجھے اس کا نشہ چڑھنے لگا ہے۔ اب تھوڑی دیر میں آپ بھی اسی طرح جھومیں گے۔ بس یہ سن کر مولوی صاحب کا تو رنگ فق ہو گیا اور کہنے لگے اللہ کے واسطے مجھے کسی کوٹھری میں بند کردو تاکہ مجھے نشہ کی حالت میں کوئی دیکھنے نہ پائے۔

لوگ کیا کہیں گے کہ رات تو یہ وعظ کہہ رہے تھے اور اب شراب، پینے لگے اور خدا کے واسطے کسی سے کہنا نہیں ویسے تو پہلے ہی شراب سمجھ کر تمہیں بھی اس سے روکتا تھا مگر تم نے دھوکہ سے مجھے پلادی تاجر نے کہا کہ اب تو جو ہونا تھا ہوچکا اب ذرا لوگ بھی تو آپ کا تماشہ دیکھیں۔ مولوی صاحب رونے لگے اور اس کی بہت خوشامد کرنے لگے تب وہ ہنس پڑا اور کہا مولوی صاحب آپ تو بہت ہی بھولے نکلے کہ ساری بوتل پینے کے بعد بھی آپ کو یہ احتمال باقی رہا کہ شاید یہ شراب ہی ہو میں تو آپ سے ہنسی کر رہا تھا آپ گھبرائیں نہیں بڑی کوشش سے ان کو اطمینان ہوا۔ تو جیسے ان مولوی صاحب نے سوڈے کی بوتل کو شراب سمجھ لیا تھا ایسے ہی بعض سالکین شراب محبت پی کر یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے سوڈا پی رکھا ہے صاحب یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم شراب کو سوڈا سمجھتے ہو محض اس لئے کہ اس میں تیزی کم ہے سو یاد رکھو کہ شرابیں مختلف ہیں کسی میں تیزی کم ہوتی ہے کسی میں زیادہ اسی لئے کسی میں التہاب ہے اور کسی میں نہیں جس میں التہاب نہیں ہوتا وہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھنے لگتا ہے۔ غرض بعض دفعہ محبت ایسی لطیف کیفیت کے ساتھ ہوتی ہے جس کا خود صاحب محبت کو بھی پتہ نہیں چلتا مگر پہچاننے والا پہچان لیتا ہے۔ سو اس حالت میں آپ کو محقق کی بات مان لینی چاہیئے۔ اسی محبت کی کمی کے تو ہم پر دو واقعے یاد آ گئے۔

ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے فرمایا کہ میں اپنے اندر حاجی صاحب کی ایسی محبت نہیں پاتا جیسے مریدوں کو شیخ سے ہوا کرتی ہے۔ تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس کا علی جواب دیا کہ اول تو اس بات کو ٹال گئے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے تھوڑی دیر میں فرمایا کہ مولانا مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماشاء اللہ آپ حاجی صاحب سے بھی بڑھے

ہوئے ہیں بس یہ سن کر مولانا گنگوہی گھبرا گئے ۔ اور فرمایا توبہ کرو توبہ کہاں میں اور کہاں حاجی صاحب رح میں تو ان کی خاک پا کے بھی برابر نہیں مجھے آپ کی اس بات سے سخت تکلیف پہنچی ۔ تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ تو یہ کہتے تھے کہ مجھے حاجی صاحبؒ سے محبت نہیں پھر اتنی توبہ استغفار اور گھبراہٹ کیوں ہے ۔ مولانا نے فرمایا جزاک اللہ واقعی تمھارے اس بات سے مجھے معلوم ہوگیا کہ بہت محبت ہے تو مولانا نے زبانی جواب نہ دیا بلکہ عملی جواب دیا کیوں اس لئے کہ ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گر است لیک عشق بے زباں روشن تر است

(اگرچہ تفسیر زبان کی روشن ہے لیکن عشق تو بے زبان ہی زیادہ عمدہ تفسیر بیان کرتا ہے)

بعض دفعہ زبانی جواب سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو بے زبان سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح ایک بار حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک رئیس نے گڑھی پختہ میں عرض کیا کہ حضرت حدیث میں آیا ہے کہ جب تک آدمی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیوی بچوں اور ماں باپ سب سے زیادہ محبت نہ ہو اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوتا تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں سے زیادہ محبت نہیں ہے بلکہ ان سے کم ہے ۔ اس لئے اندیشہ ہوتا ہے ۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ نے بھی اس کا عملی جواب دیا کہ اول حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا ۔ ان رئیس کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں مزہ آنے لگا تو درمیان میں مولانا نے فرمایا کہ آپ کے والد صاحب بھی بڑے اچھے آدمی تھے مجھے ان کی ایک حکایت یاد آگئی بس یہ سُنکر وہ رئیس کہنے لگے کہ حضرت یہ بیچ میں آپ نے کیا بات شروع کردی ۔ بھلا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد کا ذکر کیسا وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں کیجئے ۔ جواب تک کر رہے تھے ۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کو تو اپنے والد کا تذکرہ بہت ناگوار ہوا ۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

تذکرہ میں کسی کا ذکر کیونکر گوارا ہو سکتا ہے فرمایا تم تو کہتے تھے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ماں باپ سے زیادہ محبت نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں ان کے تذکرہ سے ناگواری کیوں ہوئی۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے مگر وہ ایسی رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہے کہ [illegible] موقعہ پر اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اب تو رئیس صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا مولانا واقعی آپ نے خوب سمجھایا۔ دلائل سے اس طرح سمجھ میں نہ آتا جیسا آپ نے عملاً سمجھا دیا تو حضرت واقعی بات یہی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اگر باپ ماں یا بیوی بچے نعوذ باللہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ بے ادبی اور گستاخی کا کلمہ کہہ دیں تو اس وقت دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے کہ آپ ان کو کچا کھا جائیں گے اور تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔ اگر بیوی بچوں کی محبت زیادہ ہے تو اس وقت وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ موقعہ پر معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کی محبت نہیں جبھی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں والذین آمنوا اشد حبا للہ مگر اس کا دعویٰ نہ کرنا چاہئے کہ ہم کو اللہ و رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت سب سے زیادہ ہے بس دل کو تو سمجھا لو مگر زبان سے دعویٰ نہ کرو اور نہ اتنی تواضع کرو کہ اپنے کو محبت سے خالی ہی سمجھنے لگو۔ بس یہاں تو خاموشی ہی چاہئے خود کچھ فیصلہ نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دو اور جو کچھ وہ فیصلہ کر دے اس پر مطمئن رہو ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را   عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ کہ وہ اصلی ہے یا نہیں چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ

بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب کوئی تم سے پوچھے کہ تم کو خدا سے محبت ہے یا نہیں تو سکوت کرو کچھ جواب نہ دو کیونکہ انکار تو کفر ہے اس لئے کہ اس میں تکذیب ہے حق تعالیٰ کے قول والذین آمنوا اشد حبا للہ کی، اور اقرار دعویٰ ہے اور دعوے پر

کبھی پکڑ ہو جاتی ہے اور امتحان ہونے لگتا ہے گو تحدث بالنعمہ کے طور پر محبت ظاہر کرتا ہے دعویٰ نہیں مگر بعض دفعہ تحدث بالنعمہ اور دعویٰ کی صورت ایک ہو جاتی ہے لہجہ کے ذرا سے فرق سے بات بدل جاتی اور تحدث نعمت دعویٰ بن جاتا ہے اور دعوے اس طریق میں بہت سخت چیز ہے۔ حضرت سمنون محب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ غلبہ حال میں ان کے منہ سے یہ نکل گیا ؎

فلیس لی فی سواک حظ   فکیف ماشئت فاختبرنی

(میرے لئے آپ کے سوا کسی شے میں کوئی لذت نہیں پس آپ ہمارے اس دعویٰ میں جس طرح چاہیں امتحان کر سکتے ہیں)

کہ مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہیئے مجھے آزما لیجئے بس فوراً امتحان شروع ہو گیا اور امتحان بھی ایسا سخت جس کی انسان کو برداشت مشکل ہے یعنی پیشاب بند ہو گیا۔ پیشاب بند ہونے کی ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ الامان سارے طبیب اور ڈاکٹر عاجز ہو گئے مگر کسی طرح بند نہ کھلا کیونکہ وہ تو امتحان تھا اور دعا اس لئے نہ کرتے تھے کہ محبوب روٹھے ہوئے تھے۔ بس ان کے دعوے کی حقیقت تو ظاہر کر دی پھر خود ہی رحم فرمایا اور ادھر ہی سے دعا کی اجازت ہوئی مگر اجازت بھی اس طرح نہیں ہوئی کہ ان سے کہا ہو یا بلا واسطہ ان کے پاس پیغام بھیجا ہو بلکہ اس طرح اجازت ہوئی کہ رات کے وقت ایک فرشتہ کو حق تعالیٰ نے بھیجا جس نے رات بھر حضرت سمنون کی آواز میں دعا کی ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

(بہتر یہی ہے کہ محبوبوں کے اسرار کسی دوسرے کی زبان سے عیاں ہوں)

سننے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت سمنونؒ ہی دعا کر رہے ہیں صبح کو مریدوں نے آکر عرض کیا کہ حضرت کیا رات کو آپ دعا کر رہے تھے فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہا آپ کی آواز آ رہی تھی آپ سمجھ گئے کہ اُدھر سے دعا کی اجازت ہو گئی ہے مگر اب بھی خود دعا نہیں کی کیونکہ ادھر سے اجازت بواسطہ ہوئی تھی۔ تو آپ نے

بھی بواسطہ دعا کی واقعی محبوب کے انداز بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں جن کو عشاق ہی سمجھتے ہیں۔ کسی لے خوب کہا ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمۂ نازم خرام نیست
بسیار شیوہ باست بتاں راکہ نام نیست

(ترجمہ) (خوبی اس کرشمۂ ناز وخرام کا نام نہیں ہے بہت سی ادائیں بتوں کی اور ہیں جن کا ابھی تک نام بھی لغت میں نہیں ہے ان کو صرف عاشقوں کا دل سمجھتا اور

حضرت سمنون رحؒ نے اس انداز کو سمجھ لیا کہ جب ادھر سے بواسطہ اجازت دی گئی ہے تو مجھے بھی بواسطہ دعا کرنی چاہیئے ابھی بلاواسطہ دعا کی اجازت نہیں چنانچہ آپ نے بھی فرشتوں جیسے آدمیوں کو واسطہ بنایا یعنی معصوم بچوں کو بس روز مکتب میں جاتے اور بچوں سے کہتے۔ ادعوالعمکم الکذاب اے بچو اپنے جھوٹے چچا۔ کے لئے دعا کرو۔ چچا تو اس واسطے کہ عرب میں بڑی عمر والے کو عم ہی کہا کرتے ہیں اور کذاب اس لئے کہا کہ دعویٰ نباہ نہ سکے۔ تو صاحبو! یہاں دعوے کا کام نہیں اور زیادہ تواضع بھی اچھی نہیں کہ اپنے کو محبت سے خالی کہنے لگو بس یہاں تو خاموشی ہی مناسب ہے، واقعی محبت کا راستہ بھی عجیب ہے۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں ؎

ارے یارو جسے کہتے ہیں الفت
قیامت ہے قیامت ہے قیامت

اور ایک عاشق نے عشق کی حقیقت کو خوب ہی بیان کیا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

(عاشقی کیا ہے کہدو کہ محبوب کا غلام بن جانا اور دل کو اس کے سپرد کر کے خود حیران رہنا)
بس یہاں تو یہی کرنا چاہیئے کہ دل ان کو سپرد کر کے خود حیران کھڑا رہے نہ زبان سے اقرار کرے نہ نفی کرے اس سے اگلا شعر بہت سخت ہے اہل ظاہر اس سے متوحش ہونگے مگر مجمع خاص ہے اور اس سے پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ صوفیہ مجاز اور کنایہ کا استعمال کثرت سے

کرتے ہیں تو امید ہے کہ غلط فہمی نہ ہو گی پھر میں اس کا مطلب بھی بیان کر دوں گا تو استبعاد رفع ہو جائے گا۔ کہتے ہیں ؎

سوی زلفش نظرے کردن و روئش دیدن ٭ گاہ کافر شدن و گاہ مسلماں بودن

(کبھی تو محبوب کے زلف پر نظر کرنا اور حالت قبض و غم میں مبتلا ہو جانا اور کبھی اس کے چہرے کو دیکھنا اور حالت بسط اور لذت وصال میں مسرور رہونا)

اس میں زلف سے مراد تجلیات جلالیہ ہیں اور رخ سے مراد تجلیات جمالیہ اور کفر سے مراد فنا ہے اور اسلام سے مراد بقا ہے کیونکہ کفر میں جہل بالتصدیق ہوتا ہے اور اسلام میں علم و تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح حالت فناء میں کچھ خبر نہیں رہتی تو وہ مشابہ جہل کے ہے اور بقاء میں واردات و علوم کا ادراک ہوتا ہے وہ مشابہ تصدیق اسلام کے ہے۔ غرض یہاں بولنے چالنے کا موقع نہیں ہے حیرت ہی حیرت ہے۔ بس گلا گھونٹ کر حجرہ بند کر کے بیٹھو اور ان کی طرف متوجہ رہو۔ نواب شیفتہ خوب فرماتے ہیں ؎

چہ خوش ست با تو بزمے بہ نہفتہ ساز کردن
در خانہ بند کردن درشیشہ باز کردن

(کیا اچھی حالت ہو گی کہ آپ کے بزم میں مخفی راز و نیاز کی باتیں کرنا اور گھر کا دروازہ بند کر کے شراب محبت حقیقی کا شیشہ کھولنا اور پینا)

پس سالکین کو چاہیئے کہ ہر حالت میں راضی رہیں اور زبان کو بند رکھیں نہ اپنے کو صاحب محبت کہیں نہ خالی اور محروم کہیں میں نے بتلا دیا کہ طالب محروم نہیں ہوا کرتا دیکھو کہیں تمہارے خالی کہنے پر وہ واقعی خالی ہی نہ کر دیں اور بالفرض اگر تم کو محبت ہی نہ ہو جب بھی خاموش ہی رہو جب محبت تقسیم ہو گی تو تم کو بھی مل جائیگی کیونکہ چپکا کھڑے رہنے والے پر بھی رحم آجاتا ہے دیکھو جب مٹھائی تقسیم ہوتی ہے تو بعضے بچے تو اچھلتے کودتے اور چلاتے ہیں کہ ہمیں بھی دو اور بعضے بیچارے چپکے کھڑے رہتے ہیں تو ان پر تقسیم کرنے والوں کو رحم آیا کرتا ہے کہ یہ بچہ بیچارہ کچھ نہیں بولتا خاموش کھڑا ہے اس کو ضرور دینا چاہیئے تو اس کو خاموشی کی وجہ سے

اوروں سے پہلے حصہ مل جاتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر بالفرض تم میں محبت نہ بھی ہو جب بھی دعویٰ یا نفی سے چلاؤ نہیں صورت سوال بن کر چپکے بیٹھے رہو ان شاء اللہ تم پر رحم کر کے ایک دن محبت عطا کردی جائے گی صاحبو! یہ الوان محبت ہیں کسی میں التہاب و اضطراب ہے اور یہ بھی انہیں کا رنگ ہے اور کسی میں جمود و خمود ہے یہ بھی انہیں کا رنگ ہے میں دوبارہ مولانا کا شعر یاد دلاتا ہوں ؎

عشق معشوقاں نہاں است و ستیر　　عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

(عشق معشوقوں کا پوشیدہ رہتا ہے اور عاشقوں کا عشق ڈھول کی طرح بجتا رہتا ہے)

تو صاحب خمود کو خوش ہونا چاہیئے کہ اس کو عشق محبوب کا خاص رنگ عطا ہوا ہے اور ایک حالت تردد و حیرت کی ہے اس پر بھی راضی رہنا چاہیئے یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

در تردد ہر کہ او آشفتہ است　　حق بگوش او معما گفتہ است

(جو عاشق خاموش کچھ سوچ رہا ہو تو سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معمہ (راز محبت) کہدیا ہے وہ بیچارہ اسی کو سوچتا رہتا ہے)

اس کے کان میں کوئی معما کہہ دیا ہے کہ سوچتے رہو وہ بیچارہ اسی کو سوچ رہا ہے جیسے ہم لوگ آپس میں پہلی کہا کرتے ہیں جس کو دوسرا گھنٹوں سوچتا ہے۔ ایک اور عاشق اس مضمون کو دوسرے عنوان سے کہتے ہیں ؎

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است　　بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

(پھول کے کان میں آپ نے کیا کہدیا ہے کہ وہ ہنس رہا ہے اور بلبل کے کان میں کیا راز کہدیا ہے کہ وہ ہر وقت اشکبار رہے)

تو صاحب ان کے مختلف الوان ہیں کسی کو ہنسا رکھا ہے اور کسی کو رُلا رکھا ہے بس جس کو وہ ہنساتے ہیں وہ رونے کی ہوس نہ کرے اور جس کو وہ رلاتے ہیں وہ ہنسنے کی خواہش نہ کرے جس کو جس حال میں رکھیں راضی رہے خود کچھ تجویز نہ کرو

کہ ہائے میرے اندر التہاب ہوتا اضطراب ہوتا یا صاحب التہاب یوں کہے کہ میرے اندر برود و خمود ہوتا۔ ان تجویزوں کو چھوڑو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تدبیر نہ کرو۔ تدبیر ضرور کرو۔ مگر تدبیر کے یہ معنی نہیں کہ حالت موجودہ سے راضی نہ رہو بلکہ تدبیر کے یہ معنی ہیں کہ کسی محقق سے اپنا حال کہدو پھر جو وہ کہے اسکا اتباع کرو۔ اور یہی تدبیر ہے اور جب تک حق تعالیٰ خود تم کو بصیرت نہ دے دیں اس وقت تک محقق کا اتباع کرتے رہو اس کے بعد بےفکر رہو۔ طالب کو محرومی کا وسوسہ بھی نہ لانا چاہئے۔ ان شاء اللہ طالب ضرور واصل ہوکر رہیگا ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی جلدی ہوتا ہے کوئی دیر سے کیونکہ آج اگر کسی پہلوان کی چار سیر خوراک ہے تو ایک بچہ یہ ہوس نہ کرنے لگے کہ میں بھی آج ہی سے چار سیر کھانے لگوں تو اسکا انجام یہ ہے کہ دو دن میں ختم ہوجائیگا اس لئے ہر شخص کو اتنی ہی خوراک دی جاتی ہے جس کا اس کو تحمل ہے ؎

؎ چارپا را قدر طاقت بار نہ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(جانوروں پر بقدر تحمل بوجھ لادو کمزور لوگوں کو انکی صحت کے اندازہ سے کام سپرد کرو)

؎ طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

(بچہ کو اگر دودھ کی جگہ روٹی دوگے تو بچہ کو اس روٹی سے مرا ہوا پاؤ گے)

بچہ کو تو یہی مناسب ہے کہ اس وقت دودھ ہی پیتا رہے پھر جب رفتہ رفتہ بڑا ہوگا اس دن وہ بھی اس پہلوان کی طرح سیروں ہضم کرلیگا۔ جلدی مناسب نہیں تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں خمود و جمود کی جگہ شوق و ذوق والتہاب و اضطراب کا رنگ عطا ہوجائے یہ تمہاری غلط تجویز ہے تم کو کیا خبر کہ یہ شوق و ذوق کے غلبہ میں تمہارا کیا حال ہوتا اب تو ایمان بھی سلامت ہے ممکن ہے کہ غلبہ شوق میں تمہارا ایمان بھی رخصت ہوجاتا ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تم بندگی بشرط مزدوری مت کرو کیونکہ خواجہ بندہ پروری خوب جانتے ہیں)

بس حق تعالےٰ خود ہی ہر ایک کی تربیت اس کے مناسب حال طریقہ سے فرماتے ہیں ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ صورت ہمارے لئے تجویز کی گئی ہے یہی بہتر ہے۔ شوق و ذوق بلاشک عجیب آثار ہیں لیکن بعض دفعہ خطرناک بھی ہیں اس لئے ہر ایک کے مناسب نہیں ہوئے قربان جایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

پھر قربان ہو جئے آپ کے کہ آپ نے شوق کی دعا بھی فرمائی تو کن قیود کے ساتھ فرماتے ہیں۔

"والسألك شوقا الی لقائك فی غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة یعنی میں آپ سے شوق لقا مانگتا ہوں مگر اس طرح جس میں نہ ضرا مضر ہو نہ گمراہ کن فتنہ ہو لوگ حدیثوں سے تصوف نہیں سمجھتے حالانکہ حدیث و قرآن ہی میں تصوف ہے اور کہیں نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ شوق کے لئے دو قیدیں بیان فرمائی ہیں ایک یہ کہ ضرا مضرہ نہ ہو میرے ذوق میں اس کی یہ تفسیر ہے کہ اس سے جسمانی تکالیف پیدا نہ ہوں دوسرے یہ کہ فتنہ مضلہ نہ ہو اس میں آپ نے بتلا دیا کہ شوق کا ہر درجہ مطلوب نہیں بلکہ بعض درجات خطرناک بھی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض دفعہ شوق کے غلبہ سے ایک ضرر تو جسم کا ہوتا ہے وہ یہ کہ جوشش عشق سے بدن گھلنے لگتا ہے جیسے تپ دق سے گھلتا ہے کہ حرارت اندر ہی اندر جسم کو کھا لیتی ہے۔ اور یہ دنیا کو بھی مضر ہے دین کو بھی کیونکہ ترقی مطلوب میں جسم کو بھی بڑا دخل ہے مدعیان تصوف اس کو نہیں سمجھتے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جسم میں جس قدر لاغر و ضعیف ہوگا اسی قدر روح لطیف ہوگی اور ترقی روح سے ہوتی ہے یہ غلط ہے ترقی مطلوب صرف روح سے کبھی نہیں ہو سکتی ورنہ روح تو عالم بالا میں بدون جسم کے پہلے سے موجود تھی اگر ترقی مطلوب کا مدار صرف روح پر تھا تو اس کو جسم میں مقید کر کے کیوں بھیجا گیا بس عالم ارواح ہی میں رکھا جاتا معلوم ہوا کہ ترقی مطلوب کی بعض فرد بدن ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے کیونکہ روح مجرد سے نماز کیونکر ادا ہوتی نماز تو جسم ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور اگر روح کو بقول متکلمین مادی ہی مان لیا جاوے تب بھی اس سے روزہ مثلاً کیونکر ادا ہوتا کیونکہ متکلمین بھی اس کے قائل ہیں کہ روح گو مادی ہے مگر نہایت لطیف ہے جیسے ملائکہ سو جیسے فرشتوں کو بھوک پیاس نہیں لگتی اسی طرح روح کو بھی نہیں لگتی تو روزہ کا صدور تو روح سے کبھی نہ ہو سکتا وعلیٰ ہذا بہت سے اعمال جسم پر موقوف ہیں اس لئے حفاظت جسم بھی ضروری ہے۔

اسی لئے سید العاشقین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ان لجسدك علیك حقا" اور جو محققین حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ذاکر کو دودھ گھی خوب کھانا چاہیئے اور تمام رات نہ جاگنا چاہیئے مگر آجکل

جہلا صوفیہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جسم کو مار دو تاکہ خدا جلدی مل جاوے جی ہاں ضرور ملیں گے وہ تو فرماتے ہیں لا تقتلوا انفسکم تو شوق میں ایک ضرر تو یہ ہوتا ہے کہ جسم کو امراض لگ جاتے ہیں جس سے اعمال نہیں ہو سکتے اور جب اعمال نہ ہوئے تو ترقی بھی نہ ہوگی۔ شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرض کی حالت میں زیادہ اعمال نہ بھی ہوں تو اعمال صحت کا ثواب برابر ملتا رہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی اعمال پر موقوف نہیں بدون اعمال کے بھی ہو سکتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ حدیث سے تو صرف پہلے اعمال کا ثواب ملنا معلوم ہوتا ہے اس سے ترقی قرب کہاں ثابت ہوتی ہے یہ دعویٰ آپ بدون نص کے کیسے کرتے ہیں اور کسی عمل کا ثواب مل جانا اس کو مستلزم نہیں کہ جو ترقی خود مباشرت عمل سے ہوتی وہی اب بھی ہوگی (دیکھو تین دفعہ قل ہو اللہ پڑھنے کا ثواب پورے قرآن کے برابر ہے تو کیا اس سے یہ لازم آیا کہ تین دفعہ قل ہو اللہ کہنے سے ترقی بھی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی پورے قرآن کی تلاوت سے ہوئی ہے یا صبح کی نماز کے بعد طلوع شمس تک ذکر اللہ کرنے کا ثواب حج وعمرہ کے برابر ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کو وہی قرب ہوگا جو حج وعمرہ کرنے والے کو ہوتا ہے یہ دعویٰ بلا دلیل ہے ۱۲) دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حالتِ مرض میں باوجود قلت اعمال کے ترقی بھی مثل صحت کے ہوتی ہے تو یہ بھی بدون اعمال کے نہیں بلکہ اعمال ہی کی وجہ سے ہے کیونکہ حالت صحت میں اعمال ہو چکے ہیں اسی کے ساتھ حالت مرض کو ملحق کر دیا گیا اگر ملحق بہ نہ ہوتا تو یہ الحاق کیسے ہوتا معلوم ہوا کہ اصل سبب ترقی اعمال ہی ہیں۔ دوسرا ضرر یہ ہوتا ہے کہ حالت شوق میں بعض دفعہ انسان حق تعالیٰ سے بہت کھل جاتا ہے پھر نہ معلوم کیا کیا بکنے لگتا ہے۔ جیسے بعض اہل ادلال ہوئے ہیں گو ان سے خود مواخذہ نہ ہو مگر اضلال تو ضرور ہوتا ہے کہ دوسرے اس کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی نقص ہے علاوہ ازیں بعض دفعہ غلبہ ادلال میں حد سے نکل کر خود بھی یہ شخص گمراہ ہو جاتا ہے کیونکہ کسی وقت ایسا غلبہ حال نہیں ہوتا جس میں زبان پر قابو نہ ہو مگر زبان سے بے ساختہ کچھ نکل جاتا ہے جس میں یہ اپنے کو معذور سمجھتا ہے اور . . . . واقع میں معذور نہیں ہوتا تو مواخذہ میں گرفتار ہو جاتا اور بارگاہ قرب سے نکال دیا جاتا ہے

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شوق کی طلب میں یہ دو قیدیں بڑھا دیں سبحان اللہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دو جملوں میں معانی کو کس طرح قید فرمایا ہے کہ دو لفظوں میں تمام مضرات سے پناہ مانگ لی۔ غرض غلبۂ شوق میں یہ آفات ہیں اس لئے تم اپنے لئے کچھ تجویز نہ کرو اور اگر تم کو غلبہ شوق نہ عطا ہوا ہو تو سمجھ لو کہ شاید تمھارے لئے غلبۂ شوق میں کوئی آفت ہوتی اس لئے خدا تعالیٰ نے تم کو برد و خمود میں رکھا وہی ہر حالت کی حکمتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں ؎

آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند ۔۔۔ او مصلحت تو از تو بہتر داند

(جو کہ تجھے امیر نہیں بناتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ تیری ہی مصلحت کے یہ خلاف ہے کہ تجھے مالدار بنا دیا جاوے کیونکہ تیری مصلحت کو تجھ سے وہ بہتر جانتے ہیں۔)

اور اگر کسی کو شوق کا غلبہ عطا ہوا ہو تو وہ اسی میں راضی رہے وہ جمود و خمود کو طلب نہ کرے ممکن ہے کہ اس کے واسطے یہی ضروری ہو۔ کیونکہ بعضے انجن تو ہوا سے چلتے ہیں اور بعضے انجن آگ سے چلتے ہیں ممکن ہے کہ اس کے انجن کے لئے حرارت ہی کی مناسبت ہو اگر یہ حرارت سے خالی ہو گیا تو کھڑا کا کھڑا رہ جائے گا جیسا کہ حضرت عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صنما رہ قلندر سزوار بمن نمائی ۔۔۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے محبوب راہ عشق اور طریق جذب سے ہمکو راستہ طے کرائیے کیونکہ زہد خشک کا راستہ بہت طویل نظر آتا ہے)

بہر حال محبت کا ایک رنگ التہاب ہے اور ایک رنگ خمود بھی ہے۔ بس صاحب خمود بھی اپنے کو محروم نہ سمجھے اب میں ان دونوں نسبتوں کی مثال دیتا ہوں کہ ان میں ایک تو لون چشتیہ ہے (یعنی التہاب واضطراب) اور ایک لون نقشبندیہ ہے (یعنی برود و خمود) پس اگر کوئی صاحب حرارت نہ ہو وہ گھبرائیں نہیں بلکہ یہ سمجھ لے کہ مجھے لون نقشبندیہ حاصل ہے گو وہ چشتیہ کا مرید ہو کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتیہ ہی پیدا ہوں بلکہ کبھی چشتیہ سے نقشبندی پیدا ہوتے ہیں۔ اور کبھی نقشبندیہ سے چشتی پیدا ہوتے ہیں جیسے مرغی کے نیچے بطخ کے انڈے رکھدو تو بچے بطخ ہوں گے کہ وہ تو ذرا بڑے ہو کر دریا میں تیریں گے

اور ماں کھڑی منہ تکے گی وہ دریا میں تیر نہ سکے گی اور نہ بچے اس کے پاس رہ سکیں گے۔ گو وہ کتنا ہی بلاتی رہے کیونکہ بطخ کے بچوں کو تو دریا ہی سے مناسبت ہوگی گو تربیت مرغی کے نیچے ہوئی ہو وہ اس کے بلانے سے خشکی پر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح چشتی شیخ کے سارے مرید چشتی نہیں ہوسکتے بلکہ بعضے نقشبندی ہوں گے ان کو پانی سے مناسبت ہوگی اور بعضے چشتی ہوں گے ان کو آگ سے مناسبت ہوگی ہاں کوئی قیاس فاسد کرے تو اور بات ہے۔ جیسے ایک احمق شخص نے کسی کو دیکھا تھا کہ وہ کڑی دکھا کر بھینس کو ڈیلو ڈیلو کر رہا تھا اس نے پوچھا کہ میاں تم کڑی کو کیوں دکھا رہے ہو کہا اسے دیکھ کر بھینس کنارہ پر آجائے گی۔ ایک دفعہ ان حضرت کی چارپائی ندی میں بہ گئی تو آپ دوڑ کر گھر سے پیڑھا لائے اور اسے چارپائی کو دکھا کر ڈیلو ڈیلو کرنے لگے کسی نے کہا کہ میاں یہ کیا کہا کہ یہ چارپائی کا بچہ ہے اسے دیکھ کر وہ چلی آئے گی۔ اسی طرح ایک شخص تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا تھا اس کو چڑھنا ہی آتا تھا اترنا نہ جانتا تھا جب اترا نہ گیا تو شور کرنے لگا کہ مجھے اتار دیں گرا لوگ حیران ہوئے کہ کس طرح اتاریں تو بوج بجکڑ کو بلایا اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا بس تدبیر سمجھ میں آگئی اس کے پاس ایک رسا پھینکو چنانچہ پھینکا گیا پھر اس سے کہا کہ اسے کمر میں مضبوط باندھو اس کے بعد لوگوں سے کہا کہ زور سے جھٹکا مارو وہ سُسرا نیچے گرا اور گرتے ہی مر گیا لوگوں نے بوج بجکڑ سے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا کہا افسوس ہے کہ اس کا وقت ہی آگیا تھا ورنہ ہم نے تو اس طرح کنوئیں میں سے بہت سے آدمی نکالے ہیں سو یہ تو قیاس فاسد ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ہر شخص کی طبیعت جدا ہے اور اس کے لئے طریقہ تربیت بھی الگ ہے سب کو ایک لاٹھی نہ ہانکنا چاہیئے۔ یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا کہ شاید کوئی شخص چشتیہ سے مرید ہو اور صاحب حرارت نہ ہو بلکہ صاحب سکون ہو تو وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں نہ تو نقشبندی ہو سکتا ہوں کیونکہ چشتیہ سے مرید ہوں اور نہ چشتی ہوں کیونکہ صاحب سکون ہوں تو بس میں کورا ہی ہوں۔ صاحب کورا تو نہیں ہے ہاں کور بیشک ہے کہ اس کے پاس دولت موجود ہے مگر اندھا ہے خواہ مخواہ اپنے کو محروم سمجھتا ہے تو یہ غلطی ہے کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ چشتیہ سے چشتی ہی پیدا ہوں نقشبندی نہ پیدا ہوں بلکہ یہاں ہر ایک سے دونوں

طرح کے رنگ حاصل ہوتے ہیں یہاں اب و ولد میں مناسبت ضروری نہیں جیسا کہ ابوت و بنوت ظاہریہ میں بھی مناسبت تامہ ضروری نہیں چنانچہ کالے سے گورے اور گورے سے کالے پیدا ہوتے کبھی باپ احمق ہوتا ہے اور بیٹا ذہین کبھی برعکس مگر بعضے ایسے جامد ہوتے ہیں کہ نقشبندی خاندان میں بیعت ہو کر چشتی بننا گوارا نہیں کرتے بعضے چشتی سلسلہ میں مرید ہو کر نقشبندی بننا گوارا نہیں کرتے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک نقشبندی کے مرید نے قبض کی شکایت کی حضرت نے اس کو ذکر جہر بتلایا کہنے لگا میں تو نقشبندی ہوں میں ذکر جہر کیونکر کروں فرمایا پھر مت کرو سو یہ محض جہالت ہے۔ صاحب نقشبندی اور چشتی میں حنفیہ شافعیہ کا سا اختلاف نہیں ہے جو حنفی یوں کہے کہ میں امام کے پیچھے فاتحہ کیونکر پڑھوں میرے مذہب میں تو حرام ہے۔ بلکہ ان دونوں میں ایسا اختلاف ہے جیسا اطبا اور ڈاکٹروں میں ہوتا ہے۔ اب اگر طبیب یونانی کوئی ڈاکٹری دوا بتلائے یا ڈاکٹر کوئی یونانی دوا پلائے تو کیا حرج ہے اسی طرح اگر کوئی نقشبندی ذکر جہر کو کسی کے لئے نافع بتلائے یا کوئی چشتی اپنے کسی مرید کو ذکر خفی بتلائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کوئی تقیید نہ تھی ہر شخص کے لئے اس کے مناسب تجویز فرماتے تھے کسی کو بالجہر کسی کو بالسر کسی کو تلاوتِ قرآن کسی کو تکثیر نوافل کسی کو خدمتِ خلق چنانچہ بعض کے لئے صرف اس کو نافع فرماتے تھے کہ تم اہل خانقاہ کی روٹی گوشت لا دیا کرو۔ پس مشائخ اور طالبین کو ایسا ہونا چاہیئے یہ نہیں کہ نقشبندی خاندان میں داخل ہوئے ہیں تو اب جہر کو حرام سمجھ لیں چاہے کیسی ہی ضرورت ہو یا چشتی ذکر خفی کو حرام سمجھ لیں چاہے کسی کے واسطے جہر مناسب ہو یا نہ ہو۔ مشائخ کو محقق اور مجتہد ہونا چاہیئے پس لوگوں کو مقلد بن کر رہنا چاہیئے ان کو اپنی تجویز کا دخل نہ دینا چاہیئے پس لوگوں کو تجویز کا خبط ہوتا ہے چنانچہ ایک صاحب مجھے خط میں لکھتے ہیں کہ ہم کو شغل انحد کی اجازت دیدی جائے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ اگر آپ کو اتنی بات حاصل ہے کہ خود اپنے لئے معمول تجویز کر لیں تو پھر کسی سے رجوع کی آپ کو کیا حاجت ہے۔ طب میں بڑا کام تو تشخیص ہی ہے اور تشخیص کے بعد علاج کر لینا کیا مشکل ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس شخص میں فلاں خلط کا غلبہ ہے اور وہ سبب مرض ہے جس کے لئے

مبردات ومفرحات کا استعمال مفید ہوگا تو اس کے بعد جس کا دل چاہے علاج کرے کیا یہ بھی کوئی طریقہ ہے علاج کا تشخیص تو خود کرلیں اور علاج دوسرے سے کرائیں اس طریق میں تو یہ ہونا چاہیئے کہ بس حال بیان کرکے مردہ بدست زندہ ہوجاؤ۔ اپنی تجویز اور تشخیص کو دخل مت دو۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں گزیدی پیر ہیں تسلیم شو　　ہمچو موسیٰ درطریق خضر رو

(جب مرشد کو پکڑ لیا تو اس کے سامنے رائے زنی مت کرو اس کے حکم پر عمل کرو
مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت خضر علیہ السلام کی بات پر عمل کرو)

بعض نسخوں میں غلطی سے پیرہن لکھ دیا ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جب خلافت مل جاوے تب پیر کا کہنا ماننا چاہیئے اس سے پہلے نہ مانے یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہ دو لفظ الگ الگ ہیں ؎ چوں گزیدی پیر — ہیں تسلیم شو۔

کہ جب کسی کو پیر بنالو تو اب اپنے کو بالکل سپرد کردو۔ انحد وغیرہ یا کوئی شغل خود بخود تجویز نہ کرو۔ اس مقام پر افادہ جدیدہ کی غرض سے لفظ انحد کی تحقیق بھی بیان کردینا مناسب ہے۔ بہت لوگوں کا اور پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ لفظ دو حرفوں سے مرکب ہے ان حرف نفی ہے جو ہندی لفظ ہے اور حد لفظ عربی ہے جس کے معنی ترکیبی غیر محدود ہیں اور یہ خیال تھا کہ چونکہ اس شغل میں جو صورت مسموع ہوجاتی ہے وہ غیر محدود ہے۔ اس لئے اس کو انحد کہا جاتا ہے۔ بعضے اس کو غیبی صوت سمجھتے ہیں اور ملکوتی صوت کہتے ہیں ممکن ہے کہ کسی کے لئے صوت ملکوتی بھی منکشف ہوتی ہو مگر صوت حق تو ہرگز نہیں ہے بعض جہلاء نے اس کو صوت حق سمجھا ہے یہ غلط ہے چنانچہ اس خیال کے لوگوں نے شیخ سعدیؒ کے شعر کی تفسیر اسی صورت سے کی ہے وہ شعر یہ ہے ؎

الست از ازل ہمچناں شاں بگوش　　بفریاد قالوا بلےٰ در خروش

(الست کی آواز عاشقوں کے کانوں میں ہے اور ان کا قالوا بلیٰ کہنا بھی ان کو خوب یاد ہے یعنی ان کے کانوں میں یہ آوازیں اب تک محسوس ہو رہی ہیں فراموش نہ ہوسکیں)

یہ تفسیر بالکل صحیح نہیں ہے اور اس کو صوت حق سمجھنا بالکل غلط ہے کیونکہ کلام الٰہی صوت وحروف سے

منزہ ہے شیخ فرید عطار رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے عارف اور محقق ہیں فرماتے ہیں ع قول او را لحن نے آواز نے۔ اور یہی علماء اہل سنت کا قول ہے کہ کلام الٰہی کیلئے صوت نہیں ہوئی اور شغل انحد میں صوت ہوتی ہے پس یہ صوت حق نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے در اصل یہ صوت ناسوتی ہے جو تموج ہوا سے پیدا ہوتی ہے کان بند کرنے سے اندر ہوا محبوس ہو جاتی ہے اس سے آواز پیدا ہو جاتی ہے بعض لوگوں نے اسکو صوت حوض کوثر کہا ہے اور اس کے متعلق ایک حدیث بھی بیان کرتے ہیں اول تو اس حدیث کے ثبوت کا حال معلوم نہیں (قال المحشی مع اشارۃ الواعظ قد صححہ العزیزی فی شرح الجامع الصغیر ۱۲ منہ) اور اگر حدیث ثابت بھی ہو جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ عزیزی نے اسکی تصحیح کی ہے تو وہ تشبیہ پر محمول ہے کہ حوض کوثر کی آواز اس صوت کے مشابہ ہے یہ مطلب نہیں کہ بعینہ یہی صوت حوض ہے یہ تو حقیقت صوت میں کلام تھا۔ لفظ کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں انادی ہے جو ہندی لفظ ہے بمعنی قدیم اصل میں یہ شغل جوگیوں سے لیا گیا ہے چونکہ یکسوئی پیدا کرنے میں بہت نافع ہے اس لئے بعض مشائخ نے اس کو اختیار کیا تھا اور جوگیوں کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ صوت قدیم ہے اسی لئے وہ اس کو انادی کہتے ہیں مگر وہ لوگ مشرک ہیں ان کی بات قابل قبول نہیں اور غالباً مشائخ نے اسی واسطے اس کو انادی سے انحد کر دیا تاکہ عقیدہ جوگیہ کا ابطال ہو جائے اور انحد کہنا غلط نہیں کیونکہ غیر محدود کی دو قسمیں ہیں ازلی اور ابدی سو مشائخ کی مراد انحد بمعنی ابدی ہے کہ جانب مستقبل میں یہ غیر محدود ہے۔ چنانچہ اگر عمر بھر کان بند رکھے جائیں تو یہ صوت ختم نہیں ہوتی پس یہ غیر محدود بمعنی لا تقف عند حد ہے اور ابدیت حدوث کے منافی نہیں بلکہ اس کے مناسب ضرور ہے، وہ انکی مراد نہیں خوب سمجھ لو چونکہ یہ کام کی تحقیق تھی اس لئے میں نے اس پر متنبہ کر دیا ممکن ہے بعض لوگ اس غلطی میں پڑے ہوں بہرحال طالب کو خود کوئی شغل تجویز نہ کرنا چاہئے بلکہ ہر طرح اپنے کو شیخ کے سپرد کر دے اور اس کی تجویز میں چون و چرا نہ کرے کیونکہ اس طریق کا زیادہ مدار اعتماد پر ہے بلکہ میں ایک اور بات پر متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ طالب کو شیخ کے ساتھ علمی مباحث میں بھی گفتگو نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس میں رد و قدح انکار و اقرار کی صورت ہوتی ہے جو شان طلب کے منافی ہے ہاں طالب کو استاد سے خوب چون و چرا کرنا چاہئے کیونکہ استاد اشکالات علمیہ کے حل کرنیکو پہلے سے آمادہ ہو کر بیٹھتا ہے اور شیخ اس کام کے لئے تیار ہو کر نہیں بیٹھتا وہ دوسرے کام کے لئے ہے جہاں عمل کی ضرورت ہے باتوں کی ضرورت نہیں پس شیخ کے ساتھ کان ہو کر رہنا چاہئے اور استاد کے ساتھ زبان ہو کر۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ)

ہمارے مولانا فرماتے تھے کہ ہر طالب علمے کہ چون وچرا نکند وہر درویشے کہ چون وچرا کند ہر دو را بحرا گاہ باید فرستاد ۔ پس شیخ سے استاد کا کام نہ لو سونار سے لوہار کا کام نہ لو اس کے سامنے لوہا مت لاؤ ۔ بلکہ سونا چاندی لاؤ تاکہ وہ خوبصورت جھمکے اور کرن پھول اور جھومر تیار کر کے تمہارے کان اور سر پر لگا دے پس یہ بڑی غلطی ہے کہ کسی کے پاس طالب بن کر نہ جائیں اور اس کو شیخ بنائیں پھر اس سے کام لیں ۔ دوسرے صاحبو! ماں سے ماما کا کام نہ لو گو اس میں ایک میم اور ایک الف زیادہ ہو گئے مگر عزت تو گھٹ گئی کیونکہ ماں کو ماما بنانا تا ذلت بجویز کرنا ہے ۔ لہذا شیخ سے علمی مباحث میں گفتگو نہ کرنا چاہیئے مگر آجکل طالبین اس کا خیال نہیں رکھتے ۔ ہاں گاہے گاہے ادب کے ساتھ ہو تو اس کا بھی مضائقہ نہیں یا عرصہ تک پاس رہنے سے دونوں کی طبیعت کھل گئی ہو تب بھی حرج نہیں کیونکہ انشراح کے بعد پھر ایک ناز کی سی حالت ہو جاتی ہے اور مقام ناز کے احکام جدا ہیں اس وقت جتنا چاہے بولو اور جو چاہے پوچھو کچھ مضائقہ نہیں اسی کو کہتے ہیں ؎

اے خانۂ نیاز نہ چلنے سے تو مچل یعنی مقام ناز ہے جس چال چاہے چل

مگر ایسے لوگوں کو شیخ کے ساتھ مباحث علمیہ میں گفتگو کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں ورنہ وہی مثال ہوگی جیسے ایک شخص تھا جس کی بیوی اس کی کچھ زیادہ خاطر و مدارات نہ کرتی تھی ایک دفعہ اس نے ایک ولایتی کو دیکھا جو اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا ۔ گھوڑا شوخی میں ادھر ادھر منہ مارتا تھا اور ولایتی اسکو چمکار کر کہہ رہا تھا کھاؤ بیٹا کھاؤ یہ بیوقوف سمجھا کہ شاید کھاؤ گھوڑے کی اس ہیئت کو بھی خاطر و مدارات میں کچھ دخل ہے دل میں سوچا کہ آج سے ہم بھی اسی طرح کھایا کریں گے گھر پہنچکر بیوی سے کہا کہ آج ہم گھوڑے بنیں گے ہماری اگاڑی پچھاڑی باندھو اور ایک تو بڑے میں کھانا بھر کر ہمارے منہ پر چڑھاؤ ہم ادھر ادھر منہ ماریں گے تو تم کہنا کھاؤ بیٹا کھاؤ ۔ اس غریب کے تمام احکام کی تعمیل کی یہ گھوڑے کی طرح بحالت رکوع کھڑے ہوئے اور دم کی جگہ ایک جھاڑو باندھی گئی منہ پر توبڑا چڑھایا گیا اگاڑی پچھاڑی باندھی گئی اور اب اس نے ولایتی کے گھوڑے کی طرح شوخی کرنا شروع کی اور بیوی کہتی جاتی کھاؤ بیٹا کھاؤ ۔ یہ اور اچھلے کودے پیچھے کہیں چراغ رکھا تھا اس سے جھاڑو میں آگ لگ گئی یہاں تک کہ بدن کے کپڑوں تک پہنچ گئی اب میاں تو بندھے جوڑے کھڑے تھے

وہ کیونکر آگ سے بچتے۔ بیوی بھی ان ہی کی طرح بیوقوف تھی یہ حال دیکھ کر کوٹھے پر جا چڑھی اور محلہ والوں کو پکارا ارے دوڑیو میرا گھوڑا جلا۔ محلہ والوں نے دل میں کہا کہ کمبخت کو کھانے کیلئے تو ملتا نہیں اسکے یہاں گھوڑا کہاں سے آیا معلوم ہوتا ہے کہ ویسے ہی شرارت سے چیخ رہی ہے یہ کسے خبر تھی کہ وہ شوہر کو گھوڑا کہہ رہی ہے آخر کار میاں وہیں جلکر مرنڈا ہو گئے۔ یہی حال ناقص کا ہوتا ہے جب وہ اپنے کو کامل پر قیاس کرنے لگے مولانا فرماتے ہیں۔

نازرا روئے ببایدہمچو ورد   چوں نداری گرد بدخوئی مگرد
زشت باشد روئے نازیبا و ناز   عیب باشد چشم نابینا و باز
پیش یوسف نازش و خوبی مکن   جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

۱ھ (ناز کے لئے چہرہ مثل گلاب کے پھول کے چاہیئے جب ایسا چہرہ نہ ہو تو ناز کے قریب بھی مت جاؤ۔
۲ھ بدصورت کا ناز کرنا بڑا معلوم ہوتا ہے جس طرح کہ اندھے کو اپنی آنکھ کا کھلا رکھنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔
۳ھ یوسف جیسے حسین کے سامنے کیا ناز کرتے ہو اسکے سامنے تو صرف نیاز اور آہ یعقوبی کرنی چاہیئے یعنی طالب اور مرید مرشد کے سامنے ناز نہ کرے نیاز اور تواضع سے رہے)

طالب کو شیخ کے سامنے نہایت ادب سے رہنا چاہیئے اور کسی کو اس کے سامنے بولتا ہوا دیکھ کر اپنے کو اس پر قیاس نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ ایک خاص حالت انشراح پر پہنچ چکا ہے اس کا بولنا اور بحث کرنا سب ادب میں داخل ہے اور تمہارا بولنا بے ادبی میں داخل ہوگا اور بے ادب کا اس طریق میں کچھ کام نہیں ؎

بے ادب را اندریں رہ بار نیست   جائے او بر دار شد در دار نیست

(بے ادب کے لئے اس راہ میں کچھ حصہ نہیں ہے اس کا مقام دار پر ہے نہ کہ دربار میں ہے)

یعنی بے ادب کی جگہ دار پر ہے (یعنی سولی پر) اور دار کے اندر (یعنی گھر میں) اس کے لئے جگہ نہیں۔ صاحبو بزرگوں نے جو شیوخ کے آداب لکھے ہیں وہ لغو نہیں ہیں اور ان تمام آداب کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ کا جی بُرا نہ کرو اس کے قلب کو مکدر نہ کرو ورنہ تم کو فیض بھی گدلا ہی پہونچے گا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے کہ شیخ میزاب رحمت ہے جس کے واسطے سے تمکو فیض پہنچتا ہے پس میزاب رحمت کو میلا مت کرو ورنہ فیض بھی گدلا ہو کر آئیگا۔ یہ خلاصہ ہے ان آداب کا مشائخ نے اپنی پرستش نہیں کرائی بلکہ تم کو خالص و مصفّا زلال رحمت پلانا چاہتے ہیں اور اس کا یہی طریقہ ہے کہ اس کا دل میلا نہ کرو بس ایک حق

شیخ کا یہ بھی ہے کہ طالب اپنی رائے اور تجویز کو دخل نہ دے تم یہ مت سوچو کہ میرے واسطے غلبۂ شوق مناسب تھا اور اب تک حاصل نہیں ہوا۔ یا التہاب و اضطراب کی مجھے ضرورت تھی اور یہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ بس تم تو اطلاع و اتباع سے کام رکھو جب تمھارے سر پر ایسا شفیق موجود ہے۔ جو یوں کہتا ہے ؎

من غم تو میخورم تو غم مخور ۔ بر تو من مشفق ترم از صد پدر

(جب میں تمہارا غم کھاتا ہوں پھر تم غم مت کھاؤ تمھارے اوپر میں تو سیکڑوں باپوں سے زیادہ مہربان ہوں)

پھر تم کو کسی فکر اور سوچ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو حالات سے اطلاع کر کے بے فکر رہو اور اگر شیخ پر ایسا اعتماد نہیں ہے تو یہ بدگمانی ہے اور ؎

بدگمانی کردن و حرص آوری ۔ کفر باشد پیش خوان مہتری

(بدگمانی کرنا اور حرص کرنا ایسے محسن کے سامنے سخت بے ادبی ہے یعنی مرشد سے بدگمانی محرومی ہے)

اس کا انجام بجز محرومی کے کچھ نہیں طالب کو شیخ پر اعتماد کلی رکھنا چاہیئے کہ یہ جو کچھ بتلاتا ہے اسی میں میرا نفع ہے۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ شیخ محض ہماری تسلی کے واسطے یہ کہدیتے ہیں کہ وساوس کا کچھ حرج نہیں ان پر التفات نہ کرو۔ التہاب و اضطراب نہ ہونے کا بھی مضائقہ نہیں تم کو مقصود حاصل ہے یاد رکھو یہ سراسر بدگمانی اور شیخ پر رہزنی کا الزام ہے۔ ارے شیخ کو تمہاری جھوٹی تسلی کرنے سے کیا ملتا ہے اس کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ جھوٹی باتوں سے تم کو بہلائے کیا تم سے اسکو کچھ جائداد بٹوانا رہ گئی ہے اس کی تو یہ حالت ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ۔ آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

(آئینہ کے پیچھے طوطی صفت ہوں جو کچھ میرے دل میں حق تعالیٰ الہام فرماتے ہیں میں وہی اصطلاح طالبین کے لئے کہتا ہوں) —— وہ تم کو وہی طریقہ بتلاتا ہے جو اس کے دل پر تمھارے مناسب القا ہوتا ہے وارثان انبیا کی تعلیم کی وہی شان ہے جو تعلیم انبیا کی شان ہے کہ ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود ۔ گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(اہل اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے دراصل وہ الہام حق ہوتا ہے اگرچہ وہ کلام اسکی زبان سے جاری ہوتا ہے) اتنا فرق ہے کہ انبیا وحی سے کہتے ہیں جو قطعی ہے اور اہل اللہ وارد و الہام سے کہتے ہیں جو ظنی ہے باقی اپنی طرف سے وہ کچھ نہیں کہتے ہیں۔ تم تو یہی سمجھو گو وہ کبھی اجتہاد بھی کرے اور اگر وہ اجتہاد میں

غلطی کریگا تو خود کبھی مشتبہ ہوکر اصطلاح کردے گا تم کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے یہ تو اسکی تعلیم کے متعلق گفتگو ہے جو تربیت باطن کے متعلق ہو اور اگر کوئی مسئلہ فقہی اجتہادی ہو تو اس میں بھی شیخ کی غلطی پکڑنے کا ہر طالب کو حق نہیں صرف اہل علم کو حق ہے وہ بھی ادب کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کا ان کو بھی حق نہیں اور اہل علم میں بھی ان کو حق ہے جس سے طبیعت کھلی ہوئی ہو وہ جس طرح چاہیں غلطی پکڑیں کیونکہ ایسے لوگ ادب کے حدود سے نہ نکلیں گے اس طریق میں مچلنے روٹھنے اور لڑنے جھگڑنے کی تو گنجائش ہے مگر گستاخی و بے ادبی کی گنجائش نہیں نہ اس لئے کہ شیخ کو اس کی وجہ سے اپنی کسر شان کا خیال ہوگا یا تم سے عداوت ہوجائے گی۔ ہرگز نہیں جس پر یہ اثر ہوتا ہو وہ شیخ بنانے کے قابل نہیں کیونکہ ؎

دریائے فراواں نہ شود تیرہ بسنگ عارف کہ برنجد تنک آبست ہنوز

(دریائے فراواں میں پتھر مارنے سے کوئی اثر نہیں ہوتا جو عارف مخلوق کی ایذا رسانی سے رنجیدہ اور متاثر ہوتا ہے (یعنی عقلی طور پر) وہ ابھی مبتدی ہے اس کا پانی ابھی قلیل ہے۔ البتہ طبعی اثر سے کامل بھی متاثر ہوتا ہے)

عارف تو اپنے کو سب سے بدتر سمجھتا ہے۔ وہ کسی کی بے ادبی سے برا نہیں مان سکتا بلکہ یہاں بے ادبی اور گستاخی کی اس لئے گنجائش نہیں کہ اس سے شیخ کو تمھاری طلب میں شک ہوجائیگا اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس شخص کو مجھ سے تعلق اور محبت نہیں ہے کیونکہ طلب و محبت کے لئے کچھ آثار و شرائط ہیں۔ اور بے ادبی و گستاخی ان کی اضداد ہیں اور شیخ کو طالب کے متعلق یہ خیال ہوجا تا کہ اس کو مجھ سے محبت نہیں میزاب رحمت کے تکدر کا سبب ہے اس پر وہ تم کو اپنی مجلس سے نکال کر باہر کر دیگا کہ تم کو طالبین میں داخل ہونیکا حق نہیں۔ ہاں اجنبی بنکر آؤ پھر جتنا چاہو برا بھلا کہو۔ طالب بنکر گستاخی کرنا نفاق اور دھوکہ دہی ہے۔ اور اگر تم عالم نہیں ہو تو پھر فقہی اجتہادی مسائل میں شیخ کی غلطی ہرگز نہ نکالو نہ ادب سے نہ بے ادبی سے کیونکہ مسائل اجتہادیہ میں فقہاء کا اجتہاد ہوتا ہے۔ تو ممکن ہے شیخ نے کسی دوسرے فقیہ کے اجتہاد کو راجح سمجھا ہو اس میں تم دخل دینے والے کون ہو۔ اب ختم کے قریب آگیا ہوں خلاصہ میرے بیان کا یہ ہے کہ محبت کے دو نون ہیں۔ ایک التہاب و اضطراب جو نسبت چشتیہ کا رنگ ہے اور ایک برودت و خمود جو نسبت نقشبندیہ کا رنگ ہے پس طالب کو ہر حال میں راضی اور خوش رہنا چاہیئے

اور اپنے کو کسی حال میں محبت سے خالی اور محروم نہ سمجھنا چاہیئے۔ درمیان میں اعتماد علی الشیخ کا مسئلہ اسی کی توضیح کے لئے بیان کر دیا گیا تھا۔ اب میں اول وہ آیت پڑھتا ہوں جس میں یہ مضمون منصوص ہے۔ پھر وہ آیت پڑھوں گا جو میں نے تلاوت کی ہیں جن سے استشہاد لطیف کے طور پر اس مضمون کو مناسبت ہے در اصل آج کافور زنجبیل کے متعلق ایک نکتہ میری سمجھ میں آیا جس کے لئے مجھے اپنی کتاب مسائل السلوک دیکھنے کی ضرورت پڑی جس میں آیت قرآنیہ سے مسائل تصوف کو ثابت کیا گیا ہے تو میں اس میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کافور و زنجبیل کے متعلق جو نکتہ میری سمجھ میں آیا ہے کسی صوفی نے اس پر تنبیہ کی ہے یا نہیں کیونکہ مسائل السلوک میں منقول ہے مضامین بھی بکثرت ہیں گو زیادہ اپنے ہی اقوال ہیں اور میرے قلب پر جب کوئی بات وارد ہوتی ہے تو میں یہ چاہا کرتا ہوں کہ سلف کے کلام سے اس کی تائید بھی مل جاوے تو اچھا ہے کیونکہ ہمارے علوم وہی قابل اعتبار ہیں جو علوم سلف سے موئد ہوں مگر اس وقت جلد دوم نہ ملی اور یہ مضمون اگر ہوتا تو جلد دوم ہی میں ہوتا کیونکہ یہ آیت جس میں زنجبیل و کافور کا ذکر ہے جلد دوم ہی میں آ سکتی تھی۔ جب اخیر کی جلد نہ ملی تو میں نے ویسے ہی بے ضرورت جلد اول کو دیکھا اتفاق سے شروع صفحہ پر ایک در آیت نکل آئی جس میں یہ مضمون صریح تھا اس سے مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ نص میں صریح ہونے کے بعد کسی کی تائید کی کیا ضرورت ہے اہل علم کو مضامین علمیہ میں وہ لذت آتی ہے کہ کسی چیز میں بھی نہیں آتی جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو واللہ سلطنت ہفت اقلیم اس کے سامنے گرد معلوم ہوتی ہے جبھی تو کہتے ہیں ؎

تاپدانی ہرکرایزداں بخواند ؎ از ہمہ کارِ جہاں بے کار ماند

(یقیناً جس کو حق تعالیٰ اپنا خاص بناتے ہیں تمام دنیا کے کاموں سے بیکار فرما دیتے ہیں گر ؎

نکمہ ہو اگر تو مجذوب کیا غم ؎ بڑی کارآمد یہ بیکاریاں ہیں)

اب لوگ ان سے دنیا کے خرافات میں شرکت چاہتے ہیں بھلا یہ حماقت نہیں تو کیا ہے۔ بہرحال یہ مضمون صراحۃً مل جانے سے مجھے بڑی مسرت ہوئی اور یہ میرا کمال نہیں بلکہ استدعا کرنے والوں کی کشش ہے۔ کہ ان کے افادہ کے لئے حق تعالیٰ یہ علوم عطا کر دیتے ہیں مشائخ کو غرہ نہ کرنا چاہیئے کہ ہمارے اوپر یہ علوم و واردات فائض ہو رہے ہیں۔ صاحب یہ طالبین کی کشش ہے ان کی تربیت کے لئے حق تعالیٰ یہ علوم مشائخ کو عطا فرماتے ہیں جیسے ماں کی پستان میں بچہ کی کشش سے دودھ اترتا ہے۔ اگر بچہ دودھ نہ پئے تو دو چار دن میں چھاتیاں اکڑ کر سوکھ جائیں گی اور دودھ خشک ہو جائیگا۔ اسی طرح طالبین نہ ہوں تو مشائخ پر بھی واردات بند

ہوجائیں (مگر یہ بات مشائخ کے سمجھنے کی ہے طالبین یہ اعتقاد نہ رکھیں ان کو مضر ہوگا۔ وہ شیخ ہی کا کمال سمجھیں اپنا کمال نہ سمجھیں ۱۲) بھلا اور تو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انما انا قاسم واللہ یعطی کہ میں تو صرف بانٹنے والا ہوں اور دینے والے حق تعالیٰ ہیں بس یہی اعتقاد مشائخ کو رکھنا چاہیئے کہ ہم محض واسطہ فی التقسیم ہیں ہمارا ذاتی کمال کچھ نہیں انما انا قاسم پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حج کو تشریف لے گئے تو بعض خدام بھی ساتھ ہو لئے۔ جن میں سے بعض کے پاس تو زاد راہ تھا اور بعض کے پاس کچھ نہ تھا انھوں نے آکر مولانا سے عرض کیا کہ ہمارا بھی حج کو جی چاہتا ہے مگر سامان کچھ نہیں۔ مولانا بڑے خلیق تھے فرما دیتے کہ بھائی چلے چلو جو میرا حال ہی تمہارا حال یہاں تو یہ رنگ تھا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رنگ تھا کہ ایک صاحب نے مولانا سے یہی عرض کیا کہ حضرت میرا بھی حج کو جی چاہتا ہے فرمایا کچھ سامان بھی پاس ہے۔ کہا کچھ نہیں صرف توکل پر چلتا ہوں مولانا نے فرمایا جاؤ بیٹھو بڑے توکل والے ہو بس جس وقت سب لوگ ٹکٹ لیں گے تم بابو کے سامنے توکل کا پوٹلہ رکھ دینا کہ اس میں سے ٹکٹ کے دام نکال لو۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ میں کون نبوت تھا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب میں رنگ ولایت تھا۔ اور واقعی انتظام تو مولانا گنگوہیؒ ہی کے طرز میں ہے۔ خود ہم نے ایسے توکل والوں کو دیکھا ہے کہ جہاز میں اور مکہ معظمہ جدہ پہنچکر توکل کے بجائے ان میں محض تاکل رہ جاتا ہے بس جہاں کوئی دسترخوان بچھا کر بیٹھا اور یہ متوکل صاحب اس کے سر پر سوار ہوئے کہ یا شیخ لقمۃ اتنی عربی تو جہاز ہی سے سیکھ لیتے ہیں میں نے کہا ہاں بھائی تم شیخ ہی کو لقمہ بنا لو اسے ہی کچے کو کھا جاؤ۔ راستہ میں یہ لوگ بہت تنگ کرتے ہیں اس سفر میں اول کھانا پکانا ہی موت ہے نہ معلوم کس مصیبت سے تو کھانا تیار ہوتا ہے اور جب کھانے بیٹھو تو چار طرف سے یا شیخ لقمۃ یا شیخ لقمۃ مجھے تو ان لوگوں پر بڑا غصہ آتا تھا کہ جب ان پر نہ حج فرض تھا نہ قناعت توکل میسر تھا تو یہ آئے کس لئے۔ غرض مولانا محمد قاسم صاحب کسی سے انکار نہ فرماتے تھے اس لئے ان کے ساتھ بہت سے لوگ ہو گئے۔ اب راستہ میں جہاں مولانا کو فتوحات ہوتیں اور ہدایا ملتے تو سب ساتھیوں کو بلا کر تھوڑا تھوڑا تقسیم فرما دیتے۔ کسی نے عرض کیا حضرت اپنے واسطے بھی تو کچھ رکھ لیجئے تو بے ساختہ فرمایا انما انا قاسم واللہ یعطی۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ لطیفہ ہے کہ میں تو قاسم ہوں (نام بھی قاسم ہی تھا) اور اللہ دینے والا ہے میرے پاس جو کچھ آتا ہے سب ساتھیوں ہی کی غرض سے آتا ہے۔ مولانا کے یہاں ایسے لطیفے کثرت سے رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں کچھ مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی

اور ہم نے سنا ہے کہ مولانا کی مجلس میں کھانا پینا مٹھائی بانٹنا اکثر رہا کرتا تھا۔ کوئی مجلس بہت کم اس سے خالی ہوتی تھی تو ایک دفعہ مولوی محمد فاضل صاحب پھلتی مٹھائی تقسیم کررہے تھے اخیر میں کچھ بچ گئی تو مولانا فرماتے ہیں۔ الفاضل للقاسم۔ کیا عجیب لطیف جملہ ہے جس کے چند معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بچا ہوا بانٹنے والے کا ہے دوسرے یہ کہ بچا ہوا مسمّٰی بہ قاسم ہے یعنی میرا تیسرے یہ کہ مسمّٰی بہ فاضل مسمّٰی بہ قاسم کے لئے ہیں۔ لام تخصیص کا ہے یعنی ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہے (مولوی فاضل صاحب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مخلص شاگرد تھے ۱۲) چونکہ مجلس بے تکلفی کی تھی اور مولانا نے مزاح کا موقعہ دیدیا تھا تو مولوی فاضل صاحب نے بھی لطیفہ کا جواب دیا کہا نہیں الفاضل للفاضل والقاسم محروم۔ اس کے بھی چند معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ بچا ہوا مسمّٰی فاضل کا ہے یعنی میرا اور مسمّٰی بقاسم محروم ہیں یعنی آپ۔ دوسرے یہ کہ بچا ہوا اس شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا) اور بانٹنے والا محروم ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ جب شیخ وطالب میں بے تکلفی وانشراح ہو چکا ہو تو پھر مذاق اور دل لگی اور شوخی سب کی گنجائش ہے لیکن ہر ایک اپنے کو دوسرے پر قیاس نہ کرے خیر یہ تو انما انا قاسم پر ایک لطیفہ یاد آگیا تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس مضمون کا صراحۃً مل جانا میرا کمال نہیں بلکہ استدعا کرنے والوں کی کرامت ہے۔ بہرحال اس مضمون کو حق تعالےٰ نے اس آیت میں صراحۃً بیان فرمایا ہے جو سورۂ ہود کی آیت ہے۔ ولئن اذقنا الانسان منا رحمۃ ثم نزعناها منه انه لیوس کفور ولئن اذقناه نعماء بعد ضراء مسته لیقولن ذهب السیئات عنی انه لفرح فخور الا الذین صبروا وعملوا الصالحات اولئک لهم مغفرة واجر کبیر۔ پ ۱۲ ع ۲) (ترجمہ) اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دُکھ درد رخصت ہوا (اب) وہ اترانے لگتا ہے (اور) شیخی بگھارنے لگتا ہے مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے نہیں ہوتے) ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے انسان کا ایک طبعی خاصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کی حالت یہ ہے کہ اگر ہم اس کو کسی رحمت کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے یہاں رحمت عام ہے رحمت ظاہرہ وباطنہ دونوں کو کیونکہ اس جگہ اس کو اطلاق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور دوسری جگہ تصریح فرمائی ہے کہ رحمت کی

دو قسمیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے ھوالذی اسبغ علیکم نعمۃ ظاھرۃ و باطنۃ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اپنی نعمتوں کو کامل کیا ہے ظاہری بھی اور باطنی بھی نعمت ظاہرہ کے معنی یہ ہیں کہ محسوس ہو اور باطنہ وہ ہے جو محسوس نہ ہو۔ خواہ دینی نعمت ہو یا دنیوی نعمت باطنہ دینیہ کی مثال تو شوق و ذوق وغیرہ ہے ایسے ہی انس واطمینان وغیرہ رنگ مختلف ہیں کسی نعمت کا رنگ کیفیت عشقیہ جذبیہ کے ساتھ ہے اور کسی کا سلوک و معرفت عقلیہ کے طور پر باقی نعمت ہوتے ہیں دونوں برابر ہیں اور نعمت باطنہ دنیویہ کی مثال عقل و شعور و ادراک و تمیز و ذکاوت و فطنت و علم وغیرہ ہے۔ بہرحال یہاں نعمت باطنہ سے اصطلاح تصوف تو مراد ہے نہیں مگر صوفیہ جن کو نعم باطنہ کہتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ضرور ہیں گو ان میں انحصار نہ ہو اور منا کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رحمت غیر مکتسبہ موہوبہ مراد ہے جس میں اختیار انسان کو دخل نہ ہو کیونکہ نعمت مکتسبہ اختیاریہ کے سلب پر رنج کرنے کی ممانعت نہیں نہ اس پر یہ وعید ہے مثلاً کوئی شخص نماز پڑھتا روزے رکھتا ہے پھر کسی دن یہ نعمت سلب ہو جائے کہ نماز روزہ فوت کر دے تو اس پر رنج ہونا چاہیئے اور اس رنج کرنے پر کوئی وعید نہیں ہے یہ وعید تو رحمت موہوبہ غیر مکتسبہ کے سلب پر رنج و پریشانی کرنے کے متعلق ہے چنانچہ منّا رحمۃ اس کا قرینہ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہے نہ سلباً نہ وجوداً۔ اگر کوئی نعمت موہوبہ بدون اس کے اختیار کے سلب ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ نہ قرب میں کمی ہوگی۔ اور اگر کوئی مصیبت و نعمت بدون اس کے اختیار کے پیدا ہو جائے تو اس پر بھی مواخذہ نہ ہوگا۔ نہ قرب میں کمی آئیگی بشرطیکہ اپنے اختیار کو ذرا دخل نہ دے مثلاً بُرے بُرے وسوسے از خود آنے لگیں یا کسی مخلوق سے اضطرار عشق ہو جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا اور یہ نہ کہا جائے گا کہ تم کو بے اختیار بھی وسوسے کیوں آئے اور بے اختیار ہی عشق کیوں ہوا بلکہ اگر اس میں اختیار کو دخل نہ دیا جائے تو عشق مجازی بھی رحمت ہو جاتا اور عشق حقیقی کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ غرض عدم اختیار کی صورت میں نقمت بھی نعمت ہے اور جیسے امراض جسمانی میں اجر ملتا ہے کیونکہ ان سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح امراض باطنیہ میں بھی اجر ملتا ہے اگر ان کے بڑھانے کی کوشش نہ کرے بلکہ ازالہ و امالہ کی فکر کرے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سرست ٭ عاقبت مارا بداں شہ رہبرست

(عشق مجازی پر اگر صبر کیا جائے اور ہر طرح سے تقویٰ کا اہتمام ہو تو یہ عشق حقیقی کی طرف رہبری کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ اپنے اختیار سے یہ عشق مجازی نہ اختیار کیا گیا ہو)

اور یہی مطلب مولانا جامیؒ کے اس ارشاد کا ہے ؎

منتاب از عشق رو گرچہ مجازی است کہ آں بہر حقیقت کارسازی است

(عشاق مجازی جو بدون اختیار ہو جاوے گھبراؤ مت کہ اسی سے حق تعالیٰ کی محبت اور اہل اللہ کی محبت سمجھ میں آجاویگی بشرطیکہ خلاف شرع کوئی کام نہ کرو بس صبر سے کام لو)

اگر اول الف با تا نخوانی ز قرآں حرف خواندن کے توانی

(اگر تم الف با نہ پڑھو گے تو آگے قرآن پاک کس طرح پڑھو گے)

یعنی اگر بے اختیار عشق مجازی کسی میں پیدا ہو جاوے تو اس میں گھبرائے نہیں کیونکہ اس درجہ میں وہ بھی کام کی چیز ہے۔ اگر احتیاط رکھے تو وہ عشق حقیقی کا زینہ بن جاتا ہے باقی یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عشق مجازی کو از خود لپٹالو بلکہ اگر لپٹ جائے تو اس سے کام لو چنانچہ شیخ سعدیؒ از خود لپٹالنے کی تو صاف صاف نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سوم باب عشق ست و مستی و شور نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

(تیسرا باب عشق و مستی غیر اختیاری کا ہے نہ وہ عشق جو فسق ہوتا ہے اور قصداً کسی سے کیا جاتا ہے)

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو گلستان و بوستان میں عشق مجازی کی کچھ حکایتیں لکھدی ہیں اس سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدانخواستہ شیخ بھی آجکل کے لوگوں کی طرح عشق باز اور امردوں کو گھورنے والے تھے اور وہ عشق مجازی کو مطلقاً اچھا کہتے تھے یہ بالکل غلط ہے۔ شیخ نے جہاں کہیں عشق مجازی کی مدح کی ہے یا ایسے عشاق کی حکایتیں لکھی ہیں اس سے مراد وہی عشق ہے جو از خود بلا اختیار لپٹ جائے۔ چنانچہ باب عشق کے شروع ہی میں فرماتے ہیں۔ ؏ نہ عشقے کہ بندند بر خود بزور

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

نداند صاحب دلاں دل بہ پوست وگر ابلہے داد بے مغز اوست

(اہلِ دل ہرگز کسی غیر اللہ کو دل نہیں دیتے نہایت بے وقوف اور بے مغز لوگ ہی عشق مجازی میں مبتلا ہوتے ہیں)

وہ تو ایسے شخص کو جو از خود مخلوق کو دل دے ابلہ اور بے مغز فرما رہے ہیں۔ پھر وہ اس کی مدح یا تعلیم کیونکر کر سکتے ہیں۔ بلکہ فرماتے ہیں ؎

مکن بد بہ فرزند مردم نگاہ کہ ناگاہ فرزند ندت آید تباہ

(کسی کے لڑکے کو بری نظر سے مت دیکھو ورنہ تمھارے لڑکے کو دوسرے لوگ بری نظر سے دیکھیں گے) واقعی جو شخص دوسروں کی اولاد سے برا تعلق رکھتا ہے دوسرے بھی اس کی اولاد سے ایسا ہی تعلق کرتے ہیں۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ میرا لڑکا لوگوں سے محفوظ رہے تو اس کو چاہیئے کہ دوسروں کی اولاد سے بُرا تعلق نہ رکھے۔ بہرحال شیخ امرد پرست نہ تھے جیسا کہ جاہلوں کا خیال ہے انھوں نے تو ایک جگہ ایک امرد پرست کی حکایت بطور ذم کے لکھی ہے کہ بقراط کا ایک زاہد پر گذر ہوا جو بیہوش پڑا تھا بقراط نے پوچھا کہ اسے کیا ہوا یہ کیوں پڑا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ایک حسین لڑکے کو دیکھ کر اسے نور خداوندی کا مشاہدہ ہوا تو وجد سے بیہوش ہو گیا۔ بقراط نے کہا کہ اس کو امرد ہی میں خدا کا نور نظر آیا میرے اندر نہ نظر آیا یہ جھوٹا ہے۔ محض نفس کی شرارت سے یہ اس پر عاشق ہوا ہے۔ اگر قدرت خدا کے مشاہدہ سے عاشق ہوا ہوتا تو اس کی نظر میں امرد اور ڈاڑھی والا دونوں برابر ہوتے اور گو بقراط کا قول خود کوئی حجت نہیں مگر فلسفی کے قول کی تائید محقق کوئی کر دے تو اس کو صحیح کہا جائیگا چنانچہ اس حکایت کو نقل کر کے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

محقق ہماں بیند اندر ابل ⁂ کہ در خوبرویان چین و چگل

(محقق تو اونٹ میں بھی وہی جمالِ حق دیکھتا ہے جس طرح اور مخلوق کے حسن کو آئینہ جمال جمال حقیقی سمجھتے ہیں لیکن غیر محقق عشق مجازی میں دھوکہ سے پڑ جاتا ہے اور اس طرح وہ فسق میں مبتلا ہو کر تباہی کے قعر میں گر جاتا ہے)

بہرحال مشائخ نے جس عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ وہ وہ ہے جس کا نہ حدوث اختیاری ہے نہ بقا اختیاری ہے یعنی نہ اس کو اختیار سے پیدا کیا گیا نہ اختیار سے باقی رکھا گیا ہے کہ نہ تو محبوب کے دیکھنے کو جاتا ہے نہ اس کی آواز سننے کا قصد کرتا ہے نہ سامنے آنے جانے پر قصداً نظر کرتا ہے نہ ارادہ سے اس کا خیال لاتا ہے اگر ایسا کرے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد حق تعالیٰ کا عشق اس کے قلب میں جوش زن و موج زن ہو گا اور یہ بھی نہ ہوا تو یہ شخص بڑا مجاہد ہو گا۔ مجاہد بھی واصل ہے اور ایک حدیث اس کے متعلق مشہور ہے گو صحت کا حال معلوم نہیں جس میں اس کو شہید کہا گیا ہے۔ عن عشق فکتم وعف فمات فھو شھید

(قلت قال فی الدرالمنتثرة لطرق من حدیث ابن عباس قلت اخرجه الحاکم فی تاریخ نیسابور والخطیب فی تاریخ بغداد وابن عساکر فی تاریخ دمشق واخرجه الخطیب ایضاً من حدیث عائشة بلفظ من عشق فعف ثم مات مات شھیدا واورد الدیلمی بلا اسناد عن ابی سعید العشق من غیر ریبة کفارة للذنوب ا ھ ص ۲۰۸ ـ ۱۲ جامع)

اس میں دو شرطیں بیان کی گئی ہیں ایک عفت جس کے معنی ہیں معاصی سے بچنا اور معاصی کی چند مثالیں میں نے بیان کر دی ہیں جن سے عشق سے بچنا ضروری ہے۔ دوسری کتمان یعنی عشق کو چھپانا یہ اس واسطے ضروری ہے تاکہ دوسرے کی (یعنی محبوب کی) بدنامی نہ ہو خصوصاً اگر عورت سے عشق ہو جائے تو وہاں کتمان بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لوگوں کے گمان بہت دور دور پہونچتے ہیں کہ شاید دونوں میں ملاقات ہوئی ہوگی۔ پھر اس سے عورت کی بہت بدنامی ہوتی ہے اور کسی کو بلا وجہ بدنام کرنا یا بدنامی کا سبب بننا گناہ ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جب عشق مجازی میں گھٹ گھٹ کر مرجانا شہادت ہے بوجہ تحمل مشقت شدیدہ کے تو عشق حقیقی میں گھٹ گھٹ کر مرجانا شہادت کیوں نہ ہوگا کیونکہ اس میں بھی عشق مجازی سے مشقت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ جو نسبت شوقیہ ہے یہ آگ جیسی ہے دل کو بھون کر رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

" غلام آں کلماتم کہ آتش افروزد"۔ اسی لئے نسبت چشتیہ کبھی آگ کی صورت میں مکشوف ہوتی ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجلی گر پڑی۔ ایک شخص نے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے اوپر بجلی گری۔ فرمایا مبارک ہو نسبت چشتیہ حاصل ہو گئی تو جو اس میں مرجائے وہ حریق نار کے مشابہ ہے اور نسبت سکون پانی جیسی ہے جو نہایت ٹھنڈی ہوتی ہے چنانچہ کبھی اس کا انکشاف بارش کی شکل میں ہوتا ہے کبھی دریا کی شکل میں اسی واسطے نقشبندیہ پانی کا مراقبہ بتلایا کرتے ہیں کہ یوں تصور کرے کہ گویا قلب پر عرش سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہم بحمداللہ دونوں کے یہاں گئے ہیں چشتیہ کے پاس بیٹھ کر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگ برس رہی ہے ان کی باتوں سے اور توجہ سے حرارت بڑھتی تھی اور بچپن میں مولانا رفیع الدینؒ صاحب کے حلقہ میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ نقشبندی تھے بعض دفعہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قلب پر برف رکھ دیا ہو اور یوں خیال ہوتا تھا کہ شاید فرشتوں میں بھی ایسی ہی برودت وسکون کی کیفیت ہوگی جیسی اس وقت ہمارے اندر ہے اور جس طرح آگ سے کبھی موت کی نوبت آجاتی ہے اسی طرح پانی بھی کبھی ڈبو دیتا ہے چنانچہ سکون وانس کے غلبہ سے بعض دفعہ استغراق پیدا ہو جاتا ہے جس میں انسان تدبیر بدن نہیں کر سکتا نہ کھانے کے ہوش رہتے ہیں نہ پینے کے اس کا وہی حال ہوتا ہے جو پانی میں ڈوبنے والے کا ہوتا ہے کہ گھٹ گھٹ کر جان دیتا ہے۔ غرض غلبہ ہر کیفیت کا قاتل ہے پھر یہ لوگ شہید کیوں نہ

ہوں گے ضرور ہوں گے تو اب سالک کو کسی حال میں پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ خواہ غلبۂ شوق ہو یا غلبۂ انس ہو ہر حال میں راضی رہے ایک دن وصول ضرور میسر ہوگا اور نہ بھی ہوا اور یوں ہی طلب میں گھٹ گھٹ کر مرگیا۔ خدا کے راستہ میں اگر جان بھی جائے تو کیا ہوا پھر اس وقت یہ شہید ہوگا اور شہید بھی واصل ہوتا ہے اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ نسبت چشتیہ آگ کے مشابہ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ چشتیہ میں برودت نہیں ہوتی یا نقشبندیہ میں حرارت نہیں ہوتی بلکہ دونوں نسبتیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں جیسے جسم میں حرارت و برودت دونوں ساتھ ساتھ مجتمع ہوتی ہیں۔ البتہ غلبہ ایک کو ہوتا ہے چشتیہ میں حرارت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور نقشبندیہ میں برودت کا دوا سے شراب پی رکھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شراب میں پانی کا جز بھی ہوتا ہے ہے لیکن چشتیہ کی شراب میں تو سنکھیا ملا ہوا ہے جس سے حرارت بڑھ جاتی ہے اور نقشبندیہ کی شراب میں افیون ملا ہوا ہے جس سے برودت کا اثر غالب ہوگیا عارف فرماتے ہیں ؎

ازاں افیوں کہ ساقی می درافگند　　حریفاں را نہ سرماند نہ دستار

معلوم ہوتا ہے کہ شراب میں افیون ملانے کا رواج تھا تو نقشبندیہ کی شراب ایسی ہے اور ظاہر ہے کہ افیون کے مل جانے سے گو عارض برودت کا غلبہ ہوگیا مگر شراب کی حرارت بالکلیہ زائل نہیں ہوگی اور یہ فرق بھی دونوں نسبتوں میں ابتداء اور توسط میں نظر آتا ہے اور انتہا میں تو اہل شوق بھی اہل انس ہوجاتے ہیں یعنی چشتیہ بھی نقشبندی بن جاتے ہیں جیسے ہنڈیا ابتدا میں کھد کھد کرتی ہے اور پکنے کے بعد خاموش ہوجاتی ہے۔ پس اخیر میں چشتیہ کی حالت بھی سکون کی ہوجاتی ہے مگر حرارت زائل نہیں ہوتی بلکہ قوت ضبط بڑھ جاتی ہے پہلے اوپر بھی اثر تھا اب اندر ہی اندر کام کرتی ہے چنانچہ ایک بار حضرت جنید رحمۃ اللہ کی مجلس میں کسی نے کوئی شعر پڑھا جس پر بہت لوگوں کو وجد ہوا مگر حضرت جنیدؒ ویسے ہی سکون کے ساتھ بیٹھے رہے کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو وجد نہیں ہوا تو فرمایا۔ وتری الجبال تحسبہا جامدۃ وھی تمر مر السحاب۔ یعنی قیامت میں تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کروگے کہ وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چلتے ہوں گے مطلب یہ تھا کہ حرکت تو ہم کو بھی ہورہی ہے مگر دوسروں کو نظر نہیں آتی ہماری حرکت پہاڑ کی سی حرکت ہے۔ پھر فرمایا کہ ذرا میرے بدن کو ہاتھ تو لگاؤ بس ہاتھ لگانا تھا کہ خون کا فوارہ جسم سے نکل پڑا معلوم ہوا کہ آپ پر بھی وجد کا اثر بہت سخت ہوا تھا مگر ؎

کسی کے دل میں رہی اور کسی کے پار گئی

غرض جب حدیث میں عشق مجازی پر صبر کرنے والے کو شہادت کی بشارت دی گئی ہے تو عشق حقیقی کی تکالیف پر صبر کرنا شہادت کیوں نہ ہوگا۔ خصوصاً جبکہ کلفت باطنی کلفت ظاہری سے اشد ہے۔ ایک محقق فرماتے ہیں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(اے شخص تیرے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہ چبھا تو کیا جانے اس شیروں کو جو تلواروں کی بلا کو سر پر کھاتے ہیں)

اور شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

خوشا وقت شوریدگان غمش　　اگر تلخ بینند و گر مرہمش

(کیا اچھا وقت ہوتا ہے کہ محبوب حقیقی کے غم سے شوریدہ حال ہیں اگر ناموافق حالات ہوتے ہیں تب بھی خوش ہیں اور اگر موافق حالات ہیں تب بھی خوش ہیں)

گدایان از بادشاہی نفور　　بامیدش اندر گدائی صبور

(اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کو دیکھو کہ بادشاہت سے نفرت کئے ہوئے اور حق تعالیٰ کی رضا کی امید میں بحالت گدائی صابر ہیں)

دمادم شراب الم درکشند　　وگر تلخ بینند دم درکشند

(ہر وقت دنیا کے رنج و غم کھاتے ہیں اور ان تلخیوں کے باوجود صبر و شکر سے رہتے ہیں)

ان کے قلب پر واللہ ہر دم آرے چلتے ہیں اور دم بخود رہتے ہیں یہ تو نقشبندیہ کا حال ہے آگے فرماتے ہیں ؎

سماع اے برادر بگویم کہ چیست　　چو طاقت نماند بدانم کہ کیست

(سماع اے بھائی بتاؤں کہ کیا چیز ہے مگر سماع سننے والوں کو میں جانتا ہوں کہ کون ہیں)

آگے فرماتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں برند　　چو طاقت نماند گریباں درند

(حالت تسلیم سے سر در گریباں ہوتے ہیں اور جب تسلیم کی طاقت نہیں ہوتی تو گریبان پھاڑ ڈالتے ہیں)

یہ چشتیہ کا حال ہے کہ اول تو وہ بھی ضبط سے کام لیتے ہیں جب طاقت ضبط نہیں رہتی تو ہاتھ پیر مارتے ہیں اور اگر یہ حدیث صحیح بھی نہ ہو تو وہ حدیث تو صحیح ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء امت کی فہرست بیان فرمائی ہے کیونکہ امت میں شہداء بہت ہیں۔ صرف مقتول ہی شہید نہیں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

المطعون شہید والمبطون شہید والغریق شہید والحریق شہید اور ایک .. روایت میں ہے ومن مات بھدم الدار ومن ماتت بجمع ۔ او کما قال ای فی النفاس او الحمل ۔ یعنی جو طاعون میں مرے وہ بھی شہید اور جو پیٹ کی بیماری میں مرے جیسے ہیضہ وغیرہ وہ بھی شہید اور جو پانی میں ڈوب جائے وہ بھی شہید اور جو آگ میں جل جائے وہ بھی شہید اور جس پر مکان گر پڑے اور دب کر مر جائے وہ بھی شہید جو عورت بچہ کی وجہ سے مر جائے وہ بھی شہید اور جو آگ میں جل جائے وہ بھی شہید ہے ۔ ان کے علاوہ اور بھی شہدا ہیں اور میرے نزدیک سب میں علت مشترکہ یہ ہے کہ کسی ایسی مشقت کا ورود ہو جس کا تحمل عادۃً دشوار ہو چنانچہ جتنی نظیریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں ان سب میں ایسی مشقت ہے جس کا تحمل دشوار ہے ۔ طاعون میں ایک آگ سی بدن میں لگ جاتی ہے ہیضہ میں بھی سخت کرب و بے چینی ہوتی ہے ڈوبنے والا اور مکان سے دب کر مرنے والا گھٹ گھٹ کر جان دیتا ہے وعلی ہذا اور میں بتلا چکا ہوں کہ نسبت چشتیہ نار کے مشابہ ہے اور نسبت نقشبندیہ پانی کے مشابہ ہے اور شوق کی آگ اور انس کی برودت ظاہری آگ پانی سے اشد ہیں تو یہ بھی حریق و غریق کے مشابہ ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ مقتول بالسیف کے مشابہ ہیں کیونکہ مقتول بالسیف کے شہید ہونے کی بھی تو یہی علت ہے کہ اس نے ایسی مشقت کا تحمل کیا ہے جس کا تحمل عادۃً دشوار ہے اور اس علت کا قرینہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے علاوہ اور بہت سوں کو شہید فرمایا ہے معلوم ہوا کہ مقتول کی شہادت کسی علت سے معلل ہے اور چونکہ وہ علت ان نظائر میں بھی موجود تھی اس لئے ان کو بھی مقتول کے ساتھ ملحق کر دیا گیا اور میں بتلا چکا ہوں کہ ان سب میں علت مشترکہ بھی ہے یعنی ورود مشقۃ شدیدۃٍ یتعذر تحملہا عادۃً اور جب حکم معلل ہے تو جہاں یہ علت پائی جائے وہاں حکم کا قیاساً ثابت کر دینا غلط نہ ہوگا اور عشق حقیقی میں مشاق و آلام قتل بالسیف سے زیادہ ہیں مقتول بالسیف تو ایک دفعہ جان دے چکا تلوار چل گئی قصہ ختم ہوا اور یہاں یہ حال ہے کہ ؎ کشتگان خنجر تسلیم را ؛ ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست + جن پر کیفیات باطنیہ طاری ہوتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان پر کیا گذرتی ہے واقعی وہ تو نہ معلوم کتنی مرتبہ جیتے اور مرتے ہیں ۔ ایک عارف فرماتے ہیں انتم تخافون المعاصی ونحن نخاف الکفر ۔ ظاہری تکالیف میں تو جان ہی کا خطرہ ہے اور باطنی تکالیف میں ایمان کا خطرہ ہے اور خطرہ

اور یہ خطرہ سب سے اشد ہے۔ حضرت شبلیؒ نے ایک دفعہ کسی سالک سے پوچھا ای الصبر اشد کہ بتلاؤ سب سے زیادہ سخت کونسا صبر ہے مر قال الصبر باللہ قال لا قال الصبر مع اللہ قال لا یعنی اس نے کہا صبر باللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ کہا صبر مع اللہ بہت سخت ہے فرمایا نہیں۔ قال فای الصبر اشد اس نے کہا پھر آپ بتلائیں کہ کونسا صبر اشد ہے فرمایا الصبر عن اللہ خدا سے صبر کر لینا زیادہ سخت ہے اور یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور بیہوش ہوگئے۔ ہائے (اسوقت مجمع کی عجیب حالت تھی اور حضرت مولانا پر بہت مجمع جلال تھا ۱۲ جامع) اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

۱ ای کہ صبرت نیست از فرزند و زن صبر کے داری ز رب ذوالمنن
۲ ای کہ صبرت نیست از دنیای دوں صبر چوں داری ز نعم الماہدوں

(۱ اے شخص تجھے فرزند و زن سے صبر نہ آیا مگر پھر کس طرح تو حق تعالیٰ جیسے محسن سے صبر کئے بیٹھا ہے۔
۲ تجھ کو صبر دنیائے دوں سے نہیں ہے لیکن حق تعالیٰ سے کس طرح سے صبر آگیا ہے)

واقعی خدا سے صبر نہیں ہوسکتا اور سب سے ہوسکتا ہے اور سالک کو ہر وقت اس کا خطرہ رہتا ہے کہ کہیں یہ حالت پیدا نہ ہوجائے اس کو اپنی طلب پر ہمیشہ بدگمانی رہتی ہے کہ میرے اندر طلب ہے بھی یا نہیں اور اس غم میں نہ معلوم کتنی دفعہ ہلاک ہوتا اور جیتا ہے میں دوبارہ وہ شعر پڑھتا ہوں ؎

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(اے شخص تجھے تو کانٹا بھی پیر میں نہ چبھا پھر تجھے اس شہر کا حال کیا معلوم ہوسکتا ہے جو سر پر تلواروں کے واروں کا تحمل کرتے ہیں۔)

اے صاحب جس راستے پر وہ چل رہے ہیں واللہ وہ تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہے۔ ان کی جان پر جو بنتی ہے اس کی کسی کو کیا خبر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مشائخ بڑے مزہ میں ہیں لوگ ان کے ہاتھ چومتے ہیں تعظیم و تکریم کرتے ہیں ہدایا و تحائف لاتے ہیں بس یہ سب سے زیادہ بیفکر ہیں ارے تم کو ان کے دل کی کیا خبر کہ خدا تعالیٰ کے کیا کیا معاملات ان کے ساتھ پیش آتے ہیں اور کیسے کیسے خطرات ان پر گذرتے رہتے ہیں بھلا جس کے سر پر تلوار کھڑی ہو اس کو کسی کی تعظیم و تکریم یا ہاتھ پیر چومنے سے کچھ لطف آسکتا ہے یہ محض بدگمانی ہے۔ اولیاء اللہ کے ساتھ تو جب ان کی یہ حالت ہے تو کیا مقتول سیف اور حریق و غریق تو شہید ہوں اور یہ لوگ شہید نہ ہوں یہ بھی ضرور مقتول فی سبیل اللہ کی طرح شہید ہیں اور یہ میں قرآن کی تفسیر نہیں کرتا کہ لاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء میں اولیاء بھی داخل ہیں بلکہ علم اعتبار و قیاس کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بھی انہیں کے حکم میں

ہیں اور یہ کوئی تنہا میری رائے نہیں بلکہ قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے بھی تفسیر مظہری میں شہداء کے ذکر کے ساتھ فرمایا ہے اذا کان ھٰذا حال المقتول بسیف الکفار فکیف بقتیل سیف الجبار۔ کہ جب مقتول سیف کفار کی یہ فضیلت ہے تو جو سیف جبار سے مقتول ہوا ہو اور تلوار عشق کا کشتہ بنا ہو اسکی تو کیا کچھ فضیلت ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ میں اس مسئلہ میں متفرد نہیں ہوں۔ بل لی فیہ سلف سلف میں بھی بعض کی یہی رائے ہے پس طالب کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ان شاء اللہ وہ ہر حال میں واصل ہے یا شہید ہے خواہ نسبت شوقیہ ہو یا نسبت انسیہ ہو ایک صورت میں وہ حریق ہے اور دوسری صورت میں غریق ہے اور دونوں کیلئے بشارت شہادت ہے۔

(یہاں پہونچکر پھر حضرت مولانا نے کاتب سے ماقبل کا ربط دریافت فرمایا کہ یہ مضمون کس بات پر بیان ہوا تھا اس نے عرض کیا کہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہوا تھا کہ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہوتا فرمایا کہ ۱۲ جامع)

ہیں یہ کہہ رہا تھا کہ مواخذہ کا مدار اختیار پر ہے اور بے اختیار کے تو اگر زحمت بھی پیش آئے تو وہ رحمت ہے جیسے عشق مجازی اور وساوس اور خمود وغیرہ تو امور غیر اختیاریہ سے انسان کو پریشان نہ ہونا چاہیئے مگر انسان کی عادت یہ ہے کہ یہ رحمت موہوبہ غیر مکتسبہ کے سلب سے بھی پریشان ہوتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے انہ لیئوس کفور کہ ناامید ہوجاتا اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ چنانچہ کسی میں التہاب و اضطراب کی کیفیت نہ ہو تو وہ اپنے کو محبت سے خالی و محروم سمجھ کر وصول سے ناامید ہوجاتا ہے حالانکہ یہ کیفیات غیر اختیاریہ ہیں ان کے ہونے نہ ہونے پر کچھ بھی مدار نہیں پھر یہ شخص ناامیدی کے ساتھ ناشکری بھی کرتا ہے کہ جن افعال اختیاریہ کی حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دے رکھی ہے ان کی قدر نہیں کرتا اور ان کو اپنے لئے قرب و اصول کا کافی ذریعہ نہیں سمجھتا۔ ایک عادت تو انسان کی یہ ہے دوسری عادت یہ ہے ولئن اذقناہ نعماء بعد ضراء مسۃ لیقولن ذھب السیئات عنی کہ اگر پریشانی کے بعد حق تعالےٰ اس کو راحت دیدیں تو بے فکر ہوکر کہتا ہے کہ بس اب تو مجھ سے مصیبت ٹل گئی اور یہ شکر کے طور پر نہیں کہتا بلکہ اس طرح کہتا ہے انہ لفرح فخور یعنی خوش ہوکر اتراتا ہے کہ اب تو بلا ٹل گئی بس اب کیا ہے کام مار لیا۔ چنانچہ بعض لوگ مقدمہ دائر ہونیکی حالت میں تو متفکر و پریشان رہتے ہیں حق تعالیٰ سے دعائیں کرتے اور بزرگوں سے وظیفے پوچھتے پھرتے ہیں۔ اور جہاں مقدمہ جیت گئے تو اس کو خدا کی نعمت نہیں سمجھتے بلکہ اترا کر کہتے ہیں کہ صاحب ہمارے گواہ بڑے پکے تھے حاکم بڑا سمجھدار تھا اور ہمارے وکیل نے خوب بحث کی تھی یوں کہا اور یوں جواب دیا تھا۔ اس وقت ان لوگوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

جیت کو اپنی سعی و کوشش کا نتیجہ سمجھتے ہیں قبول دعا اور رحمت حق کا نتیجہ نہیں سمجھتے ارے تم کیسا وکیل لئے پھرتے ہو کہیں دوبارہ کیل نہ لگ جائے۔ خدا تعالےٰ کو پھر تمھارا ویسا ہی حال کر دینا کیا مشکل ہے۔ مگر انسان کا خاصہ ہے کہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا اور آئندہ کے لئے بالکل بےفکر ہوجاتا ہے حق تعالےٰ فرماتے ہیں ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لیتبتغوا من فضلہ ؕ انہ کان بکم رحیماہ واذا مستکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ فلما نجکم الی البر اعرضتم ؕ وکان الانسان کفوراہ تمھارا پروردگار وہ ہے جو تمھارے (فائدہ کے) لئے کشتیوں کو سمندر میں چلاتا ہے تو اس وقت خدا کے سوا تمھارے سب معبود (ذہن) سے غائب ہوجاتے ہیں (اور کسی تدبیر پر نظر نہیں رہتی اللہ ہی اللہ یاد رہتا ہے) پھر جب تم کو خشکی کی طرف بچا لے آتے ہیں تو اعراض کرنے لگتے ہیں اور (واقعی) انسان ہے بڑا ناشکرا (کہ اتنی جلدی پہلی حالت کو بھول جاتا ہے) آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ تم کو یہ بےفکری کیوں ہوگئی۔ افامنتم ان یخسف بکم جانب البر او یرسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوا لکم وکیلا۔ کیا تم کو کوئی اس سے بھی اطمینان ہوگیا کہ شاید خدا تعالےٰ خشکی ہی میں دھنسا دیں سخت ہوا بھیجدیں پھر تم کو کوئی بھی کارساز نہ ملے چنانچہ ابھی زلزلہ اور طوفان خشکی ہی میں آگیا تھا کانگڑا میں بعض مکان زمین کے اندر دھنس گئے اور بہت آدمی تباہ ہوگئے۔ جاپان میں ایسا سخت زلزلہ آیا تھا کہ لاکھوں آدمی مرگئے اور کروڑوں کا نقصان ہوا۔ یہ تو خسف ہی کا نمونہ ہے اور سخت ہوا کا بھی نمونہ آچکا ہے چنانچہ پچھلے دنوں اخبار میں یہ بات آئی تھی کہ ہردوئی میں ایسی سخت ہوا چلی جس سے بعضے آدمی اڑ گئے اور کہیں سے کہیں جاکر گرے اور وہ تو خشکی میں بھی طوفان بھیج سکتے ہیں چنانچہ ابھی پہاڑوں سے چشمے اُبل پڑے تھے جن سے سخت طوفان برپا ہوا ہزاروں گانوں تباہ اور ہزاروں آدمی برباد ہوگئے اور مویشیوں کا نقصان الگ رہا۔ آگے بڑے مزے کی بات فرماتے ہیں کہ کیا تم کو اس سے بھی اطمینان ہوگیا کہ شاید حق تعالیٰ پھر دریا ہی میں تم کو بھیجدیں کوئی ایسی ضرورت آپڑے جس سے دوبارہ دریا ہی کا سفر کرنا پڑے جس کو ایک دفعہ چکھ چکے ہوام امنتم ان یعیدکم فیہ تارۃ اخری فیرسل علیکم قاصفا من الریح فیغرقکم بما کفرتم ثم لا تجدوا لکم علینا بہ تبیعا۔ یہ تو ظاہری مصائب سے بےفکری کا جواب ہے اور باطنی خطرات سے بےفکری کا جواب بھی یہی ہے کہ اگر کسی شخص کو آج کیفیت شوقیہ حاصل نہ تھی پھر حاصل ہوگئی تو وہ بےفکر کس بات پر ہوتا ہے۔ ارے جس خدا نے تم کو پہلے جمود و خمود کے دریا میں ڈال رکھا تھا

وہ پھر اسی دریا میں لوٹا سکتا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہ دوسری سخت گھاٹیاں تمہارے رستہ میں پیدا کر سکتا ہے کیونکہ جس طرح ظاہر میں دریا اور پہاڑ ہیں دلدل ہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

آسماں ہاست در ولایت جاں — کار فرمائے آسماں جہاں
(روح کی سلطنت میں بہت سے آسمان ہیں اور آسمان جہان کا کار فرما یعنی حق تعالیٰ کا خاص نور بھی ہے)
در رہ روح پست و بالا ہاست — کوہہائے بلند و صحرا ہاست
(روح کے راستے میں بہت بلندیاں اور پستیاں ہیں بلند بلند پہاڑ اور صحرا ہیں)

اور فرماتے ہیں ؎

غیب را ابرے و بادے دیگر است — آسمانے آفتابے دیگر است
(عالم غیب کے لئے ابر اور باد دوسرے ہیں اور آسمان اور آفتاب وہاں کے دوسرے ہیں)

مگر وہ دریا پانی کے نہیں ہیں نہ پہاڑ پتھر کے ہیں اور حزب البحر میں جو بحر الدنیا وبحر الآخرۃ کہا ہے وہ تشبیہ پر محمول ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا ہی بحر ہے جیسا کہ دنیا کا غرض باطن میں بھی جبال وبحار ہیں جن کو صوفیہ کبھی آیت قرآنیہ کے تحت میں بھی اشارۃً بیان کر دیتے ہیں مگر تفسیراً نہیں بلکہ اعتباراً۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جن چیزوں کا خطرہ حق تعالیٰ نے اس جگہ اہل ظاہر کے لئے بیان فرمایا ہے باطن میں بھی تشبیہاً یہ خطرات موجود ہیں پھر بے فکری کیسی غرض حالات غیر اختیاریہ کے سبب سے پریشانی بھی مذموم اور ان کے حصول سے بیفکری بھی مذموم ہے۔ اسی کی حق تعالیٰ نے یہاں شکایت فرمائی ہے کہ انسان ایک حالت میں تو یؤس کفور بن جاتا ہے اور ایک حالت میں فرح فخور اور دیکھئے ان دونوں میں مقابلہ کیا اچھا ہے ہر حالت کے متعلق ایک صفت باطنی ہے ایک ظاہری ہے۔ سلب رحمت کے وقت تو یاس باطن میں ہوتا ہے اور کفر ظاہر میں اور عطائے نعمت کے وقت فرح باطن میں ہوتا ہے اور فخر ظاہر میں پس دونوں میں عجیب مقابلہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ یہ حالت سب کی نہیں بعضے اس سے مستثنیٰ بھی ہیں الا الذین صبروا وعملوا الصالحات مگر وہ لوگ جو صابر یہاں صبر کے معنی وہ نہیں ہیں جو عوام میں مشہور ہیں کہ کسی کے مرنے پر نہ روئے کیونکہ یہاں کون مرا تھا ہاں کیفیات مر گئی تھیں تو خیر یہ بھی اس کے عموم میں داخل سہی مگر نہ رونے ہی میں صبر کا انحصار نہیں ہے

بلکہ صبر سے مراد استقلال ہے یعنی ان معمولات پر جما رہنا جو شارع اور نائب شارع نے تجویز کر دیئے ہیں ان پر ہر حالت میں پابندی کرنا چاہیئے چاہے کوئی کیفیت حاصل ہو یا حاصل نہ ہو نہ کسی کیفیت کے سلب سے پریشان ہو کر معمولات میں خلل ڈالو۔ نہ کسی کیفیت کے سلب سے پریشان ہو کر معمولات میں خلل ڈالو۔ نہ کسی کیفیت کے حصول سے بیفکر ہو کر معمولات میں کمی کرو یہ معنی ہیں صبر کے آگے صبر کی علامت بیان کرتے ہیں کیونکہ دعوی صبر آسان نہیں کہ جس کا جی چاہے اپنے کو صابر کہنے لگے ؎

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھوے   ولکن لایخفٰی کلام المنافق

(اور محبت کا دعویٰ تو عشق میں جائز ہے مگر منافق کا کلام اور دعویٰ پوشیدہ نہیں رہتا)

بلکہ اس کے لئے کچھ علامات وشرائط ہیں یعنی وعملوا الصالحات کہ اعمال صالحہ بجالاتے رہیں اور ظاہراً و باطناً معاصی سے بچتے رہیں جن میں یاس و ناشکری اور بطر و فخر بھی داخل ہے اور نماز روزہ بھی داخل ہے پس جو شخص اوراد پر اکتفا کر کے طاعات کو بیکار سمجھنے لگے اور یہ دعوے کرے کہ اب مجھ کو نماز روزہ کی زیادہ ضرورت نہیں رہی مجھ کو رسوخ نسبت حاصل ہو گیا ہے وہ جھوٹا ہے اس کو رسوخ وغیرہ کچھ حاصل نہیں ورنہ اعمال صالحہ میں کوتاہی نہ کرتا اسی طرح جو شخص طاعات واجبہ پر اکتفا کر کے اذکار و اشغال و معمولات زائدہ کو ترک کر دے کہ ان سے کچھ نفع تو ہوتا ہی نہیں وہ بھی غیر مستقل اور ناقص فی المحبۃ ہے صبر کے معنی یہ ہیں کہ معمولات مستحبہ اور طاعات واجبہ سب کو دواماً ادا کرتا رہے۔ بعض دفعہ آدمی اوراد سے گھبراتا ہے اور دوسرے نیک کاموں میں اس کا دل لگتا ہے اس وقت اوراد کو ہرگز ترک نہ کرے کیونکہ دوسری طاعات کا شوق جو پیدا ہوا ہے وہ بھی ان ہی اوراد کی برکت ہے اور اگر اوراد کو ترک کر دوگے تو چند روز میں دوسری طاعات کا بھی شوق نہ رہے گا جو پیدا ہوا ہے۔ میں نے ان اہل[عہ] علم کو لکھا تھا کہ تم جو اوراد سے گھبراتے ہو اور لکھتے ہو کہ مجھے مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ ورد ہی کا اثر ہو کہ آپ کو مطالعہ کتب میں مزہ آتا ہے یہ جواب بطریق منع ہے مگر محض الزامی جواب نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان طاعات میں باہم علاقہ بھی ہے کہ ایک طاعت سے دوسری کو قوت ہوتی ہے گو تم کو اسکی

[عہ] جن کا ذکر شروع وعظ میں ہوا ہے انھوں نے اوراد کو جنم روگ بتلایا تھا ۱۲ جامع

خبر نہ ہو ذاکرین اس کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس دن معمول پورا ہو جاتا ہے اس دن ہر کام میں طبیعت کو بشاشت اور نشاط ہوتا ہے اور جس دل معمول ناغہ ہو جاتا ہے اس دن کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اور کاموں میں جو نشاط ہوتا تھا وہ ورد کی برکت تھی مگر غلطی سے وہ شخص یوں سمجھتا ہے کہ مجھے اور کاموں سے خود دلچسپی ہے۔ جی ہاں ذرا اوراد کو چھوڑ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ اور کاموں سے کتنی دلچسپی ہے۔ بس یاد رکھو کہ ان اوراد ہی کی برکت سے نماز میں جی لگتا ہے انہی کے ذریعہ سے تلاوت قرآن میں مزہ آتا ہے وغیرہ وغیرہ اور اس کا امتحان یہ ہے کہ دو ایسے شخصوں کی حالت کا اندازہ کر کے دیکھو جن میں سے ایک صاحبِ ورد ہو اور ایک صاحب ورد نہ ہو تو آپ صاحبِ ورد کو فرائض وواجبات کے ادا میں چست پائیں گے گو خود ورد میں اس کا دل نہ لگتا ہو۔ اور غیر صاحبِ ورد کو اس کی برابر چست نہ پائیں گے تو کیا ورد کا یہ تھوڑا نفع ہے کہ اس کی برکت سے فرائض وواجبات میں چستی پیدا ہو جاتی ہے۔ بس یہ اوراد بیکار نہیں ہیں۔ بڑے کام کی چیزیں ہیں جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستحبات وسنن کی ترغیب دی ہے بلکہ اگر احادیث کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض وواجبات سے زیادہ سنن ومستحبات کی ترغیب وبیان فضائل کا اہتمام فرمایا ہے کیونکہ واجبات کو تو لوگ خود ہی کرتے ہیں ان کے لئے زیادہ ترغیب کی ضرورت نہ تھی اور سنن ومستحبات کا لوگ خود اہتمام نہیں کرتے اور ہیں ضروری بھی اور مفید اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا ۱۲ جامع) اور اسی واسطے مشائخ نے بھی مستحبات کا بہت اہتمام فرمایا ہے۔ چنانچہ اہلِ طریق کا ارشاد ہے من لا ورد لہ لا وارد لہ جس شخص کا کوئی ورد نہ ہو اس پر کوئی وارد بھی نہ ہوگا اور یہ ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں حقیقت میں صاحبِ واردات وہی لوگ ہیں جو اوراد کے پابند ہیں اور جو لوگ سوائے فرائض وواجبات کے کچھ نہیں کرتے ان پر واردات نہیں ہوتے (الا قلیل ۱۲) بس خوب سمجھ لو کہ جس طرح فرائض وواجبات کی ضرورت ہے ایسے ہی اوراد کی بھی ضرورت ہے گو دونوں کا درجہ برابر نہیں بلکہ فرائض وواجبات اصل اور اوراد ان کی فرع ہیں مگر اصل کا نفع ان فرع ہی کے ساتھ کامل ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آپ مسہل لیتا

چاہیں تو اس کے لئے طبیب آپ کو ایک نسخہ لکھ کر دیتا ہے یہ تو اصل مسہل ہے لیکن اس کے بعد وہ یہ بھی کہدیتا ہے کہ دو چار گھنٹے کے بعد مدد کے لئے سونف کا عرق بھی نیم گرم پینا یا یخ جلا پا یا کوئی گولی کھالینا تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدد بیکار ہے ہرگز نہیں مدد کی بھی بہت ضرورت ہے ورنہ مسہل میں ضرور کسر رہیگی اسی طرح یہاں سمجھو کہ اوراد و نوافل فرائض کے لئے بمنزلہ مدد کے ہیں اس کا نفع اس کے ساتھ مل کر ہی کامل ہوتا ہے پس ان کی پابندی بھی بہت ضروری ہے اور یہی معنی ہیں صبر کے کہ آدمی اپنے معمولات پر مستقل رہے جو شخص ہر حالت میں اپنے معمولات پر جما رہیگا اور اعمال شرعیہ کا پابند رہیگا وہ کسی نعمت موہوبہ غیر اختیاریہ کے سلب سے یاس و کفران میں اور کسی نعمت موہوبہ کے عطا سے فرح و فخر میں مبتلا نہ ہوگا کیونکہ اس کی نظر میں اعمال مکتسبہ اختیاریہ مقصود بالذات ہوں گے اور اعمال موہوبہ غیر اختیاریہ مقصود بالذات نہ ہوں گے اور جو احوال موہوبہ کو مقصود بالذات سمجھتا ہے وہ ان کے حصول پر اعمال و معمولات میں اکثر کمی کر دیتا ہے اور سلب احوال پر یاس و کفران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آگے فرماتے ہیں اولئک لھم مغفرۃ و اجر کبیر اس میں اول مغفرت کو مقدم فرمایا اس کا مزہ عشاق سے پوچھو غیر عشاق کو اس کی زیادہ قدر نہ ہوگی وہ تو یہ سمجھیں گے کہ بس صبر اور اعمال صالحہ کا صلہ کیا ملا کہ گناہ بخشدیئے گئے نہ جنت کا ذکر ہے نہ حور و قصور کا مگر عشاق کے دل سے اس کی قدر پوچھو کہ وہ اس کو سنتے ہی زندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو طلب رضا ہی میں مرتے ہیں اور جنت کی طلب بھی وہ رضا ہی کے لئے کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

با تو دوزخ جنت است اے دلربا　　　بے تو جنت دوزخ ست اے جانفزا

(آپ کے ساتھ دوزخ جنت ہے اور آپ کی جدائی سے جنت بھی دوزخ ہے)

اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اول یہ فرمایا گیا ہے لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر اہل ظاہر کو ماقبل سے اس کا ربط سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اوپر فرمایا ہے انا فتحنا لک فتحا مبینا ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے اور نمایاں کامیابی دی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخشدیں تو اہل ظاہر یہاں چکراتے ہیں کہ بشارت فتح سے مغفرت کا کیا جوڑ ہے مگر عشاق نے اس کا ربط سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اصل میں تو فتح کے مضمون پر اتمام نعمت اور ہدایت واستقامت و نصرت و غلبہ کو متفرع کرنا مقصود تھا مگر چونکہ ان چیزوں کا مزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی

وقت آسکتا تھا جبکہ پہلے یہ تسلی کر دی جائے کہ حق تعالیٰ آپ سے راضی بھی ہیں اس لئے ان بشارات کی لذت کامل کرنے کے لئے پہلے لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر فرمایا گیا اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذاق عشق غالب تھا آپ کو سب سے پہلے اسکی فکر رہتی تھی کہ محبوب راضی بھی ہے یا نہیں اس لئے اول اس کا اطمینان دلاکر پھر دوسری بشارتوں کو بیان کیا گیا ہے: ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطا مستقیما وینصرک اللہ نصرا عزیزا کہ اس فتح سے آپ پر نعمت کا کام تمام کرنا مقصود ہے اور آپ کو صراط مستقیم پر پہونچانا اور نصرت الٰہی کے ساتھ (مخالفین پر) پورا غلبہ دینا منظور ہے (یہ فتح بطور استدراج وغیرہ کے نہیں اور نہ یہ غلبہ عارضی ہے بلکہ کامل و مکمل ہے جس کے بعد مغلوبیت کا احتمال ہی نہیں۔ وقد کان کما قال فان الاسلام لم یزل فی العروج والظھور بعد ذلک الفتح ۱۲ جامع) اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ نے عشاق کی رعایت سے مغفرت کی بشارت کو مقدم فرمایا جب ادھر سے اطمینان ہوا اور معلوم ہو گیا کہ محبوب راضی ہیں تو اب عاشق کو بھوک لگی۔ اس سے پہلے تو کسی چیز کی بھی طلب و خواہش نہ تھی اب جنت و حور وغیرہ کی طلب ہوئی کہ حضرت ہمیں کچھ اور بھی ملیگا کیونکہ کریموں کا قاعدہ ہے کہ جس سے راضی ہوتے ہیں اس کو اپنی رضامندی کی کچھ نشانی بھی دیا کرتے ہیں جیسے خلعت وغیرہ تو ارشاد ہوتا ہے واجر کبیرہ اور ان کے لئے مغفرت کے ساتھ بڑا اجر بھی ہے (یہاں بھی عشاق کے مذاق کی رعایت ہے۔ اجر کی تفصیل نہیں کی کہ کیا ملے گا یہیں یہ فرمایا کہ بڑا اجر دیں گے اور جس چیز کو محبوب بڑا کہدے پھر اس کی بڑائی کی کیا انتہا ہے معلوم ہو گیا کہ وہ انعام ملیگا جو ہمارے وہم و گمان سے بھی باہر ہے ۱۲ جامع) یہ تو مضمون مقصود کا بیان تھا اب میں آیات متلوہ سے اس مضمون کی لطیف مناسبت بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ یہاں حق تعالیٰ نے اہل جنت کے لئے دو چیزوں کا ذکر فرمایا ہے ایک یشربون من کاس کان مزاجھا کافورا اور آگے فرمایا ہے یسقون فیھا کاسا کان مزاجھا زنجبیلا۔ یعنی ایک جگہ تو فرماتے ہیں کہ جنت میں نیک بندے ایسی شراب کے جام پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ان کو ایسا جام شراب پلایا جائیگا جسمیں زنجبیل کی آمیزش ہوگی (دوسری کی ۱۲) اسکے متعلق میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ یہ اختلاف مزاج باعتبار اختلاف احوال کے ہے اس کی تفصیل کے لئے اول دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ آخرت میں جزا کو عمل سے مناسبت ہوگی۔

دوسرے یہ کہ نعمائے جنت صورت اعمال ہیں اور یہ دونوں مقدمے سلف کے اقوال سے مؤید ہیں بلکہ اشارۃً احادیث سے بھی ان کا پتہ چلتا ہے اول اہل کشف کے اقوال سے تو اس میں بہت صریح ہیں مگر بعض علماء ظاہر نے بھی اس کو بیان کیا ہے چنانچہ ھٰذا الذی رزقنا من قبل کی تفسیر میں مفسرین نے چند اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک یہ کہ نعمائے جنت صورۃً نعمائے دنیا کے مشابہ ہوں گے ان کو دیکھ کر جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہم نے اس سے پہلے دنیا میں کھائی تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ ثمرات جنت باہم مشابہ ہوں گے۔ اس لئے ایک بار کسی چیز کو کھا کر پھر دوبارہ جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو صورۃً پہلے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے کہیں گے کہ یہ تو ابھی کھائی تھی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ نعمتیں اعمال کی صورت ہونگی جن کو دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ آہا یہ تو وہی نماز ہے جس کی ہم کو دنیا میں توفیق ہوئی تھی اور وہ مناسبت ایسی ظاہر ہو گی جس کی صاحب عمل فوراً سمجھ جائے گا اور گو اس تفسیر کو علماء ظاہر نے زیادہ قبول نہیں کیا مگر اس کی تغلیط بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان الجنة قیعان وغراسها سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت تسبیح وتحمید وغیرہ ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کے درخت ان کلمات کی صورت ہیں اسی طرح بعض نصوص قرآنیہ میں ہے۔ ذوقوا ما کنتم تعملون کہ چکھو ان چیزوں کو جو تم کرتے تھے اگر اس میں تاویل نہ کی جائے تو ظاہر نص ان لوگوں کی تائید کرتا ہے جو جزاء کو صورت اعمال کہتے ہیں باقی یہ مقدمات اقناعیہ ہیں۔ میں ان کی بناء پر دعویٰ نہیں کرتا اور نہ آیات کی تفسیر کرتا ہوں بلکہ ایک لطیف استشہاد علم اعتبار کے طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنت میں جو شراب ملے گی اس میں کافور کی آمیزش ہوگی جیسا کہ دنیا میں بعض لوگ شراب میں سرور وکیف بڑھانے کے لئے کوئی مفرح چیز ملا لیا کرتے ہیں جیسا کہ صاحب معلقہ کہتا ہے ؎

لہ الا ھبی بصحنك فاصبحینا — ولا تبقی خمور الاندرینا
لہ مشعشعة کان الحص فیها — اذا ما الماء خالطها سخینا

ترجمہ شعر لہ (اے محبوب اپنے پیالے سے ہمیں صبح کی شراب پلا اندرین کی شرابیں ہم سے بچا کر نہ رکھنا۔ ٹہ وہ شراب ایسی تیز ہو جو گلے میں اٹکنے والی ہو جب پانی اس سے ملے تو اور تیز ہو)

آیت میں مزاجہا کے معنیٰ آمیزش کے ہیں۔ مزاج طبی مراد نہیں۔ اللہ بچائے واعظین سے نہ معلوم وہ اس جگہ مزاج کے معنےٰ میں کیا گڑ بڑ کرتے ہوں گے آگے کافور کی تفسیر ہے عینا یشرب بہا عباد اللہ۔ اس میں عینا کافور سے بدل ہے یعنی وہ کافور ایک چشمہ کا نام ہے دنیا کی طرح کافور کی پڑیہ نہ ہوگی۔ یہاں تو کافور منجمد ہوتا ہے اور وہاں سیال ہوگا اور زنجبیل کا بھی وہاں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے وہ بھی کوئی منجمد چیز نہیں ہے بلکہ سیال ہے۔ اور قلیل مقدار میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک چشمہ ہوگا جیسے جنت میں دودھ کی نہریں ہوں گی۔ اس پر دیانند نے ایک بیہودہ اعتراض کیا تھا کہ وہاں اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جن کے دودھ سے نہریں چل پڑیں گی سبحان اللہ یہ عقل ہے۔ دوسرے ادیان کے مقتداؤں کی گویا ان کے نزدیک بدون تھن کے دودھ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ تھن میں دودھ کہاں سے آتا ہے کیا اس کے واسطے بھی کوئی دوسرا تھن ہوتا ہے اگر یہ ہے تو پھر تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ پھر یہ مشاہدہ کے بھی تو خلاف ہے۔ بھلا تھن کے لئے دوسرا تھن کہاں ہوتا ہے۔ لہذا ضرور کہنا پڑے گا کہ تھن میں بدون کسی تھن کے دودھ آگیا معلوم ہوا کہ دودھ کا پیدا ہونا تھن پر موقوف نہیں تو جس خدا نے یہاں خون اور گوبر میں سے ایسا لطیف دودھ نکال دیا کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ نہر میں دودھ پیدا کر دے۔ لہذا یہ اعتراض محض بے عقلی کا ہے۔ ع

تو مشو منکر کہ حق بس قادر ست

(تو منکر مت ہو کہ حق تعالیٰ بہت ہی صاحب قدرۃ ہیں)

افسوس کہ دوسرے ادیان والوں کو خدا تعالیٰ کی قدرت کا بھی علم نہیں جبھی تو ان کے مقتدا ایسی بے سروپا باتیں کہتے ہیں غرض کافور ایک چشمہ کا نام ہے

جس کی حقیقت وہ نہیں ہے جو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں بلکہ وہ نہایت عجیب و غریب شے ہے لیکن دنیا کی تمام چیزوں میں سے اس کو کافور سے زیادہ مشابہت ہے ایسے ہی زنجبیل کی بھی حقیقت وہ نہیں جو ہم لوگ سمجھتے ہیں لیکن اس کو بھی تمام اشیاء میں زنجبیل دنیا سے زیادہ مناسبت ہے اس کا ضرور قائل ہونا پڑے گا کیونکہ یہ قرب اوصاف ہی سبب ہوا ہے اسے کافور یا زنجبیل کہنے کا ورنہ کچھ اور کہا جاتا لیکن فی الجملہ مناسبت ہونے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کے خواص اور مزہ وغیرہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا دنیا کے کافور و زنجبیل کا ہوتا ہے بلکہ خواص اور مزہ اس کا علیحدہ ہے جو نہایت لذیذ و خوشگوار ہوگا۔ آگے فرماتے ہیں یشرب بھا عباد اللہ کہ اس چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے۔ یہاں عباد اللہ سے یا تو ابرار ہی مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اضافت تخصیص کے لئے ہے یعنی اصل میں تو وہ خاص مقربین کے لئے ہوگا مگر ابرار کو بھی ان کے طفیل میں مل جائے گا۔ آگے فرماتے ہیں،

یفجرونھا تفجیرا یہ عجیب تماشہ ہے یعنی وہ چشمہ اپنی طبیعت سے نہ بہے گا۔ بلکہ نیک بندوں کا تابع ہوگا ان کے اشارہ پر چلے گا۔ جہاں چاہیں لیجائیں گے اگر کہیں اونچے پر بیٹھے ہوں گے اور چشمہ کو وہاں بلائیں گے تو فوراً اوپر پہنچ جائے گا کیونکہ جنت اور جنت کی ہر چیز ذی حیاۃ ہے۔ اہل کشف نے وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان کی یہی تفسیر کی ہے جس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ترغیب و ترہیب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما خلق اللہ جنۃ عدن خلق فیھا الا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر قال لھا تکلمی فقالت قد افلح المومنون رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط باسناد بن احمد ہما جید۔

نیز اہل کشف نے فرمایا ہے کہ جہنم بھی ذی حیاۃ ہے وہ کوئی بے جان نہیں ہے بلکہ جاندار اژدہے کی شکل میں ہے اور اتنا بڑا ہے کہ اس میں آسمان و

زمین سب آسکتے ہیں جیسے سمندر میں بعض مچھلیاں جہازوں سے بھی بڑی ہیں اور اس قول کی تائید ان احوال سے ہوتی ہے جو جہنم کے متعلق احادیث میں وارد ہیں۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے میدان میں جہنم کو اس طرح لایا جائے گا کہ اس کے ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوئے ہوں گے۔ مگر اس پر بھی وہ قابو سے باہر ہو گی اور چیختی چلاتی آئے گی۔ سو بھلا بے جان چیز کے لئے بھی کہیں باگیں ہوتی ہیں اور وہ بھی کہیں چیخا چلایا کرتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں جہنم اور جنت کا کلام کرنا بھی وارد ہے۔ اہل کشف کی اس تحقیق کے بعد ان احادیث میں تاویل کی کچھ حاجت نہیں رہتی۔ نیز قرآن مجید میں نار کو ھل امتلأت کا خطاب اور اس کا ھل من مزید سے جواب مذکور ہے۔ نیز احادیث میں ہے کہ جو شخص جنت طلب کرتا ہے جنت اس کو طلب کرتی ہے اور جو شخص جہنم سے پناہ مانگتا ہے جہنم اس سے پناہ مانگتی ہے اور صاحبو جن چیزوں کو ہم یہاں بے جان سمجھتے ہیں وہ بھی تو خدا تعالیٰ کے سامنے ذی حیات ہیں گو ہمارے سامنے جماد ہیں۔ چنانچہ قرآن میں وارد ہے قلنا یا نار کونی بردا و سلاما علیٰ ابراھیم۔ اور ہم نے کہا کہ اے آگ تو ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا ذریعہ بن جا۔ اہل لطائف نے لکھا ہے کہ اگر سلاماً نہ فرمایا جاتا تو آگ اتنی ٹھنڈی ہو جاتی کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس کی برودت سے تکلیف پہنچتی اب سلاماً کی قید کے بعد اتنی ہی ٹھنڈی ہوئی جو ناگوار نہ ہو۔ سو اس میں حق تعالیٰ کا آگ کو خطاب کرنا مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ خطاب ذی حیات کو ہوا کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

آب و باد و خاک و آتش بندہ اند
نامن و تو مردہ با حق زندہ اند

(پانی و ہوا خاک اور آگ سب بندے ہیں ہمارے ساتھ تو وہ مردہ
معلوم ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق زندہ کا ہے)

اسی طرح آسمان وزمین وجبال وغیرہ سے حق تعالےٰ کا خطاب فرمانا نص میں مذکور ہے نیز ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے علاوہ اور بھی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن سے عناصر کا ذی حیات ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین نے اصحاب الاخدود کے قصہ میں لکھا ہے کہ ایک یہودی بادشاہ نے مسلمانوں کو مرتد ہونے پر مجبور کیا جب لوگوں نے اس سے انکار کیا تو ظالم نے بہت سی خندقیں کھودیں اور ان میں آگ جلائی اور مسلمانوں کو مجبور کیا یا تو آگ کو سجدہ کرو ورنہ تم کو اسی میں ڈالدیا جائے گا۔ چنانچہ بہتوں نے انکار کیا اور ان کو آگ میں ڈالدیا گیا منجملہ ان کے ایک عورت بھی تھی جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا اس کو بھی کفر پر مجبور کیا گیا جب اس نے انکار کیا تو بچہ کو گود میں سے چھین کر آگ میں ڈالدیا گیا۔ اللہ اللہ کیسے پکے مسلمان تھے کہ ایسے سخت امتحانات میں بھی ثابت قدم رہے۔ پھر مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی بڑی پختہ تھیں۔ ایک آجکل کے مسلمان ہیں جو ذرا سی تنگی اور افلاس سے پریشان ہو کر مرتد ہونے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ بس یوں کہئے کہ ان کے دل میں اول ہی سے ایمان نہیں تھا ورنہ ایمان جب دل میں پیوستہ ہوجاتا ہے پھر نہیں نکل سکتا۔ غرض جب بچہ کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت ماں کو ذرا گھبراہٹ ہوئی اور اس کے قدم ڈگمگانے لگے اس وقت حق تعالےٰ نے اس کی امداد فرمائی کہ بچے کو بولنے کی طاقت دیدی اور اس نے اندر سے ماں کو پکارا؎

اندر آمادر کہ من اینجا خوشم   گرچہ درصورت میان آتشم

(اندر آجا اے میری ماں کہ میں یہاں خوش ہوں اگرچہ بظاہر آگ میں ہوں)

اندر آ اسرار ابراہیم بیں   کو در آتش یافت وردو یاسمیں

(اندر آجا اے میری ماں اور اسرار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشاہدہ کرلے کہ انھوں نے نمرود کی آگ میں گلاب اور چنبیلی کی بہار پائی تھی)

کہ اے ماں تو بھی اندر آجا اور ذرا اندر آکر دیکھ یہاں تو عجیب وغریب باغ اور پھول پھلواریاں ہیں یہ سنکر عورت بھی از خود آگ میں کود پڑی۔ اب کیا تھا یا تو

مسلمان آگ سے ڈر رہے تھے۔ یا پروانہ وار سب کے سب دمادم کودنے لگے اب یہ حال ہوا کہ سپاہی ان کو روکتے تھے اور وہ زور کر کے خود آگ میں گرتے تھے یہ حالت دیکھ کر بہت سے کافر بھی مسلمان ہو گئے اور کلمہ پڑھ کر آگ میں گرنے لگے۔ اس پر وہ یہودی جھلا اٹھا اور آگ سے کہنے لگا اے آگ تجھے کیا ہوا تو جلاتی کیوں نہیں۔ کیا تو آگ نہیں رہی کچھ اور بن گئی۔ اس وقت آگ نے جواب دیا ؎

گفت آتش من ہمانم آتشم
اندر آ تو تا بہ بینی تابشم

(اس آگ نے کہا کہ میں تو وہی آگ ہوں تو آ کے تو دیکھ کہ میں کس قدر گرم ہوں)

کہا میں تو وہی آگ ہوں ذرا تو اندر آ پھر میری تپش کو دیکھ باقی ان کے واسطے میں آگ نہیں رہی کیونکہ ان کو جلانے کا مجھے حکم نہیں ہے اس کے بعد آگ پھیلی اور جتنے کفار خندقوں کے کنارہ بیٹھے ہوئے تھے بادشاہ سمیت سب جل بھن کر خاک ہو گئے۔ پس جمادات دنیا میں بھی حق تعالے کے سامنے ذی حیاۃ ہی ہیں گو ہم کو جماد نظر آتے ہیں اور آخرت میں ہم کو بھی ہر چیز ذی حیات معلوم ہو گی۔ اسی لئے جنت کے چشمے اور نہریں مسلمانوں کے اشاروں پر چلیں گے جب یہ معلوم ہو گیا کہ نعمائے جنت صورت اعمال ہیں اور جزا کو عمل سے مناسبت ہو گی۔ تو اب سمجھئے کہ وہاں جو مسلمانوں کو شراب ملے گی وہ کس چیز کے مناسب اور مشابہ ہے یعنی وہ کونسا عمل ہے جس کی صورت عالم آخرت میں شراب ہے۔ تو اہل لطائف نے لکھا ہے کہ یہ محبت کی صورت ہے۔ محبت میں بھی ایک تیزی اور سرور اور کیفیت و مستی ہوتی ہے شراب میں بھی یہی صفات ہیں تو وہ اس کی صورت ہے۔ مگر اس شراب کو دنیا کی شراب پر قیاس نہ کرنا یہاں کی شراب تو ذی شرور ہے جس سے بیہودہ افعال و اقوال صادر ہوتے ہیں اور ہوش وحواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں کی شراب طہور ہے کہ خود بھی پاکیزہ اور پینے والوں کو بھی پاکیزہ بنانے والی ہے

نہ اس سے درد سر اور چکر ہوگا نہ عقل زائل ہوگی لا یصدعون عنہا ولا ینزفون مگر اس سے یہ مت سمجھنا کہ وہ شراب سراب محض ہوگی جیسے پانی پی لیا ہرگز نہیں بلکہ اس سے سرور ونشاط اس درجہ حاصل ہوگا جو یہاں کی شراب سے نہیں ہوسکتا منافع خمر سب اس میں علی وجہ الکمال ہوں گے۔ مگر مضار ونقصانات بالکل نہ ہوں گے تو وہاں شین کے ساتھ ساتھ سین بھی ہوگا یہ نہیں کہ شین کے بجائے سین ہو یہ دنیا ہی کی ترکیب ہے جس میں شین اور سین آگے پیچھے ہیں یکجا نہیں ہیں۔ وہاں دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے یہاں کی شراب تو یصد عن السبیل اللہ ہے اور وہاں کی شراب یصد عن غیر اللہ ہے۔ بہرحال اہل لطائف نے اس پر تو تنبیہ کی ہے کہ شراب آخرت صورت محبت ہے لیکن اس پر کسی نے تنبیہ نہیں کی کہ اس کے لئے مزاج ایک جگہ کافور بتلایا گیا ہے اور ایک جگہ زنجبیل تو یہ مزاج کس چیز کی صورت ہے اور اس کو کس سے مناسبت ہے اس کے متعلق میرے قلب پر یہ لطیفہ وارد ہوا ہے کہ یہ محبت کی انہی دونوں نسبتوں کا لون ہے کافور کو نسبت انس سے مشابہت ہے اور شراب کافور آمیز اُس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ کافور بارد المزاج ہے اور زنجبیل کو نسبت شوق سے مشابہت ہے اور شراب زنجبیل آمیز اس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ زنجبیل حار المزاج ہے اور شوق میں حرارت والتہاب ہوتا ہے لہذا یہ اس کے مناسب ہے جیساکہ نسبت انس میں برود وخمود وسکون ہوتا ہے اور کافور اس کے مناسب ہے پس نقشبندیہ کو وہاں شراب کافور ملے گی اور چشتیہ کو شراب زنجبیل (یعنی ان کو زیادہ وہ اور ان کو زیادہ یہ ملے گی کیونکہ حرارت، وسکون سے دونوں خالی نہیں ہاں ایک پر ایک کا غلبہ ہے سو اس کا مقتضا یہی ہے کہ دونوں کو دونوں شرابیں دی جائیں گی۔ مگر کثرت، وقلت کا فرق ہوگا ۱۲ جامع) اور دیکھئے جیسے یہاں نسبت سکون اور نسبت عشق کے آثار مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی دونوں کے ساتھ مختلف معاملہ ہوگا۔ چونکہ نسبت سکون میں غلبہ صحو کو ہوتا ہے اور اس میں اختیار و

ارادہ فنا نہیں ہوتا تو ان کے واسطے فرمایا گیا ہے یشربون من کاس کہ وہ خود جام شراب پئیں گے اور نسبت عشق میں اختیار و ارادہ باقی نہیں رہتا تو ان کے متعلق ارشاد ہے ویسقون فیھا کاسا کان مزاجھا زنجبیلا کہ یہ وہاں بھی خود نہیں پئیں گے بلکہ دوسرے ہی لاکر ان کو پلائیں گے کہ وہاں بھی مستی ہی میں رہیں گے یشربون اور یسقون میں جو فرق ہے وہ اہل ذوق پر مخفی نہیں ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے اس کو تفسیر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اعتبار کے طور پر اہل لطافت کے مناسب یہ لطیفہ بیان کر دیا ہے کہ کافور و زنجبیل کو ان دونوں نسبتوں کے رنگ سے مناسبت ہے اور جیسے کافور و زنجبیل جنت میں شراب کے ساتھ ملائے جائیں گے جس سے شراب کا اصل اور ان کا فرع ہونا ظاہر ہو رہا ہے اسی طرح یہاں بھی سمجھئے کہ نسبت انس اور نسبت عشق کے آثار میں جو اختلاف ہے کہ ایک میں غلبۂ حرارت ہے اور ایک میں برد یہ مقصود نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود محبت ہے جو دونوں میں مشترک ہے پس صاحب سکون کو عدم التہاب سے پریشان نہ ہونا چاہیئے اور نہ اپنے کو محبت سے خالی اور محروم سمجھنا چاہیئے بلکہ یوں سمجھئے کہ شراب محبت مجھے بھی حاصل ہے۔ مگر اس میں کافور ملا ہوا ہے جس کی وجہ سے حرارت کا غلبہ نہیں ہوتا پر اس کا حرج ہی کیا ہے تم بھی اللہ تعالےٰ کے مقربین میں داخل ہو اور اس جماعت میں سے ہو جن کو جنت میں کافور آمیز شراب دی جائے گی۔ پس ہر حال میں راضی رہو۔ اور اپنی تجویز کو دخل نہ دو حق تعالےٰ جس کو چاہتے ہیں کافور ملا کر پلاتے ہیں۔ اور جس کو چاہتے ہیں زنجبیل ملا کر پلاتے ہیں۔ واصل دونوں ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عاشقے گر زین سر و گر زاں سرست
عاقبت ما را بداں شہ رہبرست

(عاشقی خواہ سکون قلب سے ہو یا اضطراب قلب سے ہو دونوں ہی حق تعالیٰ کے واصل ہیں کسی پر شوق اور عشق کا غلبہ ہے کسی پر انس اور سکون کا)

میں نے پہلے اس بیان کا نام "الکافور والزنجبیل" تجویز کیا تھا اسی وجہ سے کہ اس میں نسبت مع اللہ کے دو الوان کا ذکر ہوا ہے جن کو ان دونوں سے مناسبت ہے مگر بعد میں پھر دوسرا نام تجویز کیا جو ذرا عام لوگوں سے غیر مانوس ہے یعنی (المعرق والرحیق للمغرق والحریق) اس میں معرق کو تو مغرق سے مناسبت ہے اور رحیق کو حریق سے معرق کہتے ہیں۔ اس شراب کو جس میں پانی ملایا گیا ہو اور مغرق کہتے ہیں غریق کو قاموس سے معلوم ہوا کہ مغرق اور غریق دونوں واحد ہیں مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دریائے سکون وخمود میں ڈوبا ہوا ہے یعنی صاحب نسبت انس اس کے لئے تو شراب آب آمیز ہے اور جو جلا بھنا رہتا ہے یعنی صاحب نسبت عشقیہ اس کے لئے رحیق ہے۔ یعنی شراب خالص کیونکہ لغت میں رحیق کے یہی معنی ہیں گو اس نام میں کافور و زنجبیل کی آمیزش پر اشارہ نہ ہو سکا مگر فرق پھر بھی ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ جس شراب میں پانی ملا ہوا ہو وہ خالص شراب سے تیزی میں کم ہوتی ہے پس اس نام سے یہ معلوم ہو گیا کہ غریق و حریق دونوں شراب خوردہ ہیں۔ مگر ایک نے تیز شراب پی ہے۔ ایک نے پانی ملی ہوئی۔ محروم کوئی نہیں میں نے اول یہ چاہا تھا کہ اس کا نام العریق والرحیق للغریق والحریق رکھوں کہ یہ بولنے میں ذرا سہل تھا۔ مگر لغت میں مجھ کو عریق کے معنی شراب آب آمیز نہیں ملے اور دوسرے جو معنے ملے وہ اس جگہ مناسب نہ تھے۔ اگر کسی کو لفظ عریق کا معنی معرق ہونا ثابت ہو جائے تو پھر یہ نام بہت اچھا ہے۔ میری نظر کتب لغت پر زیادہ نہیں ہے پس میرے پاس تو قاموس ہی ہے اسی میں سب ننگ و ناموس ہے اس میں مجھ کو یہ بات نہیں ملی ممکن ہے کہ کسی اور کتاب میں اس لفظ کا معنی معرق استعمال ہونا دستیاب ہو جائے۔ بہر حال اس وقت تو یہی نام میں نے تجویز کیا ہے۔ المعرق والرحیق للمغرق والحریق اور زیادہ تر اس نام کی رعایت سے میں نے سورۂ دہر کی آیات پڑھی ہیں تاکہ میرا یہ لطیفہ قائم رہے۔ ورنہ اصل مقصود کو دوسری آیت میں مصرح تھا اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنی محبت عطا فرمائیں خواہ اس رنگ کی ہو یا اس رنگ کی۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔ تمّت بالخیر

شریعت اور طریقت

اس کتاب کے جملہ مضامین حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے افادات کا انتخاب ہیں اس میں شریعت طریقت حقیقت معرفت بیعت اخلاق مجاہدات اذکار اشغال مراقبات احوال توجیہات تعلیمات مسائل مع دلائل و حقائق سالک کے لئے طریق عمل مندرج ہیں جو قرآن مجید احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تصانیف علماء محققین و اولیاء کرام کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اس طرح یہ کتاب اسلامی تصوف و سلوک اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے شاید ہی تصوف کا کوئی اہم مسئلہ ہوگا جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ اس کے مطالعے سے اسلامی تصوف و سلوک کے متعلق ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں تزکیہ نفس تہذیب اخلاق اصلاح اعمال کا طریقہ نہایت واضح اور آسان ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ شریعت و طریقت میں کوئی تضاد نہیں اس کتاب کا ہر مسلمان کے پاس ہونا ضروری ہے۔ مجلد ڈسٹ کور قیمت /۲۰ روپیہ علاوہ خرچہ ڈاک۔

ضروری معروضہ

الحمد للہ تعالیٰ ثم الحمد للہ تعالیٰ۔ اس دسمبر ۱۹۸۵ء کے رسالہ الابقاء پر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو گیا

۱۔ ڈاک خانہ نے وی پی رجسٹری وغیرہ کا خرچہ دوگنا کر دیا ہے۔ الابقاء بذریعہ وی پی منگانے سے آپ کے چار ۴ روپیہ کا نقصان ہے۔ لہذا زرِ سالانہ منی آرڈر سے ارسال فرما کر اپنے چار روپے بچالیں۔ اور اپنے چار روپے کا نقصان نہ کریں۔

۲۔ جدید سال ۱۹۸۶ء کے لئے **پچیس** ۲۵ روپے براہ کرم آج ہی ارسال فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

۳۔ اپنے منی آرڈر کے ساتھ ساتھ ہی کم از کم ایک ایک یا دو ۲ دو ۲ جدید خریدار کا بھی زرِ سالانہ ارسال فرمادیں تو اس خالص دینی، تبلیغی، اصلاحی رسالہ کی ترقی اشاعت کا ثواب آپ کو مل جاویگا۔ اسی فیس منی آرڈر میں چار ۴ خریداروں تک کا زرِ سالانہ آسکتا ہے۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ثم ان شاء اللہ تعالیٰ میری یہ تینوں عرضیں قبول فرمادیں گے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ والسلام۔

طالبِ دعا **محمد عبد المنان غفرلہٗ مکتبہ تھانوی** بندر روڈ / ایم۔ اے جناح روڈ **کراچی ۱**